حدیث کے اصلاحی مضامین

جلد پنجم

یتیم اور بچیوں کے ساتھ مہربانی

محبوب اور عمدہ چیز کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنا

عورتوں کے بارے میں تاکید

پڑوسیوں کے حقوق

اہل وعیال پر خرچ کرنا

شوہر کے حقوق

تعلیم وتربیت اولاد

افادات

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

ادارۃ الصدیق، ڈابھیل گجرات

شعبۂ فیضِ محمود، سورت

حدیث
کے
اصلاحی مضامین

جلد پنجم

افادات

حضرت اقدس

مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم
صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل

ناشر

ادارۂ صدیق، ڈابھیل، گجرات
شعبۂ فیضِ محمود، سورت

حدیث کے اصلاحی مضامین جلد پنجم

افادات:- حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

صفحات: ۳۵۶ قیمت:

باہتمام: خدام حضرت اقدس دامت برکاتہم

HADEES KE ISLAHI MAZAMEEN

Volume : 5

Pages: 356 1st Edition: 2010 Price Rs:

ناشر

شعبۂ فیضِ محمود:- ۱۸۳۴/۱۱۔ سوداگرواڑا۔ سورت۔ فون:- 91-99 98 83 18 38

ادارۂ صدیق:- نزد جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین۔ ڈابھیل

ملنے کے پتے

- ''مکتبہ انور'' (مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی) نزد جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین۔ ڈابھیل
- (حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب دامت برکاتہم) ''دارالعلوم رحیمیہ'' بانڈی پورہ۔ کشمیر۔ پن کوڈ.193502
- ''مدینہ ایجنسی'' جھانپا بازار، سورت
- ''قاضیز'' رانی تالاب، سورت
- ''اسلامی کتب خانہ'' چوک بازار، سورت
- ''رلایبل شوپ'' رانی تالاب، سورت

اجمالی فہرست مضامین............جلد ۵

مُلاطَفَۃُ الیَتیمِ وَالبَنَاتِ ۱

یتیم اور بچیوں کے ساتھ مہربانی

مُلاطَفَةُ الیَتیمِ وَالبَنَاتِ ۲

یتیم اور بچیوں کے ساتھ مہربانی

مُلاطَفَةُ الْيَتِيمِ وَالْبَنَاتِ ۳

یتیم اور بچیوں کے ساتھ مہربانی

اَلْوَصِیَّۃُ بِالنِّسَآءِ ۱

عورتوں کے بارے میں تاکید

اَلْوَصِیَّۃُ بِالنِّسَآءِ ۲

عورتوں کے بارے میں تاکید

اَلْوَصِیَّۃُ بِالنِّسَآءِ ۳

عورتوں کے بارے میں تاکید

عورتوں کے بارے میں تاکید

اَلْوَصِیَّۃُ بِالنِّسَآءِ ۵

عورتوں کے بارے میں تاکید

حَقُّ الزَّوْجِ عَلَى الْمَرْأَةِ

شوہر کے حقوق

اَلنَّفَقَةُ عَلیٰ الْعِیَالِ ا

اہل وعیال پر خرچ کرنا

اَلنَّفَقَةُ عَلیٰ الُعَیَالِ ۲

اہل وعیال پر خرچ کرنا

اَلْاِنْفَاقُ مِمَّا یُحِبُّ وَمِنَ الْجَیِّدِ

محبوب اور عمدہ چیز کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا

وُجُوبُ أَمْرِهِ أَهْلَهُ وَأَوْلَادَهُ الْمُمَيِّزِيْنَ

تعلیم وتربیتِ اولاد ۱

وُجُوْبُ أَمْرِهٖ أَهْلَهٗ وَأَوْلَادَهٗ الْمُمَيِّزِيْنَ

تعلیم وتربیتِ اولاد ۲

حَقُّ الْجَارِ وَالْوَصِیَّۃُ بِہٖ

پڑوسیوں کے حقوق کی تاکید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّيۡ عَلٰى رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡمِ-أَمَّابَعۡدُ:-

جب انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ رہتا ہے تو بے شمار مسائل بھی ساتھ ہی جنم لیتے ہیں، اس طرح مختلف انسانوں اور خاندانوں کے ساتھ رہنے ہی کو ہم ''سماج'' کہتے ہیں، اسی سماج کو قرآن کی زبان عربی میں ''معاشرۃ'' کہا جاتا ہے۔ اور مذہب اسلام نے معاشرت کے جو آداب انسانیت کو سکھائے ہیں وہ یقیناً کوئی اور مذہب کبھی بھی نہیں سکھا سکتا۔

ہمارے درمیان ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو عبادات کو بہت اہتمام سے ادا کرتے ہیں اور معاشرت کو یکلخت نظر انداز کر دیتے ہیں، عبادات والے پہلو میں فرائض کے علاوہ نوافل بھی خوب انجام دیتے ہیں اور معاشرت کے پہلو میں فرائض ہی سے پہلو تہی کی جاتی ہے، حالانکہ جس شریعت نے عبادات کا اہتمام سکھایا ہے، اسی شریعت نے معاشرت پر بھی زور دیا ہے۔ **أفتؤمنون ببعض الكتاب**......

''**حدیث کے اصلاحی مضامین**'' کی اس **جلد خامس** میں جو مختلف عنوانات آپ کے مطالعہ میں آئیں گے، ان سب کو اگر ایک مجموعی عنوان دینا ہو؛ تو شاید **احکامِ معاشرت** بہت موزوں ہوگا کیونکہ اس کا:-

(۱) پہلا عنوان ہے ''**یتیم اور لڑکیوں کے ساتھ نرم روی و مہربانی**''

(۲) دوسرا عنوان ہے ''**عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید**''

(۳) تیسرا عنوان ہے ''**بیوی پر شوہر کے حقوق**''

(۴) چوتھا عنوان ہے ''**اہل وعیال پر خرچ کرنا**''

(۵) پانچواں عنوان ہے ''محبوب اور عمدہ چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرنا''

(۶) چھٹا عنوان ہے ''تعلیم وتربیتِ اولاد''

(۷) اور ساتواں عنوان ہے ''پڑوسیوں کے حقوق کی تاکید''

حقوق کی دوقسمیں ہیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ حقوق اللہ میں اگر انسان سے کمی کوتاہی رہ جائے تو اسے معاف کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، انسان اس کے سامنے روئے گڑگڑائے، دوآنسو گرادے؛ وہ مَن جاتا ہے اور معاف فرمادیتا ہے۔ لیکن جہاں تک بندوں کے حقوق کی بات ہے تو اسے جب تک خود صاحبِ حق بندہ معاف نہ کردے؛ تب تک اللہ تعالیٰ بھی اس میں دخل اندازی نہیں کرتے، اس معنیٰ کر حقوق العباد والا پہلو بے حد اہمیت رکھتا ہے۔

انسان اگر چاہتا ہو کہ اس کا گھر جنت کا نمونہ بن جائے، محلّہ اور پڑوس میں اپنائیت، پیار ومحبت کی فضا قائم رہے، کسی نوع کا کھچاؤ، تناؤ اور کشیدگی باقی نہ رہے، آدمی بلاجھجھک کہیں بھی چلا جائے، کہیں بھی ٹھہر جائے، کسی سے بھی مل لے؛ تو یہ سب تبھی ممکن ہے جب مذکورہ بالا تمام مضامین پر سو فیصد عمل پیرا ہوا جائے، ورنہ مصیبتیں گھر ہی سے شروع ہو جاتی ہیں۔ بیوی کو شوہر سے اور شوہر کو بیوی سے شکایتیں ہیں۔ جس بیوی کو اللہ تعالیٰ نے دلی سکون حاصل ہونے کا ذریعہ بنایا تھا وہی بے سکونی اور بے چینی کا سرچشمہ نظر آتی ہے، بیوی سے سکون تب حاصل ہوگا جب آپ اس کے ساتھ قرآن وحدیث کے مطابق برتیں گے، نہ کہ اپنی مرضی کے مطابق۔ حدیثِ پاک کا مفہوم ہے: کتنی شرم کی بات ہے کہ انسان اپنی بیوی کو جانور کی طرح مارے اور جب اس کی ضرورت پڑے تو اسے لپٹا لے۔

حضور پُرنور ﷺ نے آدمی کی بہتری کا تھرمامیٹر یہ بتایا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی اور

اہلِ خانہ کے لئے اچھا ہو، وہ تم میں سب سے اچھا ہے۔ انسان آج سب کے لئے اچھا ہے اور بیوی ہی کو خاطر میں نہیں لاتا، جس کی سفارش اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں فرمائی ہے: ان (بیویوں) کے ساتھ دستور کے مطابق سلوک کرو۔ آج انسان بیوی کی ناز برداری (نخرے اُٹھانے) کو اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے، جبکہ آنحضرت ﷺ اپنی چہیتی پاک بیوی حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو حبشیوں کا کھیل دکھاتے ہیں اور جب تک ان کا جی نہیں بھر جاتا تب تک آپ بنفس نفیس پردہ اور آڑ کے طور پر کھڑے رہتے ہیں۔

حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی باری میں دوسری پاک بیوی کے گھر سے کوئی پکوان آپ ﷺ کے لئے آتا ہے، حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی غیرت اسے برداشت نہیں کر پاتی اور وہ اس برتن کو زور سے ہاتھ مار کر گرا دیتی ہیں، کھانا بھی گر جاتا ہے اور برتن الگ ٹوٹتا ہے، ایسے میں باوجود باندی کے موجود ہونے کے حضورِ پاک ﷺ خود گرا ہوا کھانا اُٹھاتے ہیں اور بجائے غصہ ہونے کے فرماتے ہیں ''تمہاری اماں کو غیرت آ گئی''۔

آیئے! اب ذرا ہر عنوان کو الگ الگ دیکھیں:-

﴿۱﴾ ''یتیم اور لڑکیوں کے ساتھ نرم روی ومہربانی'':- اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستے مخلوقات کی سانسوں کی تعداد کے برابر ہیں، بے باپ کے بچوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا اور اپنی بیٹیوں سے شفقت کرنا بھی ان میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی داد ودہش کا یہ عالم ہے کہ آپ صرف یتیم کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر دیں تو اس کے سر کے بالوں کے برابر نیکیاں ملتی ہیں، بیٹیوں کو پال کر بڑا کر دیا، اچھی تربیت کر کے شادی کر دی، جنت میں جانے کا سامان ہو گیا، جس کے یہاں مسلسل لڑکیاں پیدا ہوں اسے بددل ہونے کی ضرورت نہیں ہے، یوں سمجھے کہ مجھے اللہ تعالیٰ جنت میں بھیجنا چاہتے ہیں۔

مصنفِ کتاب نے حسبِ عادت موضوع کی مناسبت سے ۴/آیات اور ۱۳/ روایات جمع فرمائی ہیں، حضرت اقدس دامت برکاتہم نے اس موضوع کے تحت خوب علمی فوائد، عملی نصائح اور روحانی نورانی باتیں ارشادفرمائی ہیں، ان کا لطف پڑھ کر ہی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

﴿۲، ۳﴾ ''عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید'' اور ''بیوی پر شوہر کے حقوق''

یہ دونوں عنوانات ایک ساتھ جڑے ہوئے ہیں، امام نوویؒ نے عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید والے مضمون کو مقدم رکھ کر قرآن کا اتباع کیا ہے، سورۂ بقرہ میں ارشادِ ایزدی ہے ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ یعنی جیسے بیویوں کے حقوق ہیں، ان کے ذمہ بھی (شوہر) کے حقوق ہیں۔ جس میں شاید اس طرف لطیف اشارہ فرمایا ہے کہ ویسے تو میاں بیوی میں سے ہر ایک کے دوسرے پر حقوق ہیں، لیکن شوہر کی ذمہ داری تھوڑی زیادہ ہے یہیں سے ناز برداری والی بات نکالی جاسکتی ہے جو آنحضور ﷺ نے عملی طور پر انجام دے کر بتائی جس کی کچھ تفصیل پیچھے گذری۔ حاصل یہ ہے کہ مرد کو چاہیے کہ بیوی کی ناز برداری بھی کرے، صرف حقوق کی ادائیگی پر بس نہ کرے، اور یہ وہ نسخہ ہے جو دونوں کے آپسی تعلقات کو صرف قانونی اور (Formal) سے بڑھ کر خوشگوار اور پیار ومحبت سے لبریز بنادیتا ہے، پھر گھر جنت کا نمونہ نظر آتا ہے، اور یہی وہ بات ہے جو دونوں کو ایک دوسرے سے ایسا بندھا ہوا رکھتی ہے کہ پھر دل میں کسی اور کے لئے گنجائش باقی نہیں رہتی، اور اسی سے ایک پاکیزہ سماج تعمیر ہوتا ہے۔

ہمارے حضرت دامت برکاتہم کا یہ ارشاد شاید پہلے بھی کسی اداریہ میں لکھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ترتیب یہ ہے کہ انسان کو یہ بتایا جاتا ہے کہ تمہارے ذمہ

فلاں کا یہ حق ہے؛ تم اسے ادا کرو۔ اور ہمارا طریقہ یہ ہے کہ دوسرے سے کہتے ہیں کہ تمہارے ذمہ میرا یہ حق ہے تم ادا کرو۔ اور یہیں سے ساری بات بگڑتی ہے، ہر آدمی دوسروں سے اپنے حقوق مانگنے میں لگا ہوا ہے، اس کے ذمہ دوسروں کے کیا حقوق ہیں اس کی اسے کوئی پرواہ نہیں۔

اور معاشرہ کی اصلاح فرد کی اصلاح سے ہوتی ہے، کیونکہ معاشرہ کئی افراد کے باہم رہنے کا نام ہے، اگر ہر فرد اپنی اصلاح کر لے تو گویا پورا معاشرہ درست ہو گیا اور اصلاحِ معاشرہ کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آج سے ہم یہ معلوم کرنا شروع کر دیں کہ ہمارے ذمہ دوسروں کے کیا حقوق ہیں، اور انہیں ادا کرنے میں لگ جائیں۔ دوسرا ہمارا حق ادا کرتا ہے یا نہیں، اس کی پرواہ ہی چھوڑ دیں۔ صحاح کی ایک حدیث میں صراحۃً یہ مضمون موجود ہے۔

آج کے دور کا ایک بڑا فتنہ غیر مقلدیت ہے، اس عنوان کے تحت غیر مقلدین کو منھ توڑ جوب دیا گیا ہے۔ حضرت والا دامت برکاتہم نے فقیہانہ شان سے آسان پیرایہ میں تقلید کی حقیقت کو الہامی مثال دے کر ایسے دلچسپ انداز سے سمجھایا ہے جس کے مطالعہ سے دماغ کی گتھی سلجھ جاتی ہے، اور بہت سے اشکالات حل ہو جاتے ہیں۔

اس باب کی پہلی روایت کی تشریح قابلِ مطالعہ ہے جس سے قاری کے ذہن سے ان شاء اللہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہوں گی۔

حضرت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے تحت بیوی کے ساتھ حسنِ معاشرت کے انمول نمونے آپ کو دیکھنے ملیں گے، اس کو ضرور پڑھیے اور اپنی زندگیوں میں اس کو جگہ دیجیے؛ تاکہ ازدواجی زندگی کی حقیقی خوشیاں پا سکیں۔

حضرت عمرو بن احوص رضی اللہ عنہ کی روایت کے ذیل میں حضرت دام مجدہٗ نے عورت

کی قربانیوں کونہایت مؤثر انداز میں پیش فرما کر مردوں کے لئے ایک چشم کشا حقیقت بیان فرمائی ہے،تاکہ معلوم ہوجائے کہ ان کو بیویوں پر کتنا اختیار حاصل ہے،اور وہ ان پر کتنا رعب چلاتے ہیں،حالانکہ اس صنفِ نازک کی خدمات اس قابل ہیں کہ ان کو خوب خوب سراہا جائے۔

ان دونوں عنوانات کے ذیل میں علامہ نوویؒ نے کل ۳ر آیات اور ۱۶ر احادیث پیش فرمائی ہیں،جن میں سے ہر حدیث کے ذیل میں بہت سارے فوائد ونصائح ہیں جو پڑھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

﴿۴﴾ **''اہل وعیال پر خرچ کرنا''**:-بظاہر یہ دنیا کا دستور نظر آتا ہے کہ انسان اپنے بیوی بچوں کا ذمہ دار ہے،ان کا روٹی کپڑا اور مکان مرد کے ذمہ ہے اور اکثر لوگ اسے دستورِ دنیا سمجھ کر ہی-نیکی کا کام سمجھے بغیر-انجام بھی دیتے ہیں اور زندگی بھر لاکھوں روپیہ بیوی بچوں کے پیچھے خرچ کرنے کے باوجود آخرت میں وہ کسی بدلہ کے حقدار نہیں ہوتے۔اس مضمون کو پڑھنے سے ہمیں اندازہ ہوگا کہ یہ دنیا کا دستور بعد میں ہے؛شریعت کا حکم پہلے ہے۔شریعت نے باقاعدہ مرد پر ذمہ داری ڈالی ہے،اسے انجام دینے سے جہاں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوتا ہے،وہیں وہ فضائل کا مستحق بھی ہوتا ہے۔اور اس کے دلائل اس مضمون کے تحت بیان ہوئے ہیں۔

بہت سی وہ باتیں جنہیں ہم مرد کی ذمہ داری سمجھتے ہیں لیکن درحقیقت وہ اس پر فرض نہیں ہیں،کچھ وہ چیزیں جن کا ذمہ دار مرد کو نہیں سمجھا جاتا لیکن وہ شریعت نے اس کے ذمہ رکھی ہیں،بعض وضاحت طلب امور ہیں مثلاً یہ کہ خرچ اعلیٰ دیا جائے،اوسط دیا جائے یا ادنیٰ دیا جائے،اس کی تفصیلات ہیں،یہ ساری باتیں اس موضوع میں آگئی ہیں۔

علم میں اضافہ کرنے والی چیزیں، غلط فہمیاں دور کرنے والے امور ہیں، قرآن وحدیث سے بالواسطہ اور بلاواسطہ ان سب باتوں کی توضیح وتشریح ہے۔ المختصر! اسلامی شریعت وسنت کی وہ باتیں جن کو معلوم کرنے کے لئے سینکڑوں کتابیں کھنگالنی پڑتی ہیں اور بڑی باریک بینی اور حاضر دماغی سے جن باتوں کو سمجھنا پڑتا ہے؛ وہ ساری باتیں ''تیار حلوے'' کی طرح ہمیں گھر بیٹھے حاصل ہورہی ہیں۔ فجزیٰ اللّٰہ مرشدنا عنا خیراً۔

ایک بہت ہی اہم مضمون پورے اٹھارہ صفحات میں ضمناً آ گیا ہے، جو انتہائی توجہ سے پڑھنے اور عمل کئے جانے کا حق رکھتا ہے؛ اور وہ ہے حلال وحرام والا مضمون۔ اس مضمون کو حضرت اقدس دامت برکاتہم نے جس تفصیل، وضاحت، سنجیدگی، فصاحت وبلاغت اور شفقت ومحبت سے سمجھایا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا آنحضرت دامت برکاتہم کو خصوصی عطیہ ہے۔ عمل کرکے اس کی قدر کی جائے؛ تب بات ہے۔ پہلے سے نیت کرکے پڑھیں تو ان شاء اللہ عمل کی توفیق بھی ضرور ہوگی۔

اس باب میں کل ۳/آیات اور ۸/روایات ہیں، ان میں سے ایک روایت حضرت ابوہریرہؓ کی ہے جس کا مضمون نہایت ہی قابلِ غور ہے کہ مال کو بچا بچا کر جمع کرنے والا مال بڑھانے کی فکر میں لگا ہوا ہوتا ہے، حالانکہ روزانہ ایک فرشتہ بددعا دیتا ہے؛ پھر مال میں برکت کہاں ہوگی؟

﴿۵﴾ ''محبوب اور عمدہ چیز کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا'': - خرچ کی ابتداء اہلِ خانہ سے ہونی چاہیے۔ ان کے حقوق ونوافل کی مکمل ادائیگی کے بعد دیگر مواقع میں خرچ کرنے کا مزاج ہونا چاہیے۔ عمومی مزاج یہ ہے کہ جب ہمارے پاس کچھ چیزیں ہماری ضرورت سے زائد جمع ہوتی ہیں، کسی چیز کو استعمال کرتے کرتے دل اس سے بھر جاتا ہے

توخیال آتا ہے کہ کسی کو دیدی جائے، بالکل نہ خرچ کرنے سے تو یہ اچھا ہی ہے،لیکن شریعت ہمارا مزاج ایسا بنانا چاہتی ہے کہ ہم اپنی پسندیدہ چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔

اس عنوان کے تحت بھی دیگر عناوین کی طرح اسلامی تعلیمات منفرد،ٹھوس اورنرالی ہیں۔اس کام کے لئے بندۂ مؤمن کومختلف طریقوں سے ابھارا گیا ہے۔جذبۂ عمل کے ساتھ اگران فضائل کوسنااور پڑھا جائے، نیز ایسے بندگان خدا سے خودکووابستہ پیوستہ کیا جائے،جنہوں نے یہ وصف اپنے بزرگوں سے میراث میں پایاہے،تو آہستہ آہستہ یہ وصف انسان میں آنے لگتا ہے۔ہمیں جب کسی کی طرف سے(Second Hand)چیز ملتی ہےتو ہم جس تأثر سے دوچار ہوتے ہیں،ٹھیک وہی تأثراس انسان کا بھی ہوتا ہے جسے ہم کوئی ایسی چیز دیتے ہیں۔جو چیز ہم اپنے لئے پسندنہیں کرتے،وہ دوسرے کے لئے کیوں پسند کرتے ہیں؟اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان یہ بھی نہ کرے۔بالکل نہ خرچ کرنے سے تو یہ بہتر ہی ہے۔لیکن انسان کوترقی کرنی چاہیے۔دھیرے دھیرے ہمت جمع کرکے پسندیدہ(Fresh)اور(Packed)چیزیں بھی خرچ کرنے کی ابتداء کرنی چاہیے۔اسلاف کی زندگیوں میں اس کی مختلف ترتیبیں ملتی ہیں جن سے حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

یہ ان اوصاف میں سے نہیں ہے جو ایک مرتبہ کہنے سننے سے پیدا ہوجائے۔ اس کے حاصل کرنے کے لئے بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرنی پڑتی ہیں۔

اس سلسلہ میں علامہؒ نے ۲؍آیتیں اور۱؍روایت پیش کی ہے۔

﴿۶﴾ **"تعلیم وتربیتِ اولاد"**:- یہ حضرت اقدس دامت برکاتہم کا شاید سب سے پسندیدہ عنوان ہے۔اس مضمون کے تحت تقریباً ابتدائی ۱۴؍صفحات تو حضرت والا کے بیان پر مشتمل ہیں جو درحقیقت پورے مضمون کا لبِ لباب اور نچوڑ ہیں۔ادارہ اس پر زیادہ کچھ

لکھنے کے بجائے صرف اتنا لکھنے کو ترجیح دیتا ہے کہ اس مضمون کی ایک ایک سطر کو بغور پڑھ کر اس پر صد فیصد عمل کریں۔ بچوں سے لاڈ پیار ضرور کرنا چاہیے لیکن حد میں ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ آپ ان کی ہر جائز و ناجائز فرمائش پوری کریں، کوئی آپ کی اولاد کو تنبیہ کرے تو آپ ان کی بیجا جانبداری کریں اور آپ اور آپ کی اولاد کے حقیقی خیر خواہ سے جھگڑا مول لیں۔

اپنی تربیت بھی اللہ والوں سے کروائیں تا کہ ہماری خامیاں، نقائص وعیوب ہمارے بچوں اور ماتحتوں میں منتقل نہ ہوں، امام نوویؒ نے اس عنوان کے ذیل میں ۲/ آیات اور ۵/احادیث کے حسنِ انتخاب کا بہترین نمونہ پیش فرمایا ہے، حضرت دامت برکاتہم نے ترجمہ وتشریح فرمائی ہے۔

﴿۷﴾ **"پڑوسیوں کے حقوق کی تاکید"**:- مذہبِ اسلام کی جامعیت و مانعیت کا یہ ایک نمونہ ہے کہ انسان کو بیوی بچوں کے علاوہ پڑوسی کے بھی حقوق بتائے، اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا، ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس کو ہم سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

ہمارے اسلافِ عظام نے شریعت کی اس تعلیم پر کتنی باریکی سے عمل کیا، معاشرت کی کیا اہمیت ہے، قرآنی ونبوی ارشادات کو بزرگوں کے واقعات سے حضرت دام مجدہم نے سمجھایا ہے، علماءِ دیوبند کے واقعات پڑھنے سے دل ان کی عظمت وعقیدت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اس باب میں کل ا/آیت اور ۹/احادیث لائے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ابوزاہر

۸/ذی قعدہ ۱۴۳۱ھ

۲۰۱۰/۱۰/۱۷ شب یکشنبہ

مُلاطَفَةُ الْیَتِیْمِ وَالْبَنَاتِ

یتیم اور بچیوں کے ساتھ مہربانی

مجلس (۱)

اقتباس

(۱)اس باب میں خاص طور پر جن افراد کو شمار کیا گیا ہے ان میں یتیم لڑکیاں، تمام کمزور مسکین وشکستہ دل لوگ ہیں؛ ان تمام انواع کے ساتھ نرمی سے پیش آنا چاہیے، بھلائی و احسان کا سلوک کرنا چاہیے، شفقت کا معاملہ کرنا چاہیے، تواضع وانکساری کے ساتھ پیش آنا چاہیے، بلکہ ان کے سامنے بچھ جانا چاہیے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جو یتیم ہوتا ہے، لوگ اس کے مال و جائداد پر قبضہ کر لیتے ہیں اس کے حقوق مارنے کی کوشش کرتے ہیں، جو آتا ہے اس کے ساتھ زیادتی کرتا ہے، اس پر تسلط جمانے کی، اس پر غالب آنے کی اور اس پر چڑھ بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ باری تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو خطاب فرماتے ہیں اور آپ کے واسطے سے پوری امت کو یہ تعلیم دی جا رہی ہے، اور جو شخص یتیمی کے دور سے گذر چکا ہو، اس کو اگر کہا جائے کہ بھائی! یتیموں کے اوپر چڑھ مت بیٹھو، اس کے ساتھ زیادتی مت کرو؛ تو وہ اس کی اہمیت کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔

(۲) نبی کریم ﷺ کی جب بعثت ہوئی اس وقت لڑکیوں کے ساتھ جو نازیبا اور ناروا سلوک کیا جاتا تھا وہ ناقابلِ بیان ہے، قرآنِ پاک میں اس کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے کہ ان میں سے کسی کو جب بچی کی پیدائش کی خوش خبری سنائی جاتی ہے تو یہ سن کر ان کا چہرہ کالا پڑ جاتا ہے اور وہ اپنے دم کو اندر ہی اندر گھُٹتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اور وہ اپنی قوم سے منہ چھپائے پھرتا ہے گویا اس کو لوگوں کے سامنے آتے ہوئے شرم آتی ہے اور پھر سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ اس بچی کو اپنے گھر میں رہنے دے یا مٹی میں دبا دے اور زندہ دفن کر دے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗوَنَشْهَدُ اَن لَّآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراًكَثِيْراً. أمابعد:—

أعوذبالله من الشّيطان الرّجيم. بسم الله الرّحمٰن الرّحيم

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ. (الحجر.۸۸)

وقـال الله تعالىٰ: وَاصْبِـرْ نَـفْسَكَ مَـعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِوَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَاتَعْدُعَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُزِيْنَةَالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا(الكهف . ۲۸)

وقال الله تعالىٰ:فَأَمَّاالْيَتِيْمَ فَلَاتَقْهَرْ،وَأَمَّاالسَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ. (الضحىٰ.۹،۱۰)

وقال الله تعالىٰ:أَرَأَيْتَ الَّذِیْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ فَذٰلِكَ الَّذِیْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَايَحُضُّ عَلىٰ طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ. (الماعون)

عنوان کا خلاصہ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب کا نیا عنوان قائم کیا ہے ﴿مُلَاطَفَةِ الْيَتِيْمِ وَالْبَنَاتِ﴾ یتیم کہتے ہیں اس بچے کو جس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہو، چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی؛ بشرطیکہ وہ نابالغ ہو۔ جب تک کہ وہ نابالغ ہے وہاں تک شریعت نے اس کو یتیم کہا ہے اور جب بالغ ہو جائے گا تو پھر اس کو یتیم نہیں کہیں گے، چاہے لوگ اس پر لفظ یتیم بولیں، لیکن حدیثِ پاک میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ﴿لا يتم بعد احتلام (ابوداود شریف۔ ۲۸۷۳)﴾ بالغ ہونے کے بعد یتیمی نہیں ہے۔ اس لئے وہ نابالغ بچہ جس کے باپ کا

انتقال ہوگیا ہو؛اس کو یتیم کہا جائے گا،اور وہی بچہ جب بالغ ہوگیا تو اب وہ یتیم نہیں رہا۔

دوسرا لفظ ہے(اَلْبَنَات)چونکہ زمانۂ جاہلیت میں لڑکیوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا جاتا تھا،گویا لڑکیوں کو وہ اپنے لئے عیب سمجھتے تھے،اگر کسی کے یہاں بچی پیدا ہوئی تو اس کا کیا حال ہوتا تھا قرآنِ پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کا نقشہ کھینچا ہے ﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيْم،يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ،أَيُمْسِكُهُ عَلٰى هُوْنٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ﴾ان میں سے جب کسی کو بچی کے پیدا ہونے کی بشارت سنائی جاتی ہے تو اس خبر کو سن کر اس کا چہرہ مارے شرم اور غیظ کے کالا ہوجاتا ہے،اور وہ اپنے غصہ وناراضی کو دباتا ہے،آج کل کی زبان میں کہیں تو وہ اپ سیٹ(upset) ہوجاتا ہے۔گویا وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ساتھ ہی ساتھ اس خبر پر اس کو اتنی زیادہ شرم آتی ہے،اور وہ ایسی عار محسوس کرتا ہے کہ لوگوں سے اپنا منہ چھپاتا پھرتا ہے کہ لوگ کہیں گے کہ اس کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی۔گویا کوئی بہت بڑا جرم کیا ہو۔پھر وہ اس لڑکی کے متعلق یہ سوچتا ہے کہ اس ذلت کے ساتھ کیا اس لڑکی کو زندہ رہنے دے یا پھر مٹی کے اندر دبا دے؟ باری تعالیٰ نے لفظ استعمال فرمایا﴿يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ﴾ ''دسَّ، يدُسُّ'' کا معنٰی ہے کسی کو دبا دینا۔زمانۂ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ جب بچی پیدا ہوتی تھی تو اسے زندہ درگور کردیا جاتا تھا،گویا وہ ایسا معاشرہ تھا جس میں بچیوں کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ ناروا سلوک ہوتا تھا،یتیم بچے کے حقوق مارے جاتے تھے۔آج بھی ہمارے سماج میں ایسا ہی ہوگیا ہے،یتیموں اور بچیوں کے ساتھ ناروا سلوک ہوتا ہے،اسی لئے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے عنوان میں بچی کو بھی پیش کیا۔

﴿وَسَائِرِ الضَّعَفَةِ وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْمُنكَسِرِيْنَ﴾ پچھلے باب میں گذر چکا ہے کہ کمزور سے کیا مراد ہے۔ جسمانی، مالی، یا عہدہ ومنصب کسی بھی کے اعتبار سے کمزوری ہو، تمام کمزوروں، مسکینوں اور منکسرین یعنی شکستہ حال وشکستہ دل لوگوں کے ساتھ ملاطفت اور نرمی کا معاملہ کرنا اور اچھا سلوک کرنا۔

یہاں نرمی کے ساتھ بات کرنے کے لئے کہا گیا، اس لئے کہ عام طور پر ایسوں سے جب بار بار ملنا ہوتا ہے تو ان کو دیکھ کر طبیعت میں طیش آ جاتا ہے، اور بلاوجہ ان پر ناراض ہوتے ہیں اور غصہ کرتے ہیں جیسے کوئی غریب مانگنے آ گیا تو بس تیوری ہی چڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں کا حال ہوتا ہے کہ لڑکی جب سامنے آتی ہے تو اس کو دیکھ کر غصہ ہو جاتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس بے چاری نے کوئی جرم کر دیا ہے۔ اس لئے پہلی بات تو یہ بتلائی کہ ایسوں کے ساتھ نرمی سے پیش آئے، اور مزید ترقی کرتے ہوئے کہا ﴿وَالشَّفْقَةِ عَلَيْهِمْ﴾ ان کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرو۔ یہ ایک قدم اور آگے ہے کہ ان پر محبت وشفقت کا معاملہ ہو ﴿وَالتَّوَاضُعِ مَعَهُمْ﴾ اور آگے بڑھ کر کہا جا رہا ہے کہ ان کے ساتھ تواضع وانکساری کا سلوک کرنا۔ بہت سے لوگ نرمی سے بھی پیش آتے ہیں اور احسان بھی کرتے ہیں لیکن ان کے ساتھ تواضع کیا معنٰی رکھتا ہے؟ ﴿وَخَفْضِ الْجَنَاحِ لَهُمْ﴾ یہ اور آگے کی چیز ہے کہ ان کے لئے بازو کا جھکانا، گویا ان کے لئے اپنے آپ کو بچھا دینا، جیسے وہ ان کے لئے بچھتے ہیں، یہ بھی ان کے لئے بچھ جائیں۔

اس باب میں خاص طور پر جن افراد کو شمار کیا گیا ہے ان میں یتیم لڑکیاں، تمام کمزور، مسکین وشکستہ دل لوگ ہیں؛ ان تمام انواع کے ساتھ نرمی سے پیش آنا چاہیے، بھلائی واحسان کا سلوک کرنا چاہیے، شفقت کا معاملہ کرنا چاہیے، تواضع وانکساری کے

ساتھ پیش آنا چاہیے، بلکہ ان کے سامنے بچھ جانا چاہیے۔

مؤمنین کے سامنے بچھ جایئے

آگے قرآنِ پاک کی آیتیں اور احادیث پیش کرتے ہیں ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ یہ ایک آیت کا آخری ٹکڑا ہے، اس میں باری تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو خطاب کرکے کہا گیا۔ پوری آیت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ مختلف قسم کے مشرک؛ یہود ونصاریٰ، مشرکین وہنود، اللہ ورسول کو نہ ماننے والے اور ایمان نہ لانے والے؛ ان سب پر دنیا کی زیب وزینت کھول کر رکھ دی ہے اور ان کو نواز رکھا ہے، آپ ان کی طرف آنکھ اُٹھاکر بھی نہ دیکھو۔ پھر فرمایا کہ ایمان والوں کے سامنے آپ اپنے بازو کو جھکادیجیے اور ان کے سامنے بچھ جایئے۔ ﴿للمؤمنین﴾ ایمان والوں میں سب آگئے، چاہے یتیم ہوں، کمزور ہوں، مسکین ہوں؛ سب ہی اس میں آگئے۔

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَکَ﴾ الی آیت اگلے باب میں آچکی ہے اور اس کی تفصیل بھی وہاں گذر چکی ہے۔

کسی یتیم پر چڑھ مت بیٹھیے

﴿فَأَمَّا الْیَتِیْمَ فَلاَتَقْهَرْ﴾ نبی کریم ﷺ کو باری تعالیٰ کی طرف سے خاص طور پر خطاب کرکے کہا گیا ﴿أَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی وَوَجَدَکَ ضَالًّا فَهَدٰی وَوَجَدَکَ عَائِلاً فَأَغْنٰی﴾ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یتیم پایا تو آپ کو پناہ دی، آپ کو مال ودولت کا ضرورت مند اور محتاج پایا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو غنی کردیا۔ اسی پر آگے آپ کو تاکید کی جا رہی ہے ﴿فَأَمَّا الْیَتِیْمَ فَلاَتَقْهَرْ﴾ "قَهَرَ" کا معنیٰ کسی کے اوپر مسلط ہوجانا، غالب

آجانا اور چڑھ بیٹھنا۔ تو معنٰی ہوئے کہ آپ کسی یتیم پر چڑھ مت بیٹھیے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جو یتیم ہوتا ہے، لوگ اس کے مال وجائداد پر قبضہ کرلیتے ہیں، اس کے حقوق مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو آتا ہے اس کے ساتھ زیادتی کرتا ہے، اس پر تسلط جمانے، اس پر غالب آنے اور اس پر چڑھ بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو باری تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو خطاب فرماتے ہیں اور آپ کے واسطے سے پوری امت کو یہ تعلیم دی جارہی ہے۔ پہلے آپ کو اپنی یتیمی یاد دلائی گئی کہ اے نبی! آپ تو یتیمی کا دور دیکھ چکے ہیں اور جو آدمی کسی حالت سے گذر چکا ہو اس کو بخوبی معلوم ہوتا ہے اور اس کو اس سلسلہ میں کوئی بات کہی جاتی ہے تو اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔ جو شخص یتیمی کے دور سے گذر چکا ہو، اس کو اگر کہا جائے کہ بھائی! یتیموں کے اوپر چڑھ مت بیٹھو، اس پر غالب نہ آجاؤ، اس کے ساتھ زیادتی مت کرو۔ تو وہ اس کی اہمیت کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔ گویا باری تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خطاب فرما کر پوری امت کو اس بات کی تعلیم دی کہ یتیموں پر چڑھ مت بیٹھیو، ان کی حق تلفی نہ کیجیو، اور ان کی جائیداد پر قبضہ نہ کرلیجیو، ان کے حقوق نہ ماریو۔

سوال کرنے والوں سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں

﴿وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ اور سوال کرنے والے کو جھڑکیے مت۔ "نَهَرَ، يَنْهَرُ" کا معنٰی جھڑکنا۔ سائل سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک تو یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنی ضرورت کی وجہ سے مال کا سوال کرتا ہے اور مانگتا ہے تو اس کو جھڑکا نہ جائے، اگر آپ کے پاس ہے تو دیجیے اور اس کی ضرورت پوری کیجیے، اور اگر آپ کے پاس نہیں ہے اور اس کی ضرورت پوری نہیں کرسکتے تو کم از کم اچھے الفاظ کہہ اس کو رخصت کردیجیے، اس

کے ساتھ ناروا سلوک کرنے اور اس کو جھڑکنے اور ڈانٹنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

بلکہ سائل کے متعلق تو حدیثِ پاک میں یہاں تک آتا ہے کہ سوال کرنے والے کا تم پر حق ہے ﴿وَاِنْ جَآءَ عَلٰى فَرَسٍ (ابوداود شریف۔۱۶۶۵)﴾ چاہے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آیا ہو۔ جیسے آج کل اگر کوئی آدمی ماروتی کار میں بیٹھ کر آوے یا موٹر بائک پر سوار ہو کر مانگنے کے واسطے آوے، تو سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے کہ سواری پر آیا ہے اور سوال کرتا ہے۔ اسی طرح اس زمانہ میں اعلیٰ سواری گھوڑا ہی تھا، اس لئے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ کوئی آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر سوال کرنے آیا ہے تب بھی اس کا تم پر حق ہے، اس نے آپ سے مانگا ہے تو اس کو دیجیے، اس لئے کہ کیا ضروری ہے کہ وہ گھوڑا اسی کا ہو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی سے مانگ کر لایا ہو۔ آپ اس کی ظاہری شکل وصورت دیکھ کر فیصلہ نہ کیجیے۔

یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سفر میں نکلا ہوا اور اس کا مال چوری ہو گیا ہو۔ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی صاحبِ حیثیت ہے، لیکن سفر کر رہا تھا اور ٹرین میں اس کا سب سامان چوری گیا، پیسے بھی گئے، بلکہ نائٹ ڈریس پہن کر سویا تھا، صرف وہی سوٹ بدن پر رہ گیا۔ کبھی ایسے حالات حوادث کے موقعوں پر پیش آتے ہیں کہ جو لوگ کل تک دینے والے تھے وہ آج لینے والے ہو جاتے ہیں، اس لئے شریعت نے اصولی طور پر ایک تعلیم دی ہے کہ آپ کو اس چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کو مانگنا چاہیے یا نہیں، بلکہ جب آپ کے پاس آیا اور ہاتھ پھیلایا، تو اب آپ پر حق ہو گیا کہ اس کو دیجیے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ آپ لاکھ دو لاکھ روپے دیجیے، یا وہ ہزار کا مطالبہ کر رہا ہے، تو آپ ہزار ہی دیں، اگر وہ تعین کرتا ہے تو وہ اس کی زیادتی ہے، جیسے بعض مانگنے والے

کہتے ہیں کہ بھائی! سو روپے کا سوال ہے، اس سے کم لئے بغیر نہیں جائیں گے، تو ان کو بھی شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ بس! آپ تو اپنی حیثیت کے مطابق دے دیجیے، باقی آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ اس سے اُلجھیں، اس کو جھڑکیں اور ڈانٹیں، اگر آپ کے پاس دینے کے لئے نہیں ہے تو محبت کے ساتھ اس کو رخصت کر دیجیے، اس کے بعد بھی وہ نہیں جاتا تو آپ کو اس سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر آپ ان کو نہ دیں تو زور زور سے کہتے ہیں کہ دیکھو تو سہی، اتنا بڑا مکان ہے، اور صرف دو روپے ہی دیتے ہیں، صاحبِ مکان بھی بے چارہ شرمندہ ہو جاتا ہے۔ ایسے سائل کے ساتھ اُلجھنا تو اپنے آپ کو اور زیادہ رسوا کرنا ہے، اسلئے آپ اپنا کام کر کے اس سے علاحدہ ہو جایئے۔ بہر حال! سوال کرنے والے کو نہ جھڑکیے۔

اسی طرح یہ بھی لکھا ہے کہ کوئی آدمی کسی عالم اور جاننے والے سے کوئی علمی سوال کرتا ہے تو اس کو بھی چاہیے کہ اس کو نہ جھڑکے، اگر اس کی بات جواب دینے کے قابل ہے تو جواب دیدے، اور اگر اس قابل نہیں ہے تو محبت سے سمجھا کر کے رخصت کر دے۔

بہر حال! یہاں یتیم کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ وہ کمزور و مسکین ہوتا ہے، اس لئے اس سے نرمی سے پیش آنا چاہیے۔ اور سائل کو جھڑکنے سے منع کیا گیا ہے، اس لئے کہ وہ بھی کبھی کمزور اور مسکین ہوتا ہے۔

یتیموں کو دھکے دینا کافروں کا کام ہے

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ﴾ آپ نے اس کو دیکھا جو اللہ تعالیٰ

کی طرف سے بدلہ دئے جانے والے دن کو جھٹلاتا ہے۔ہم سورۂ فاتحہ میں پڑھتے ہیں ﴿مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ روزِ جزا، بدلے کے دن یعنی قیامت کے دن کا مالک ہے۔ تو ظاہر ہے کہ جو آدمی اس بات کا یقین وایمان رکھتا ہو کہ دنیا میں جو کچھ کیا ہے اگر اچھا کیا ہے تو، اور برا کیا ہے تو؛ سب کا بدلہ کل قیامت کے روز ملنے والا ہے،تو وہ آدمی کوئی بھی کام کرنے سے پہلے سومرتبہ سوچے گا، اور ایسا آدمی کبھی بھی کوئی کام ناعاقبت اندیشی سے نہیں کرے گا۔اسی لئے حضور ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ آپ نے اس کو دیکھا جو بدلے کے دن کا انکار کرتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت میں اعمال کا بدلہ ملنے والا ہے اس کو نہیں مانتا۔ یہ ایک مشرک تھا جس کا نام کتابوں میں عاص بن وائل بتلایا گیا ہے۔

﴿فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہی ہے وہ شخص جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکینوں کو کھانا کھلانے پر لوگوں کو ابھارتا نہیں ہے۔گویا اس کی یہ سب حرکتیں ہیں۔یہاں تو اس برے وصف کی وجہ سے یہ آیت پیش کی ہے کہ وہ یتیم کو دھکے دیا کرتا تھا۔لہٰذا ایک ایمان والے کو چاہیے کہ ایسے اوصاف سے اپنے آپ کو بچائے۔

جیسے کہ تین باتیں منافق کی نشانیاں اور علامت بتلائی گئی ہیں کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے اور امانت میں خیانت کرے۔ گویا حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ تین باتیں مؤمن کی شان کے خلاف ہیں اور منافقوں کے کام ہیں، یہ کہہ کر آپ ﷺ امت کو تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ مؤمن کو چاہیے کہ ان تین کاموں سے اپنے آپ کو بچائے،اس لئے یہ ایمان والوں کے کام نہیں ہیں۔جیسے بچوں کو سمجھاتے ہیں کہ بیٹا! یہ ہمارا کام نہیں ہے، اسی طریقہ سے اہلِ ایمان کو تعلیم دینے کے لئے ایک انداز یہ بھی اختیار کیا گیا کہ یتیم کو دھکے دینا تو کافروں کا کام ہے، اگر کوئی

آدمی مسلمان ہوکر ایسا کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اگرچہ ایمان سے نہیں نکلتا، لیکن اس کی یہ حرکت ایمان کا تقاضہ نہیں ہے۔

اور ایک وصف یہ ہے کہ مساکین کو کھلانے پر ابھارتا نہیں ہے، یعنی خود تو اتنا بخیل ہے کہ کھلاتا نہیں ہے لیکن دوسروں کو بھی کھلانے پر ترغیب نہیں دیتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جیسے یتیموں اور غریبوں کو خود کھلانا نیکی کا کام ہے اسی طرح دوسروں کو ان امور کی طرف متوجہ کرنا اور ترغیب دینا بھی بڑی نیکی کا کام ہے۔

اب اس سلسلہ میں روایتیں پیش کرتے ہیں۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے مناقب

۲۶۰. عن سعد بن أبی وقاص رضی اللہ عنہ قال: كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ سِتَّةَ نَفَرٍ، فَقَالَ الْمُشْرِكُوْنَ لِلنَّبِيِّ ﷺ، أُطْرُدْ هٰؤُلاءِ لا يَجْتَرِئُوْنَ عَلَيْنَا، وَكُنْتُ أَنَا وَابْنُ مَسْعُوْدٍ وَرَجُلٌ مِّنْ هُذَيْلٍ وَبِلالٌ، وَرَجُلانِ لَسْتُ أُسَمِّيْهِمَا، فَوَقَعَ فِي نَفْسِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ مَاشَآءَ اللهُ أَنْ يَّقَعَ، فَحَدَّثَ نَفْسَهُ، فَأَنْزَلَ اللهُ تَعَالىٰ: وَلا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهُ.

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم چھ آدمی حضور اکرم ﷺ کے ساتھ تھے، مشرکین نے حضور ﷺ سے کہا کہ ان کو یہاں سے نکال لئے، ہم ان کو اپنے خلاف جرأت کا موقعہ نہیں دیں گے۔ ایک تو مَیں تھا، ایک ابن مسعود تھے، قبیلۂ ہذیل کے ایک آدمی تھے، ایک حضرت بلال تھے اور دو آدمی اور تھے مَیں ان کا نام نہیں لیتا۔ نبی کریم ﷺ کے دل میں بھی وہ بات آگئی جو اللہ تعالیٰ نے سجھائی تو آپ نے جی میں کہا کہ ٹھیک ہے۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اے نبی! آپ اپنی مجلس سے ان لوگوں کو نہ ہٹایئے جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، وہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضامندی چاہنے والے ہیں۔

افادات:- حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ان دس صحابہ میں سے ہیں جن کو بیک وقت ایک ہی مجلس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت سنائی تھی۔ دیکھئے! جنت کی بشارت دوسرے صحابہ کے متعلق بھی ہے۔لیکن جن کو عشرۂ مبشرہ کہا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہی موقعہ پر ایک ہی مجلس میں کسی مناسبت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دس حضرات کا نام لے کر جنت کی بشارت سنائی تھی۔تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں اور قبیلہ بنوزہرہ سے ان کا تعلق ہے،اور اسی قبیلہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کا تعلق بھی ہے،اسی لئے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں یعنی رشتہ کے ماموں بھی کہا جاتا ہے،ماں جس خاندان سے ہوتی ہے اس خاندان کے تمام مرد اس بچہ کے ماموں کہلاتے ہیں،بڑے جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں اور یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو شروع میں اسلام لائے تھے،ان کے اور بھی فضائل ہیں۔

خیر! حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم چھ آدمی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔یہ ابتدائی زمانہ کی بات ہے،یہ چھ آدمی کون تھے،آگے ان ناموں کو بتلا رہے ہیں کہ ایک تو مَیں تھا،ایک ابن مسعود تھے،قبیلۂ ہذیل کے ایک آدمی تھے، ایک حضرت بلال تھے اور دو آدمی اور تھے لیکن مَیں ان کا نام نہیں لیتا۔بعضوں نے کہا کہ وہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر تھے۔تو ہم چھ آدمی تھے اور سب ایسے تھے جو ظاہری اعتبار سے زیادہ مال و دولت کے حامل نہیں تھے۔

انسان بھی جانور ہے

دیکھئے! ایک بات یاد رہے کہ ہمیشہ سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے کہ دنیا کے اندر

مال و دولت اور ظاہری اسباب و سامان کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا،انسان کی ایک حیثیت تو جاندار ہونے کی ہے جیسے انسان جان رکھنے والا ایک جسم ہے ایسے ہی دوسرے جانور بھی ہیں۔اورایک جاندار ہونے کی حیثیت سے جوضرورتیں دوسرے جانداروں کوپیش آتی ہیں؛وہی ساری ضرورتیں انسان کوبھی پیش آتی ہیں۔یہ اور بات ہے کہ انسان اپنی ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بہت ترقی کئے ہوئے ہے،باقی تمام جاندار بھی ان ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ایسا کونسا جاندار ہے جس کوکھانے،آرام کرنے اور قضائے حاجت کی ضرورت نہیں پڑتی؟ تمام جاندار چاہے بیل بھینس ہوں چاہے پالتو جانور ہوں یا جنگلی ہوں؛سب کو یہ ضرورتیں پیش آتی ہیں۔تو انسان کی ایک حیثیت تو جاندار ہونے کی ہے۔اور دوسری حیثیت اس کی انسان ہونے کی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ونائب ہونے کی ہے۔

اب قدیم زمانہ سے دنیا میں بسنے والے انسانوں میں اکثریت (majority) ایسے لوگوں کی ہے جو یوں سمجھتے ہیں کہ ہماری زندگی کا نصب العین اور مقصد ہی یہ ہے کہ جوضرورتیں ایک جاندار ہونے کی حیثیت سے ہیں؛بس ان ہی کو پورا کرنا ہے۔چنانچہ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے وہ خوب محنت ومشقت اٹھاتے ہیں اوران ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے جواسباب مہیا ہونے چاہئیں،مال و دولت اور دوسرے ساز و سامان وغیرہ انہیں کوجمع کرنے کی فکر کرتے ہیں،اور جب وہ سارے اسباب میسر آجاتے ہیں تو وہ یوں سمجھتے ہیں کہ اب ہم نے اپنی زندگی کا مقصد حاصل کرلیا،اور پھراسی پیمانے پر لوگوں کوناپنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس کے پاس مال ودولت اورضرورتیں پورا کرنے کےاسباب وسامان زیادہ ہیں؛انہیں کووہ اہمیت دیتے ہیں۔

انسانیت کے اصل جوہر

حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا کے اندر انسان کو ان ضرورتوں کے واسطے نہیں بھیجا طبعی ضرورتیں ہونے کی وجہ سے ان کا پورا کرنا ضروری ہے اور ان کو پورا کرنے کے لئے انسان کو کوشش کرنے کی اللہ تعالیٰ نے اجازت بھی دی ہے، لیکن انسان کو پیدا کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے، بلکہ انسان کی انسانیت کے اصل جوہر ایمان ویقین، اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ ہیں، دراصل یہی وہ چیزیں ہیں جو انسان کے انسانیت والے جوہر کو جِلا بخشتی ہیں اور ان کی وجہ سے انسانیت کی ترقی ہوتی ہے۔ تو انسان ہونے کی حیثیت سے یہی اوصاف حاصل کرنا مقصدِ زندگی ہے، اسی لئے قرآنِ پاک میں بھی اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کس کا مرتبہ ومقام کیا ہے؟ ﴿اِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ﴾ وہاں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ کس کے پاس مال ودولت زیادہ ہے، زندگی کے اسباب، ساز وسامان اور راحت کی چیزیں زیادہ ہیں، کس کے پاس بنگلہ ہے، کس کے پاس فیکٹری ہے، کس کے پاس کاریں ہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم اور باعزت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرنے والا اور گناہوں سے بچنے والا ہو۔

اخلاق کا تعلق قلب سے، اور ظہور افعال سے

اخلاق کا تعلق تو آدمی کے قلب سے ہے، تواضع وانکساری اور دوسرے جتنے بھی اخلاق ہیں ان تمام کا تعلق دل سے ہے، اور ان کا ظہور آدمی کے اعمال سے ہوتا ہے، جیسے سخاوت ہے، یہ صفت آدمی کے چہرے پر یا اس کی پیشانی پر اور ہاتھ پر نظر نہیں آئے گی بلکہ وہ تو اس کے دل کی ایک صفت ہے، اور اس سخاوت کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ

آدمی اپنے مال کولوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق خوب خرچ کرتا ہے، روکتا نہیں ہے، جہاں جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں اس کے خرچ کرنے میں ذرّہ برابر بھی تامل نہیں کرتا، تو سخاوت دل کا وصف ہے اور اس کا صدور مال خرچ کرنے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

اسی طرح بہادری کا وصف ہے جو قلب کے اندر رکھی ہوئی ایک خوبی ہے، جس کا ظہور افعال سے ہوتا ہے۔ میدانِ جہاد میں جب جان کی بازی لگا کر اسلام کی حفاظت کرتا ہے اور اپنی بہادری کے جوہر دکھلاتا ہے اُس وقت لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ فلاں کے اندر اتنی بہادری ہے۔ اسی طرح دوسرے اوصاف تواضع وانکساری، ایمان ویقین وغیرہ کا بھی حال ہے، یہ سب نظر آنے والی چیزیں نہیں ہیں بلکہ جب اس سے افعال صادر ہوتے ہیں تو ان کو دیکھ کر لوگ فیصلہ کرتے ہیں کہ فلاں کے اندر کتنا ایمان و یقین مضبوط ہے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ جن صفات پر اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت ملتی ہے وہ لوگوں کے اندر چھپی ہوئی ہیں، ان کا فیصلہ ظاہری حالت کو دیکھ کر نہیں کیا جاسکتا مثلاً ایک آدمی ظاہری اعتبار سے کمزور ہے، اس کے کپڑے پھٹے پرانے اور میلے کچیلے ہیں، ہیئت ٹھیک نہیں ہے، چہرہ حسین وجمیل نہیں ہے، تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ اوصاف جو عنداللہ مقبولیت کا مدار ہیں وہ بھی اس کے اندر نہیں پائے جاتے۔ ہوسکتا ہے کہ جس کے کپڑے بہت زیادہ اجلے اور استری کئے ہوئے ہیں اور چہرہ بھی زیادہ حسین وجمیل ہے، اُس آدمی کے مقابلہ میں اِس میں یہ اوصاف زیادہ موجود ہوں۔ اسی بات کو یہاں بتلانا چاہتے ہیں کہ کسی کی ظاہری حیثیت دیکھ کر فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔

انبیاؑ کی صداقت کی ایک خاص علامت

اور ہمیشہ سے ایسا ہوتا رہا ہے کہ نبی کی دعوت کو قبول کرنے والے شروع میں اسی طرح کے لوگ رہے ہیں، اور اخیر میں جب پانی سر سے اوپر جاتا ہے تو پھر سب آتے ہیں لیکن اولین وہلہ میں غرباء اور مساکین قسم کے لوگ ہوتے ہیں، بلکہ یہ تو صداقت کی خاص علامت سمجھی گئی ہے۔ بخاری شریف میں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب دنیا کے مختلف بادشاہوں کے نام خطوط بھیجے تو روم کے بادشاہ ہرقل کو بھی ایک خط لکھا جس میں آپ نے اس کو اسلام کی دعوت دی، قیصرِ روم اپنے زمانہ کا کتبِ سابقہ کا بڑا عالم بھی تھا، اس زمانہ میں دینِ نصاریٰ کا جو سب سے بڑا پادری تھا، قیصرِ روم بھی اسی جیسا بڑا عالم تھا۔ جب اس کو یہ بتایا گیا کہ تمہارے نام ایک آدمی نے ایک خط بھیجا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے اور وہ اپنے آپ کو اللہ کے بھیجے ہوئے نبی و رسول بتاتے ہیں تو اس نے وہ خط کھولا نہیں، بلکہ پہلے پوچھا کہ جس نے یہ خط بھیجا ہے کیا اس کے حالات سے واقفیت رکھنے والے کچھ لوگ ہمارے علاقہ میں ہیں؟ اس وقت وہ بیت المقدس کی زیارت کو آیا ہوا تھا۔ لوگوں نے بتلایا کہ ملکِ شام میں عرب سے تجارتی قافلے آتے ہی رہتے ہیں، ہم تلاش کرتے ہیں۔ اتفاق کی بات کہ وہ زمانہ صلحِ حدیبیہ کے بعد کا تھا اور ابوسفیان جو اس وقت مکہ کے سردار تھے اور اسلام کے خلاف جو قوتیں اُس وقت سرگرمِ عمل تھیں ان سب کے رئیس بھی وہی تھے، جیسے آج کل امریکہ کا کلنٹن ہے۔ آج کل اسلام کے خلاف جتنی قوتیں سرگرمِ عمل ہیں ان میں نمبر اول پر امریکہ ہے۔ تو اُس وقت ابوسفیان کی حیثیت بالکل مدِ مقابل کی

تھی، اور وہی ایک تجارتی قافلہ لے کر وہاں گئے ہوئے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ ایک قافلہ آیا ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ اس کو بلاؤ۔ ان کو بلایا گیا اور چونکہ ہرقل عربی زبان نہیں جانتا تھا اس وجہ سے ترجمان ([illegible]) کے ذریعہ سے ان کے ساتھ بات چیت کی، ابوسفیان کو آگے بٹھایا اور دوسرے ساتھیوں کو پیچھے بٹھایا اور ساتھیوں سے کہا کہ دیکھو! مَیں ان سے کچھ سوالات کروں گا، اگر یہ غلط بات کہیں تو مجھے بتا دینا۔ اس نے کئی سوالات کئے، ایک سوال یہ کیا کہ ان پر ایمان لانے والے کون ہیں؟ قوم میں جو کمزور سمجھے جاتے ہیں وہ ہیں، یا رؤسا اور بڑے لوگ ہیں؟ ابوسفیان نے کہا کہ ہم میں جو گھٹیا اور کمزور قسم کے لوگ ہیں وہی ان پر ایمان لاتے ہیں۔ ابوسفیان نے یہ سوچ کر یہ جواب دیا کہ شاید اس کی وجہ سے ان کے خلاف اثر پڑے گا لیکن سب سوالات کر چکنے کے بعد ہرقل نے اس کا تجزیہ کیا اور اس سوال کے جواب پر ہرقل نے یوں کہا کہ تم نے یوں کہا کہ ان پر ایمان لانے والے اور ان کی دعوت پر لبیک کہنے والے اور ان کی طرف لپکنے والے کمزور لوگ ہیں، تو تمام انبیاء کرام کا یہی حال رہا ہے کہ جب ان کی دعوت شروع ہوتی ہے تو اولین وہلہ میں اس پر لبیک کہنے والے کمزور لوگ ہی ہوتے ہیں۔ مَیں یہی عرض کر رہا تھا کہ یہی بات صداقت کی علامت سمجھی گئی ہے۔

غریبوں کو ہٹائیے

بہر حال! حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم کمزور قسم کے چھ آدمی تھے، اور ان مشرکین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں کہا کہ آپ ہم کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں اور آپ کے پاس بیٹھنے والے تو ایسے گرے پڑے کمزور قسم کے لوگ ہیں، بھلا ان

لوگوں کے آپ کے قریب ہوتے ہوئے ہم کہاں آ سکتے ہیں، اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی بات سنیں اور اس کی طرف توجہ کریں اور اس کو لائقِ اعتناء سمجھیں اور آئندہ اس کو قبول کرنے کے سلسلہ میں کچھ سوچیں؛ تو پھر ان لوگوں کو پہلے رخصت کیجیے، ہم اکیلے ہی آپ کی مجلس میں ہوں گے۔ جیسے بڑے لوگ کمزور لوگوں کو قریب بھی آنے نہیں دیتے، وہ یہی سوچتے ہیں کہ ان کی جرأت بڑھ جائے گی۔ ان لوگوں نے بھی یہی کہا کہ اگر ان کے ہوتے ہوئے ہم آپ کی مجلس میں شرکت کریں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ان کو اپنے خلاف جرأت کا موقعہ دیں گے۔ لہٰذا ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ مشرکین نے آپ ﷺ کے چچا ابو طالب سے کہا کہ آپ کے بھتیجے ہم کو دعوت تو دیتے ہیں لیکن ان کے آس پاس بیٹھنے والے یہی لوگ ہیں، اگر وہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کی بات کی طرف توجہ کریں تو پھر ان کو چاہیے کہ ان لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیں، ہم جس وقت پہنچیں تو ہم ہی ہم ہوں، ان میں کا کوئی نہ ہو؛ تب تو ان کی بات سنیں گے؛ ورنہ نہیں۔ (روح المعانی)

آپ ﷺ کا دعوتی جذبہ

دیکھو! داعی جو ہوتا ہے اس کو بڑا شوق وجذبہ ہوتا ہے کہ میری دعوت کو سب لوگ قبول کرلیں، اس کی کوشش یہی ہوتی ہے، وہ یوں سوچتا ہے کہ کس طرح لوگ میری سنیں اور کس طرح میں اپنی بات لوگوں کے دل میں اتاروں، جس طرح بھی ہو وہ اس کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ بہر حال! روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کو مشورہ دیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ ایک مجلس ان کے لئے الگ سے قائم کیجیے،

اس میں کیا حرج ہے، اور اس میں ہم لوگ نہیں آئیں گے، اور پھر یہ سب تو اپنے ہی ہیں، ان کو اگر اس مجلس میں شرکت کا موقعہ نہیں دیا جائے گا تو کوئی بھی برا نہیں مانے گا، لہٰذا آپ ایسا کرلیں۔ اگر ہم کو فیصلہ کرنے کا موقعہ آجائے تو وہی فیصلہ کریں گے جیسا حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا تھا۔ ہم سوچیں گے کہ یہ تو ہماری بات قبول کر چکے ہیں، اور یہ تو گھر کے ہی لوگ ہیں، اگر ان کو ایک مجلس سے نکال بھی دیں تو کیا حرج ہے، ان کو اس مجلس میں آنے دو۔ اگر اس طرح بھی ان کے سامنے بات رکھ دی جائے اور وہ غور کریں تو ہوسکتا ہے کہ وہ قبول کرلیں اور اسلام کو ترقی ہو جائے گی۔ حضرت عمر نے بھی یہی سوچا اور حضور ﷺ کے جی میں بھی آ گیا کہ ایسا کرلیں، کوئی حرج کی بات نہیں ہے، لیکن باری تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں! اس طرح ان کے آپ کی مجلس میں آنے سے اور ان کے اس نظریہ کے ساتھ آپ کی دعوت قبول کرنے سے اسلام کو ترقی ہونے والی نہیں ہے، اسلام روپے پیسے اور ساز و سامان کا نام نہیں ہے، آپ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ آئیں گے تو ترقی ہوگی؛ ایسا نہیں ہے، بلکہ اسلام کو ترقی تو اُنہی اوصاف کے ذریعہ سے ہوگی جن کی دعوت اسلام دیتا ہے۔ (ذکرہ الواحدی فی اسباب النزول۔ التحریر والتنویر۔ سورۂ انعام، ۶/ ۱۱۵)

آپ غریبوں کو مت ہٹایئے

مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ بعض ہی مواقع ہیں جہاں باری تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کو عتاب کیا گیا ہے ان میں سے ایک موقع یہ بھی ہے ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ اے نبی! آپ اپنی مجلس سے ان لوگوں کو نہ ہٹایئے جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، وہ خالص اللہ تعالیٰ کی

رضا مندی چاہنے والے ہیں یعنی وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف خلوص کے ساتھ متوجہ رہتے ہیں، یہاں دونوں چیزیں جمع ہوگئیں، بہت سی مرتبہ آدمی ذکراللہ میں مشغول ہوتا ہے لیکن اخلاص نہیں ہوتا لیکن اس آیت میں ﴿يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ کا لفظ بتلاتا ہے کہ وہ اللہ کو اخلاص کے ساتھ پکارتے ہیں، اور یہی تو اصل مقصود ہے۔

﴿مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ یہاں اہلِ علم موجود ہیں جو جانتے ہیں کہ ﴿مِنْ حِسَابِهِمْ﴾ میں ﴿هُمْ﴾ کی ضمیر دونوں کی طرف لوٹائی گئی ہے ﴿الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ﴾ کی طرف بھی اور ان مشرکین کی طرف بھی جنہوں نے مطالبہ کیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اے نبی! ان مشرکین کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے ان کا حساب آپ سے نہیں لیا جائے گا جب کہ آپ نے اپنی دعوت ان تک پہنچا دی ﴿وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ﴾ اور آپ ان کی پیش کش کو قبول نہیں کریں گے تو ان پر کوئی زد پڑنے والی نہیں ہے ﴿فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظَّالِمِيْنَ﴾ اگر آپ ان کو اپنے پاس سے ہٹا دیں گے تو آپ زیادتی کرنے والے ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو صاف طور پر سختی کے ساتھ روک دیا گیا۔

اس آیت کو لاکر یہی بتانا مقصود ہے کہ دیکھو! جتنے بھی کمزور، یتیم، مسکین اور ایسے شکستہ حال ہیں، ان کی ظاہری حالت کی وجہ سے فیصلہ نہ کیا جائے، اس لئے کہ ظاہری حالت کی وجہ سے آپ کیسے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کس مقام پر ہیں، قبولیت کے لئے جن اوصاف کی ضرورت ہے وہ تو دلوں کے اندر پوشیدہ ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی ان سے بخوبی واقف ہے۔

جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صہیب رضی اللہ عنہ وغیرہ سے معافی مانگی

۲۶۱. عن أبی هبیرة عائذ بن عمرو الْمُزَنِی وَهُوَمِنْ أَهْلِ بَيْعَةِ الرِّضْوَان رضی اللہ عنہ أَنَّ أَبَاسُفْيَانَ أَتٰى عَلىٰ سَلْمَانَ وَصُهَيْبٍ وَبِلَالٍ فِيْ نَفَرٍ، فَقَالُوْا: مَاأَخَذَتْ سُيُوْفُ اللّٰهِ مِنْ عَدُوِّاللّٰهِ مَأخَذَهَا. فَقَالَ أَبُوْبَكْرٍ رضی اللہ عنہ: أَتَقُوْلُوْنَ هٰذَالِشَيْخِ قُرَيْشٍ وَسَيِّدِهِمْ؟ فَأَتَى النَّبِىَّ صلی اللہ علیہ وسلم فَأَخْبَرَهُ، فَقَالَ: يَاأَبَابَكْرٍ! لَعَلَّکَ أَغْضَبْتَهُمْ؟ لَئِنْ كُنْتَ أَغْضَبْتَهُمْ لَقَدْأَغْضَبْتَ رَبَّکَ. فَأَتَاهُمْ، فَقَالَ: يَاإِخْوَتَاهُ! آغْضَبْتُكُمْ؟ قَالُوْا: لا، يَغْفِرُاللّٰهُ لَکَ يَاأُخَيَّ.

حضرت ابوہبیرہ رضی اللہ عنہ جواہلِ بیعتِ رضوان میں سے ہیں، ان سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ ابوسفیان حضرت سلمان فارسی، حضرت صہیب رومی، حضرت بلال حبشی اور دوسرے فقراء کے پاس سے گزرے، ان کو دیکھ کر یہ حضرات کہنے لگے کہ اللہ کی تلواروں نے اللہ کے دشمنوں سے ابھی تک اپنا حق وصول نہیں کیا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے کہا کہ تم قریش کے ایک بڑے آدمی اور سردار کو ایسی بات کہتے ہو؟ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اطلاع دی۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! شاید تم نے ایسا جملہ کہہ کر ان حضرات کو ناراض کر دیا، اگر تم نے ان کو ناراض کر دیا تو اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فوراً ان کے پاس گئے اور کہا اے بھائیو! کیا میں نے تم لوگوں کو ناراض کر دیا؟ ان لوگوں نے کہا کہ نہیں اے بھائی! اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔

افادات:- حضرت ابوہبیرہ رضی اللہ عنہ اہلِ بیعتِ رضوان میں سے ہیں، ان سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ صلحِ حدیبیہ کے زمانہ میں ابوسفیان کا مدینہ منورہ آنا ہوا۔ حضرت سلمان فارسی، حضرت صہیب رومی، حضرت بلال حبشی اور دوسرے فقراء مسلمان ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے، ابوسفیان وہاں سے گزرے تو ان کو دیکھ کر یہ حضرات کہنے لگے کہ اللہ کی تلواروں نے اللہ کے دشمنوں سے ابھی تک اپنا حق وصول نہیں کیا ہے۔ ان کی یہ بات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اچھی نہیں لگی۔ ابوسفیان اگرچہ اسلام نہیں لائے تھے لیکن قریش کے سردار اور بڑے آدمی تھے، اور

حدیثِ پاک میں حضور اکرم ﷺ نے قوم کے بڑے کا اکرام کرنے کا حکم دیا ہے۔

بہر حال! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے یوں کہا کہ تم قریش کے ایک بڑے آدمی اور سردار کو ایسی بات کہتے ہو؟ گویا انہوں نے ان کی بات پر ناگواری کا اظہار کیا کہ تم نے یہ اچھی بات نہیں کہی۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور ﷺ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اطلاع دی کہ یا رسول اللہ! آج ایسا ہوا کہ ابوسفیان گذر رہے تھے، تو فلاں فلاں نے یہ جملہ کہا اس پر مَیں نے ان کو تنبیہ کی کہ ایسا نہیں بولنا چاہیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے ابوبکر! شاید تم نے ایسا جملہ کہہ کر ان حضرات کو ناراض کر دیا، اگر تم نے ان کو ناراض کر دیا تو اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دیا۔ دیکھئے! یہ جملہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کہا جارہا ہے، حضور ﷺ ان کو تنبیہ کر رہے ہیں۔

یہ حضراتِ صحابہ ہی کی شان تھی کہ حضور ﷺ نے جہاں یہ جملہ کہا فوراً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے پاس گئے، اور کہا اے بھائیو! کیا مَیں نے اپنا وہ جملہ کہہ کر تم لوگوں کو ناراض کر دیا؟ اگر ایسا ہو تو مَیں معافی مانگنے آیا ہوں۔ ان لوگوں نے کہا کہ نہیں حضرت! اگر آپ ایسی بات کہیں تو اس پر ہم کہاں ناراض ہو سکتے ہیں۔ پھر کہا کہ اگر چہ ہم ناراض نہیں ہوئے ہیں پھر بھی ہم آپ کے لئے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔

دیکھئے! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جن کو تنبیہ کی تھی وہ حضرات سلمان، صہیب وبلال وغیرہ رضی اللہ عنہم تھے۔ اب ایک امکان ہے کہ اگر یہی جملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہوتا تو کیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کو بھی تنبیہ کرتے؟ ممکن ہے کہ نہ کرتے، اس لئے کہ وہ قوی اور صاحبِ حیثیت آدمی تھے، اور یہ حضرات سلمان وصہیب وبلال وغیرہ رضی اللہ عنہم کمزور سمجھے جاتے تھے اور ان کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تنبیہ کی، اس لئے حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو متوجہ کیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی اس کو بڑی سنجیدگی سے قبول کیا۔

مُلَاطَفَةُ الْيَتِيمِ وَالْبَنَاتِ

یتیم اور بچیوں کے ساتھ مہربانی

مجلس (۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیان چل رہا تھا کہ یتیم بچوں، لڑکیوں اور تمام کمزوروں کے ساتھ نرمی، احسان اور شفقت کا معاملہ کرنا چاہیے۔ اسی سلسلہ میں روایتیں پیش کرتے ہیں۔

یتیم کی پرورش کرنے والوں کے لئے بڑی بشارت

۲۶۲. وعن سهل بن سعد رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ هٰكَذَا. وَأَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ وَالْوُسْطىٰ وَفَرَّجَ بَيْنَهُمَا.

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مَیں اور یتیم کی پرورش کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے۔ اور آپ نے اپنی درمیانی انگلی اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا۔ اور دونوں کے بیچ میں تھوڑی جگہ رکھی۔

۲۶۳. عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: كَافِلُ الْيَتِيمِ لَهُ أَوْلِغَيْرِهِ أَنَاوَهُوَ كَهَاتَيْنِ فِي الْجَنَّةِ. وَأَشَارَ الرَّاوِي وَهُوَمَالِكُ بْنُ أَنَسٍ بِالسَّبَّابَةِ وَالْوُسْطىٰ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے یا دوسرے کے یتیم کی پرورش کرنے والا اور مَیں جنت میں اس طرح ہوں گے، پھر راوی حدیث (حضرت امام مالکؒ) نے درمیانی انگلی اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا۔

افادات: — اس روایت میں ایک زیادتی ہے ﴿كَافِلُ الْيَتِيمِ لَهُ أَوْلِغَيْرِهِ﴾ یعنی چاہے وہ یتیم اس کا اپنا ہو یا دوسرے کا ہو۔

اسلام نے یتیموں کو ان کے حقوق دلوائے

یتیموں کے ساتھ زمانۂ جاہلیت میں بہت زیادتیاں کی جاتی تھیں کہ ان کے مال کو ہضم کر لیتے تھے، ان کے ساتھ ظلم وزیادتی کرنا عام دستور تھا اور کوئی بھی یتیم کے ساتھ حقوق کی ادائیگی کا اہتمام نہیں کرتا تھا، اسلام نے آ کر جہاں اللہ تعالیٰ کے حکم سے

حق والوں کے حقوق کی ادائیگی کی طرف توجہ دلائی، وہیں خاص طور پر وہ طبقہ جس کو کمزور سمجھا جاتا تھا اور ان کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر زورآور اور طاقتور لوگ ان کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت و کوتاہی برتتے تھے، ایسے لوگوں کے حقوق کی ادائیگی کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی، اور انہیں میں سے ایک طبقہ یتیموں کا ہے۔ کمزوروں کا تذکرہ پہلے آچکا ہے، آج یتیم کی بات آئی ہے۔

پہلے بتلا چکا ہوں کہ یتیم اس بچے کو کہتے ہیں جس کے والد کا انتقال ہو چکا ہو اور وہ ابھی نابالغ ہو۔ جب تک وہ نابالغ ہے وہاں تک اس کو یتیم کہا جائے گا اور جب وہ بچہ بالغ ہو گیا تو اب شرعی طور پر وہ یتیم نہیں رہا۔ یہ بات اور رہی کہ لوگ اس کو عرف میں بعد میں بھی ایک زمانہ تک یتیم سے تعبیر کرتے رہتے ہیں۔

قرآن کا حکم؛ آپ ﷺ کا عمل

خیر! چونکہ زمانۂ جاہلیت میں یتیموں کے حقوق کی ادائیگی میں بڑی کوتاہی برتی جاتی تھی، اس لئے ضرورت تھی کہ اس طرف متوجہ کیا جاتا، لہٰذا اس سلسلہ میں قرآنِ پاک نے ہدایت دی۔ پچھلے ہفتہ گذر چکا ﴿فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ یتیم کے اوپر چڑھ مت بیٹھو۔ دوسری آیتوں میں بھی یتیم کے ساتھ حسنِ سلوک کی بڑی تاکید آئی ہے۔ تو جہاں اللہ تعالیٰ نے یتیموں کے سلسلہ میں خاص تاکید فرمائی؛ وہیں نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشادات میں بھی بڑی تاکید فرمائی ہے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ خود اپنی طرف سے کچھ نہیں فرماتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب اللہ میں جو احکام نازل کئے جاتے تھے انہیں کی تشریح اپنے عمل اور اپنے ارشادات سے فرماتے تھے۔ گویا جو قرآن پاک کا حکم ہے؛ وہی آپ ﷺ کا عمل ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا تو انہوں نے جواب میں یہی فرمایا ﴿کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن﴾ نبی کریم ﷺ کے اخلاق قرآن ہی ہیں یعنی اگر آپ کے اخلاق معلوم کرنے ہوں تو قرآن کا مطالعہ کرلو، آپ کی ذاتِ اقدس قرآنِ پاک کا عملی نمونہ تھی اور قرآن ہی کی تشریح کے لئے آپ کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا تھا۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی ہدایت کے واسطے جو وحی بھیجی گئی ہے آپ ﷺ اس کو ان کے سامنے کھول کھول کر واضح کر کے بیان کر دیں۔

حضورِ اقدس ﷺ کا قرب حاصل کرنے کا بہترین طریقہ

یتیم کی پرورش کا مطلب یہ ہے کہ اس کو کھلانے پلانے اور اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اپنے سر لے لے، یہاں تک کہ وہ خود کفیل ہو جائے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے تو نبی کریم ﷺ نے اس کو کتنا بڑا مقام عطا فرمایا کہ یتیم کی پرورش کرنے والا اور مَیں جنت میں ساتھ ساتھ ہوں گے۔ اگرچہ کچھ فرق ہے لیکن جو قرب اور نزدیکی اس کو حاصل ہوگی اس کو حضور اقدس ﷺ اس انداز سے تعبیر فرما رہے ہیں۔

جن حضرات کے دل نبی کریم ﷺ کی محبت سے بھرے ہوئے ہیں ان کے لئے تو یہ چیز بہت بڑی بشارت اور بڑی خوشی کی ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا قرب حاصل کرنے کے جہاں اور طریقے ہیں؛ ان میں ایک بہترین طریقہ یہ بھی ہے۔ کسی ایک یتیم کے ساتھ بھی ایسا معاملہ کر لیا تو یہ فضیلت حاصل ہو جائے گی۔

اپنا یتیم

دوسری روایت نے تو معاملہ اور زیادہ آسان کر دیا، اس لئے کہ عام طور پر ہم

لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ یتیم وہی ہے جو پرایا ہو، حالانکہ اپنے گھروں میں بھی یتیم ہوا کرتے ہیں مثلاً کسی کے والد کا انتقال ہوگیا، بڑا بھائی بالغ ہے، چھوٹے بھائی نابالغ ہیں تو چھوٹے بھائی یتیم ہیں، اب یہ بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائیوں کی نگرانی اور پرورش کرے گا، ان کی خیر خبر رکھے گا تو قرآن وحدیث میں یتیم کی پرورش پر جو وعدے بیان فرمائے ہیں ان سب کا وہ حقدار ہوجائے گا، یہ اپنا یتیم ہوا۔ اپنے یتیم کی اور بھی کئی صورتیں ہیں ان میں سے ایک صورت یہ ہے

رسمیت نہ ہو

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ والد کے انتقال کے وقت بھائی بہن چھوٹے ہوتے ہیں تو بڑا بھائی ہی ان کی ذمہ داری نبھاتا ہے۔ لیکن ہم لوگ بہت سی چیزیں معاشرے کے رسم ورواج اور دستور کی وجہ سے کرتے ہیں۔ دیکھو! ہمارے معاشرے کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر ہی پڑی ہوئی ہے، لیکن ہم لوگ جب ان چیزوں کو انجام دیں تو صرف معاشرے کی رسم ورواج ہمارے پیشِ نظر نہ ہو، بلکہ اس وقت ہماری نگاہوں کے سامنے اللہ تبارک وتعالیٰ اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات ہوں، اس لئے کہ یہ کام تو کرنا ہی ہے، جب بڑے بھائی کے سر پر یہ ذمہ داری اور بوجھ آیا تو وہ لامحالہ کرے گا، لیکن ایسے موقعہ پر جو اہلِ علم ہیں ان کو چاہیے کہ اس کی توجہ اس طرف دلائیں کہ تم جو کام کررہے ہو وہ رسمی نہیں ہے بلکہ قرآنِ پاک میں اس کی تاکید اور اس پر اتنی فضیلتیں آئی ہیں، نبی کریم ﷺ نے اس پر یہ یہ وعدے اور بشارتیں سنائی ہیں، لہٰذا جب تم یہ کام کررہے ہو؛ تو یہ سمجھ کر کرو کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے احکام کو بجالا رہا ہوں۔

دیکھو! کسی کام کو کرنا ایک تو رسم ورواج کے طور پر ہوتا ہے اور ایک اللہ ورسول

کے حکم کو بجالانے کی نیت سے ہوتا ہے، اور جو ثواب کے وعدے ہیں وہ تو درحقیقت اس دوسری صورت میں ہی پورے طور پر حاصل ہوں گے۔ ویسے ثواب سے تو پہلی صورت میں بھی محروم نہیں رہے گا لیکن جب اللہ ورسول کے حکم کو پورا کرنے کی نیت سے انجام دیں گے تو بہت اونچا مقام حاصل ہوگا اور اس پر تو ہر چیز میں ثواب ہی ثواب ہے۔

اپنے یتیم کی مختلف شکلیں

خیر! اپنے یتیم کی ایک شکل تو یہ تھی جو اوپر گذری۔ ''اپنے یتیم'' کی دوسری شکلیں بھی ہیں کہ بڑے بھائی کا انتقال ہوگیا اور اس کے بچے چھوٹے ہیں، عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ خاندان کے اندر دوسرے چھوٹے بھائی ان کے بچوں کی تعلیم وتربیت اور دوسری تمام ذمہ داریوں کو انجام دیتے ہیں۔ یہ بھی اپنا ہی یتیم ہے۔

اسی طرح ایک شکل یہ ہے کہ باپ کی موجودگی میں بیٹے کا انتقال ہوگیا اور وہ شادی شدہ تھا، اس نے دو چار نابالغ چھوٹے بچے چھوڑے، ان کی ذمہ داری دادا کے سر آگئی؛ یہ بھی اپنا ہی یتیم ہے۔

ایک شکل یہ ہے کہ اپنے داماد کا انتقال ہوگیا اور اس نے چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے، اب نانا کے سر پر ان بچوں کی ذمہ داری آگئی۔ یا بہن کا انتقال ہوگیا اور اس کے بچے ہیں تو ماموں کے سر پر ذمہ داری آگئی۔ عام طور پر ہمارے معاشرے میں یہ سب ہوتا ہے اور یہ سب ذمہ داریاں لوگ نبھاتے ہیں، لیکن یتیم کی کفالت کی نیت سے نہیں کرتے، بلکہ رسمی طور پر انجام دیتے ہیں۔

ہم لوگ یتیم کی کفالت کا مطلب صرف اسی کو سمجھتے ہیں کہ کوئی بچہ پرایا ہو، جس

کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہ ہو اور اس کی ذمہ داری ہم اپنے سر لیں؛ تب ہی یہ فضیلت حاصل ہوگی ایسا نہیں ہے۔ دیکھو! یہاں صراحت موجود ہے۔ نبی کریم ﷺ صاف صاف فرما رہے ہیں کہ اپنا یتیم ہو یا دوسرے کا ہو۔ اپنے یتیم کا مطلب کتابوں میں تمام علماء نے یہی لکھا ہے کہ گھر کے اندر کوئی بچہ یتیم ہو گیا ہو، چاہے وہ بھائی ہو یا بھائی کا بچہ ہو، یا بہن کا بچہ ہو، پوتے پوتیاں ہوں، نواسے نواسیاں ہوں؛ یہ سب اپنے یتیم ہیں۔

نیت درست کرلو

اور عام طور پر ہر معاشرہ میں سب لوگ یہ ذمہ داریاں نبھاتے ہیں، لیکن اس وقت یہ چیز ذہنوں میں نہیں ہوتی؛ حالانکہ اسی کو احتساب کہتے ہیں اور ہر کام میں شریعت نے یہ چیز خاص طور پر ملحوظ رکھی ہے، جیسے حدیثِ پاک میں آتا ہے ﴿مَنْ صَامَ رَمْضَانَ اِيْمَاناً وَّ احْتِسَاباً غُفِرَ لَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ﴾ جس نے رمضان کے روزے ایمان کی حالت میں اور احتساب یعنی ثواب کی امید رکھتے ہوئے رکھے یعنی یہ سمجھ کر رکھے کہ جو کچھ کر رہا ہوں اس پر مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب ملے گا؛ تو اس کے پچھلے تمام گناہ معاف ہوں گے۔ اسی طرح اکثر کاموں میں لفظِ احتساب آتا ہے، اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ جب آدمی وہ کام کر رہا ہو، اُس وقت اس کے ذہن میں یہ نیت ہو؛ تب ہی اللہ تعالیٰ کے لئے کیا ہوا کہلائے گا ہم جو کام انجام دے رہے ہیں وہ کس کے لئے ہے ، اللہ تعالیٰ تو دلوں کے حال سے بخوبی واقف ہے، وہ دانا و بینا ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ یہ کام کس کے لئے کر رہا ہے۔ اگر کوئی آدمی وہ کام اس لئے انجام دے رہا ہے کہ نہیں کروں گا تو لوگ طعن و تشنیع کریں گے اور برا بھلا کہیں گے کہ دیکھو! ابا کا انتقال ہو گیا

لیکن چھوٹے بھائیوں کی ذرا بھی دیکھ بھال نہیں کرتا، یعنی سماج کے طعن و تشنیع کے ڈر سے کرے گا؛ تو یہ ایک رسمی کام ہو جائے گا اور اس پر وہ فضیلت حاصل نہیں ہوگی۔ اس لئے وہ یہ سوچ کر کرے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور نبی کریم ﷺ نے اس کی ترغیب دی ہے۔

مثلاً ایک آدمی کا آپ کے ساتھ تعلق ہے، اب آپ کا بیٹا اس کے یہاں گیا تو اس نے آپ کی وجہ سے اس کی بہت خاطر مدارت کی اور بہت عزت کا مقام دیا کہ تم ہمارے دوست کے بیٹے ہو اور بڑا اکرام کیا، حالانکہ اس بچے کی تو کوئی حیثیت نہیں تھی، بعد میں بیٹے نے آ کر آپ کو بتلایا کہ فلاں صاحب کے یہاں گیا تھا اور ان کو جب معلوم ہوا کہ مَیں آپ کا بیٹا ہوں تو پھر کیا کہنا، وہ تو بچھ گئے اور میری بہت خاطر مدارت کی؛ تو اب آپ ہی بتلایئے کہ آپ کے دل میں اس کے متعلق کیا جذبہ ہوگا؟ جب ہمارا یہ معاملہ ہے کہ کوئی ہماری وجہ سے کسی کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کرتا ہے تو ہم زندگی بھر اس کو نہیں بھولتے، تو پھر اللہ تعالیٰ کا معاملہ کیا ہوگا؟ جب ایک انسان کی شرافت یہ گوارا نہیں کرتی کہ میری وجہ سے کسی کے ساتھ عزت کا معاملہ ہوا تو میں اس کو بھول جاؤں، تو پھر اللہ تعالیٰ کی ذات جس نے سب کو پیدا کیا، سارے انسانوں کا وہ مالک ہے، اس کے کہنے کی وجہ سے کسی کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات اور احادیث کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اچھا سلوک کرنے والے کے مقام کا اندازہ لگاؤ۔ اسی لئے ان کاموں کو کرتے وقت یہ چیز خاص طور پر ملحوظ رکھنی چاہیے۔

قدیم زمانہ میں بہت سے کام ہمارے آباء و اجداد نے اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر کئے تھے اور ہمارے معاشرے میں آج بھی وہ سلسلہ چلا آ رہا ہے، اب ہم اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے یوں سمجھتے ہیں کہ یہ کام سماج کا دستور ہے

اس لئے ہم کررہے ہیں، لیکن یہ سمجھ کرنہیں کرتے کہ یہ اسلام کی تعلیم ہے، خدا اور رسول کا حکم ہے، اس وجہ سے اس میں بڑا فرق ہوجاتا ہے۔ لہٰذا یہ چیز بھی ہمارے مدِّ نظر رہنی چاہیے۔

جب بھی کوئی نیا معاملہ پیش آئے اور آپ نہیں جانتے تو کم از کم پوچھ لیجیے کہ ایسی صورتِ حال ہے، کیا اس سلسلہ میں شریعت میں کچھ حکم ہے؟ آپ کو معلوم ہوجائے گا، اور پھر آپ بہت سی نیتیں کرسکتے ہیں ایک ہی کام کو مختلف نیتوں سے کرنے پر ثواب میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ بہر حال! نبی کریم ﷺ نے یتیموں کی پرورش کی خاص تاکید فرمائی ہے۔

اصلی اور نقلی مسکین کی پہچان

۲۶۴. وعنه قال قال رسول الله ﷺ: لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ الَّذِیْ تَرُدُّهُ التَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ وَلَا اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ. اِنَّمَا الْمِسْكِيْنُ الَّذِیْ يَتَعَفَّفُ. (متفق علیه)

وفی روایة فی الصحیحین:- لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ الَّذِیْ يَطُوْفُ عَلَى النَّاسِ، تَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ. وَلٰكِنَّ الْمِسْكِيْنَ الَّذِیْ لَا يَجِدُ غِنًى يُغْنِيْهِ، وَلَا يُفْطَنُ بِهٖ؛ فَيُتَصَدَّقَ عَلَيْهِ، وَلَا يَقُوْمُ؛ فَيَسْأَلَ النَّاسَ.

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ آدمی مسکین نہیں ہے جس کو ایک یا دو کھجوریں یا ایک دو لقمے واپس کردیتے ہوں، بلکہ مسکین تو وہ ہے جو اپنے آپ کو سوال سے بچاتا ہے۔ صحیحین کی روایت میں ہے کہ وہ آدمی حقیقی مسکین نہیں ہے جو لوگوں کے دروازوں پر جاکر مانگتا ہے، اور ایک دو لقمے یا ایک دو کھجوریں اس کو وہاں سے واپس لوٹا دیتی ہیں، بلکہ حقیقی مسکین تو وہ ہے جس کے پاس اپنی ضرورت پوری کرنے کے واسطے کچھ بھی نہیں ہے، اور کسی کو اس کی حالت کا پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس کی مدد کی جائے اور نہ وہ لوگوں سے مانگنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔

افادات: –مزید تشریح فرماتے ہیں کہ جوآدمی لوگوں کے دروازوں پر جاتا ہے اور مانگتا ہے کہ بھوکا ہوں، کچھ دیدو، اوراس کوایک دو لقمے یاایک دو کھجوریں وہاں سے واپس لوٹادیتی ہیں؛ توایسادردر گھومنے والاحقیقی مسکین نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی مسکین اور محتاج تووہ ہےجس کے پاس کوئی چیزبھی موجودنہیں ہے،اس کے پاس اس دن کی روزی بھی نہیں ہےاور کمانے کی بھی کوئی شکل نہیں ہے،اوروہ اپنی حالت بھی ایسی نہیں بناتا کہ لوگ اس کے حالات سے واقف ہوکراس پر صدقہ کریں،اوروہ لوگوں سے سوال کرتا بھی نہیں پھرتا۔

مانگنا کب حرام اور کب جائز؟

دراصل شریعت نے سوال کرنے سے منع فرمایاہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جوآدمی لوگوں سے سوال کرتاہے، وہ قیامت کے روزایسی حالت میں آئے گا کہ اس کے چہرے پرخراشیں ہوں گی، گویااس نے سوال کرکے اپنے چہرے کوبھدّا بناڈالا۔بعض روایتوں میں ہے کہ قیامت کے روزایسی حالت میں آئے گا کہ اس کے چہرے پرگوشت نہیں ہوگا۔(شعب الایمان۔۳۵۱۰/۳۵۰۹)

البتہ علماء نے مسئلہ کےطور پرلکھاہے کہ ایک آدمی کے پاس دوسودرہم یعنی چھ سوبارہ اعشاریہ تین پانچ گرام چاندی یااس کی قیمت کازیور، یااتنے پیسے یااتنی مقدارکا تجارت کاسامان موجودہے؛ تویہ زکوٰۃ کانصاب ہے۔اوراگرکسی کے پاس تجارت کااتنا سامان تونہیں ہےلیکن ضرورت سے زائداتنی مقدارکی چیزیں گھرمیں موجودہیں تواگرچہ اس کےاوپرزکوٰۃ توواجب نہیں ہےلیکن قربانی اورصدقۂ فطرواجب ہے،اورایسے آدمی کے لئےسوال کرناحرام لکھاہے۔

بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ زکوٰۃ لینا جائز ہے اس لئے مانگتے ہیں، حالانکہ ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ زکوٰۃ لینا جائز ہونا الگ چیز ہے اور مانگنے کی اجازت ہونا الگ چیز ہے، جس کے پاس ضرورت مندوالا نصاب نہ ہو اور اس کو زکوٰۃ دیں گے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، لیکن اس کے لئے سوال کرنا جائز نہیں ہے۔ مانگنے کی اجازت تو صرف اسی صورت میں ہے جب اس کے پاس اپنے اور بال بچوں کے لئے اس دن کے دو وقت کے کھانے کا سامان موجود نہیں ہے؛ تو اس صورت میں بھی شریعت نے اتنا ہی مانگنے کی اجازت دی ہے جس سے اس دن کی ضرورت پوری ہو جائے۔

حقیقی مسکین

خیر! تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ مسکین نہیں ہے یعنی حقیقی اور کامل درجہ کا مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں کے دروازوں پر جا کر سوال کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ تو لوگوں سے کہہ سن کر اپنی ضرورت پوری کر رہا ہے، اگرچہ اس کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے لیکن جب لوگوں کے دروازے پر جا کر کہے گا کہ کچھ دے دو، میرے پاس رات کے کھانے کے لئے نہیں ہے اور لوگ دے دیں گے تو وہ بھوکا تو نہیں رہے گا، اس لئے کہ مانگنے والے کو آپ ایک روٹی دیدو تو وہ لے کر چلا جاتا ہے، یہی ایک دو لقمے اس کو آپ کے دروازے سے پھیر دیتے ہیں؛ لہٰذا یہ کامل درجہ کا مسکین نہیں ہے۔

بلکہ حقیقی معنیٰ میں مسکین تو وہ ہے کہ اس کے پاس اپنی ضرورت پوری کرنے کے واسطے کچھ بھی نہیں ہے، اپنے اور گھر والوں کے آج کے کھانے کا سامان بھی موجود نہیں ہے اور وہ اپنے آپ کو سوال سے بچا رہا ہے یعنی اپنی حالت دوسروں کے سامنے ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ فاقہ چل رہا ہے لیکن قریب والوں کو بھی پتہ نہیں چل رہا ہے کہ ان

کے گھر میں فاقہ ہے، اپنی صورت ایسی بنا کر رکھتا ہے کہ کسی کو پتہ ہی نہ چلے۔ سوال سے تو بچ ہی رہا ہے لیکن صورتِ سوال سے بھی بچ رہا ہے، کسی کو خبر ہی نہیں ہونے دیتا؛ اسی کو حضور ﷺ فرماتے ہیں کسی کو اس کی حالت کا پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ مدد کر دے۔

ایک تو یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی سے مانگتا نہیں ہے لیکن اس کی شکل وصورت سے پتہ چل جاتا ہے۔ یہاں تو اس کی حالت کا بھی پتہ نہیں چلایا جا سکتا کہ اس پر صدقہ کیا جائے، اور وہ خود بھی لوگوں کے سامنے سوال نہیں کرتا؛ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اب مالداروں کی ذمہ داری ہے کہ ایسے لوگوں کو تلاش کریں اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا اہتمام کریں۔

ضرورت مند کی تحقیق کس کے ذمہ؟

آج کل ہمارے سماج میں یہ بھی ایک خرابی آ گئی ہے۔ مانگنے والوں کا سامنے سے جا کر مانگنے کا جب مزاج بنتا گیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ جس کو شریعت نے مکلّف کیا تھا کہ تم پر زکوٰۃ واجب ہے، اور تم کو اپنی زکوٰۃ محتاجوں کے اندر تقسیم کرنی ہے؛ وہ بھی اپنی ذمہ داری سے غافل ہو گئے۔ اس لئے کہ شریعت نے یہ نہیں کہا کہ محتاج تمہارے دروازے پر آئیں تو تم ان کو زکوٰۃ دینا بلکہ ﴿آتُوا الزَّكوٰةَ﴾ کہا کہ تم اپنی زکوٰۃ دو۔

اور میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں یہ ہوتا تھا کہ باقاعدہ حکومت انتظام کرتی تھی کہ تمام حالات سے باخبر رہ کر ہر ایک کی ضرورت پوری کی جائے، جب بیت المال کا نظام نہیں رہا تو اب جو لوگ اپنی زکوٰۃ نکالتے ہیں ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے پاس پڑوس میں، اپنی برادری میں، اپنے محلے اور اپنی بستی میں ایسے لوگوں کا پتہ کریں جو واقعتاً ضرورت مند ہیں لیکن لوگوں کے سامنے اپنی ضرورت کا اظہار نہیں

کرتے، بلکہ اگر حالات کا پتہ چل جاوے تو وہ اس کو اپنے لئے عیب سمجھتے ہیں۔اب زکوٰۃ نکالنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ ایسے لوگوں کا پتہ نکال کر ان کی ضرورتیں پوری کریں۔ بلکہ شریعت نے تو یہاں تک بتلایا ہے کہ جن کو آپ دے رہے ہیں وہ ضرورت منداور حقدار ہیں ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، گھر میں فاقہ ہے، مقروض اور پریشان ہیں، لیکن اگر ان کو یہ کہا جائے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے تو وہ نہیں لیں گے، اگر چہ ان کے لئے زکوۃ لینا جائز ہے اوران کو شریعت نے اجازت بھی دی ہے۔اگر اس نے مانگا نہیں ہے، اور وہ حقدار ہے اور کوئی دے رہا ہے؛ تو لینے کی گنجائش ہے، اور لینے سے انکار کرنا بھی ایک مبالغہ ہی ہے۔ دیکھو! ان کو بھی مانگنے سے تو منع کیا، لیکن کوئی دینے کے لئے آوے تو لینے سے منع نہیں کیا۔

زکوٰۃ بنامِ ہدیہ

بہر حال! شریعت دینے والے کو یہ کہتی ہے کہ جب آپ نے تحقیق کر لی تو اب آپ کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ کہہ کر دیں کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت تو اُس وقت پیش آتی ہے جب معلوم نہ ہو کہ جس کو دیا جا رہا ہے وہ حقدار ہے یا نہیں؟ اگر معلوم نہیں ہے تو آپ یہ بول کر دیجیے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے۔اگر وہ حقدار نہیں ہے تو کہہ دے گا کہ مَیں حقدار نہیں ہوں، آپ کسی دوسرے کو دے دیں۔لیکن آپ کو جب معلوم ہے، آپ نے تحقیق کر لی ہے، اس کے حال سے بخوبی واقف ہیں کہ حقدار ہے پھر کیوں کہتے ہیں کہ یہ زکوٰۃ کے پیسے ہیں۔آپ کو دینے کا حکم ہے اور اس کو لینے کا حکم ہے۔آپ اس کو یوں کہیں گے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے تو وہ نہیں لے گا، حالانکہ پریشانی اُٹھا رہا ہے۔ بلکہ اگر آپ کو اندازہ ہو کہ اس کو بھنک بھی لگ جائے گی کہ یہ

زکوۃ کا ہے تو آپ یوں کہہ کر بھی دے سکتے ہیں کہ ہدیہ کی رقم ہے، جب آپ نے دل میں زکوٰۃ کی نیت کر لی تو آپ کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ غور کیجئے کہ ضرورت مند کی عزت کا بھی شریعت نے کتنا زیادہ خیال رکھا ہے۔

زکوٰۃ کا اعلیٰ مصرف

بہرحال! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حضور اکرم ﷺ فرما رہے ہیں کہ مسکین وہ نہیں ہے بلکہ مسکین تو یہ ہے۔ یہ ارشاد فرما کر نبی کریم ﷺ زکوۃ نکالنے والوں کو اس بات کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ آپ جب یہ کام انجام دے رہے ہیں تو اعلیٰ طریقے سے انجام دیجیے۔ جیسے آپ مکان بنانا چاہتے ہیں تو آپ کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ عمدہ سے عمدہ بنائیں۔ کھانا تیار کرنا چاہتے ہیں تو خواہش ہوتی ہے کہ بہترین قسم کا تیار کریں۔ تو جب آپ اپنا پیسہ خرچ کرنا چاہتے ہیں تو شریعت نے اس کا جو اعلیٰ سے اعلیٰ مصرف رکھا ہے اس کو کیوں تلاش نہیں کرتے؟ گھر میں کیوں بیٹھے رہتے ہو؟ یہ سوچنا کہ کوئی میرے پاس آئے گا تب مَیں دوں گا؛ یہ غلط نظریہ ہے۔ بلکہ ہمیں زیادہ حقداروں کو تلاش کرنا چاہیے ﴿**لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِیۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِی الۡاَرۡضِ یَحۡسَبُہُمُ الۡجَاہِلُ اَغۡنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ، تَعۡرِفُہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ لَا یَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا**(البقرۃ. ۲۷۳)﴾ وہ محتاج جو اللہ کے راستہ میں روک دیئے گئے جو زمین میں اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بھی جا نہیں سکتے۔ اور اصل بات یہی ہے کہ جو ناواقف آدمی ہے، جس کو اس کی حالت کی خبر نہیں ہے وہ اس کو دیکھ کر مالدار سمجھتا ہے، کیوں کہ وہ مانگتے بھی نہیں ہیں اور مانگنے والی صورت بھی نہیں بناتے، اور وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال بھی نہیں کرتے۔ قرآنِ پاک میں کہا گیا کہ ایسوں کو دو۔

یہ نکتہ ذہن میں رہے

اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ دوسروں کو دینے سے منع کیا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ ایسے لوگوں کو ڈھونڈ کر دیں گے تو حق ادا ہوا سمجھا جائے گا۔ اس لئے ہمارے سماج و معاشرہ میں یہ جو کوتاہی ہو رہی ہے اس کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ جو صدقات وخیرات نکالنے والے ہیں اور زکوۃ کی ادائیگی کا اہتمام کرنے والے ہیں ان کو یہ پوئنٹ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے، اور کچھ حصہ ایسا بھی رکھیں جو اپنے طور پر ایسے لوگوں کو تلاش کر کے ان کی خدمت میں بھیجیں۔ وہ نہ آتے ہوں تو ان کے گھر جا کر دیں۔ یہی تعلیم حضور ﷺ نے دی ہے۔

بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ جب محتاج ہیں تو کیوں گھر میں بیٹھے رہتے ہیں؟ باہر کیوں نہیں نکلتے؟ تو دیکھو! زکوٰۃ کی ادائیگی اللہ تعالیٰ نے آپ پر فرض کی ہے، کیا آپ نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں نہیں آتے؟ جس طرح نماز آپ پر فرض ہے، اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی بھی آپ پر فرض ہے، لہٰذا زکوۃ ادا کرنے کے لئے بھی آپ گھر سے نکلو، اور جو نہیں آتا اس کے گھر جا کر دے آؤ۔

ایک عارف کا عارفانہ قول

آج کل ہم لوگ اپنی زکوٰۃ ادا تو کرتے ہیں لیکن ان غریبوں اور مسکینوں کا جو احترام ہمارے دلوں میں ہونا چاہیے وہ نہیں ہے۔ حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالن پوری نور اللہ مرقدہٗ عجیب بات ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! آپ مسجد کا احترام اور تعظیم کیوں کرتے ہو؟ اسی لئے احترام کرتے ہو کہ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ایک فریضہ

ادا کیا جاتا ہے اور اسی لئے ہم اس کو اللہ کا گھر کہتے ہیں اور اس کا احترام و تعظیم کرتے ہیں، اس کے لئے اپنے سر بھی کٹوا دیتے ہیں؛ حالانکہ وہ تو اینٹ اور پتھر سے بنائی ہوئی ایک عمارت ہے۔ اسی طرح ایک غریب انسان بھی تو اللہ تعالیٰ کا ایک فریضہ یعنی زکوٰۃ ادا کرنے کا محل اور جگہ ہے وہاں بھی تو آپ اپنا ایک فریضہ ادا کر رہے ہیں اور پھر وہ کوئی اینٹ و پتھر نہیں بلکہ انسان ہے، تو جس طرح آپ مسجد کا احترام کرتے ہو؛ اسی طرح اس غریب کا بھی احترام کیجیے۔ دیکھئے! کیسی عجیب بات اور کیسا قابلِ توجہ نکتہ ارشاد فرمایا۔

احسان سائل کا ہے

اس باب کے عنوان میں یہ بھی ہے کہ غرباء کے ساتھ احسان کا معاملہ کیا جائے، اس کی غریبی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کا مقام و مرتبہ بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا نہیں ہے، اس کی تفصیل پہلے بتلا چکا ہوں کہ آپ کو اس کے مقام و مرتبہ کی تعیین کا کوئی حق نہیں ہے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے فضائلِ صدقات میں ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ ایک صاحب مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے ہر طواف میں یہ دعا مانگ رہے تھے کہ اے اللہ! مجھے لباس کی ضرورت ہے۔ ایک صاحب نے دیکھا تو انہوں نے ان کو لباس کے لئے رقم دیدی۔ پھر دوسری مرتبہ دیکھا تو وہ آدمی بہت عمدہ لباس پہن کر آئے ہوئے ہیں۔ دینے والے کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ آدمی ایسے ہی سوال کرتا ہے۔ ان کے خیال پر مطلع ہو کر انہوں نے اس کو اپنے ساتھ لیا اور کہا کہ نیچے دیکھو۔ اس نے جب نیچے دیکھا تو سارے مطاف میں ہیرے جواہرات بکھرے پڑے ہیں۔ پھر انہوں نے کہا کہ اللہ کے بندے! یہ سارے اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں لیکن ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کسی کو کچھ ثواب دیدے۔ اللہ کے ایسے بھی بندے

ہوتے ہیں، اس لئے کسی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے ارے بھائی! اس کا آپ پر احسان ہے کہ اس نے آپ کو خدمت کا موقعہ دیا۔ جس روز مال خرچ کرنے والوں میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے گا تو پھر دیکھنا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا کیا عطایا ہوتی ہیں، آج کل ان اعمال پر ہمیں جو کچھ ملنا چاہیے وہ نہیں ملتا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اس لئے اس بات کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔

بیوہ اور مسکین کی مدد کرنے والا

۲۶۵. وعنه عن النبی ﷺ قال: اَلسَّاعِیُ علیٰ الْأَرْمَلَةِ وَالْمِسْكِيْنِ كَالْمُجَاهِدِ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ. وَأَحْتَسِبُهُ قَالَ: وَكَالْقَائِمِ الَّذِيْ لَا يَفْتُرُ، وَكَالصَّائِمِ لَا يُفْطِرُ. (متفق علیه)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی بیوہ اور مسکین کے لئے کوشش کرتا ہے (یعنی ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگا ہوا ہے) اس کا حال ایسا ہے جیسا کہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والا۔ (راوی کہتے ہیں) میرا خیال یہ ہے کہ یہ بھی فرمایا: وہ آدمی ایسا ہے کہ رات بھر نماز پڑھتا ہے اور تھکتا نہیں، اور دن بھر روزہ رکھتا ہے کبھی افطار نہیں کرتا۔

افادات:- دیکھو یہ بھی کتنی بڑی فضیلت ہے! بیوہ کے معاملہ میں کوشش کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ بعض مرتبہ بیوہ مالی اعتبار سے تو مضبوط ہوتی ہے لیکن اس کی ضرورتیں پوری کرنے والا گھر میں کوئی موجود نہیں ہوتا، تو جو آدمی اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا وہ اس ثواب کا حقدار ہوگا۔ اور بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ بیوہ مالی اعتبار سے بھی کمزور ہوتی ہے تو اس صورت میں دونوں طرح کی باتیں پائی گئیں۔

حدیثِ پاک میں ﴿اَلسَّاعِیُ﴾ کا لفظ آیا ہے جس کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے

کہ ان کی ضرورتوں کے لئے کمانے اور دوسری حوائج پوری کرنے کا اہتمام کرنے والا۔ اس لئے کہ یہ کام ایسا ہے کہ اس پر مداومت اور ہمیشگی کوئی آسان چیز نہیں ہے، ایک دو دن، چار دن، اور ہفتہ تو سب کر ڈالتے ہیں، لیکن ﴿ اَلسَّاعِیُ ﴾ کا مطلب ہے برابر لگے رہنا؛ یہ ہر کس و نا کس کا کام نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جن کو توفیق دے، وہی ان چیزوں کا اہتمام کر سکتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے جن کو توفیق دی ہو، ان کو اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ادا کرتے رہنا چاہیے کہ ان کو یہ کام عطا فرمایا۔ یہ بہت اونچی چیز ہے۔ ان کاموں کی طرف حضور اکرم ﷺ نے متوجہ کیا ہے جو بہت اہم اور ضروری ہیں، اگر یہ چیزیں نہیں کی جائیں گی تو معاشرہ کا نظام قائم نہیں رہے گا

دس سال کے اعتکاف کا ثواب

آج کل ہم لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و قرب حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ سمجھ لیا ہے کہ مسجد میں آؤ اور نماز پڑھو، لیکن معاشرے کے دوسرے افعال جیسے حاجتمندوں کی حاجتوں کو پورا کرنے کی طرف توجہ دینا، کمزوروں کی مدد کرنا، یتیموں، بیواؤں کی خبر گیری کرنا وغیرہ؛ یہ کام بہت کم لوگ کرتے ہیں، حالانکہ یہ چیزیں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں، اس لئے کہ دیکھو! فرائض تو اپنی جگہ پر ہیں، لیکن ایک آدمی نفل نماز پڑھنے کے مقابلہ میں کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لئے جاتا ہے، تو کیا اس کا مقام کم ہے؟

آپ نے فضائلِ رمضان میں روایت پڑھی اور سنی ہوگی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ اعتکاف میں تھے، ایک آدمی اپنی ضرورت لے کر آئے۔ اور ضرورت کیا تھی؟ فلاں صاحب کے یہاں آپ میری سفارش کر دیں۔ جب وہ آدمی

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو آپ نے اعتکاف کی پرواہ نہیں کی اور ان کے ساتھ باہر نکل گئے۔حالانکہ اعتکاف کی کتنی بڑی فضیلت ہے کہ کوئی آدمی ایک دن کا اعتکاف کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اور جہنم کے درمیان میں تین خندقیں آڑ فرمادیتے ہیں جن کی مسافت زمین وآسمان کے درمیان کے فاصلہ کے برابر ہوتی ہے۔تو دریافت کرنے پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک مسلمان کی حاجت کو پورا کرنے کا ثواب دس سال کے اعتکاف کے برابر ہے۔(أخرجه الطبراني والبيهقي. حياة الصحابة، جلد ۲. جزء ۳/۲۹۳. الترغيب والترهيب ۲/۹۶)

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ یہ چیز ہمارے مزاجوں میں پیدا ہونی چاہیے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات کا اثر ہمارے معاشرے اور سماج کے ہر شخص کے دل ودماغ میں پیوست ہوجانا چاہیے۔ہمارے پرانے لوگوں کی باتیں جب ہم سنتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں حسنِ سلوک، خبرگیری اور رفاہی کاموں کا بڑا اہتمام ہوا کرتا تھا، اور اب ہمارا یہ دور آیا جس میں ان چیزوں کی طرف سے بہت زیادہ غفلت برتی جاتی ہے۔

رشتہ داریوں کا پہچاننا

اسلام نے تو یہاں تک تعلیم دی کہ آدمی کو اپنی رشتہ داریوں کو بھی پہچاننا چاہیے۔ آج کل کے نوجوانوں کا حال تو یہ ہے کہ وہ رشتہ داریوں کو بھی نہیں پہچانتے، قریب کی بات تو تھوڑی بہت جان لیتے ہیں کہ یہ چچا ہیں اور یہ ماموں ہیں اور اس کے بعد آگے کا کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا۔بعضوں کو جب سمجھاتے ہیں کہ یہ تمہارے پھوپھا ہوتے ہیں اور یہ ان کے بھائی کے لڑکے ہیں اور فلاں کی یہ رشتہ داری ہے تو ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا۔حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔

نسب اور عرب

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نسب کے بڑے ماہر تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موقعہ پر جب قبیلوں میں دعوتِ اسلام دینے کے لئے چلتے تھے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ساتھ ہوتے تھے، اور سارے قبیلوں کا تعارف کرواتے تھے (أخرجہ ابونعیم فی الدلائل۔ حیاۃ الصحابۃ ۱/ ۸۸) اور عرب میں تو یہ حال تھا کہ وہ اپنے ہی نہیں بلکہ اپنے گھوڑوں کے نسب بھی یاد رکھتے تھے کہ میرا گھوڑا کہاں کس گھوڑے سے پیدا ہوا ہے، اور آج ہمارے یہاں اپنے نسبوں کا کسی کو علم نہیں ہوتا۔ آج کل کے بچوں کو پوچھئے تو بعضوں کو تو دادا کا بھی نام یاد نہیں ہوتا۔ مگر پردادا کا نام تو یاد ہی نہیں ہوتا۔ یہ واقعہ ہے، آپ بھی تجربہ کر لیجیے۔ پرانے لوگوں میں یہ ہوتا تھا کہ یہ فلاں صاحب ہمارے دادا کی اولاد میں سے ہیں، پردادا کے بھائی کی اولاد میں سے ہیں، اور آج کل بھائی کی اولاد کی طرف دھیان نہیں ہوتا تو دادا اور پردادا کے بھائی کی اولاد کی طرف کون دھیان دے گا، حالانکہ معاشرہ کا قیام اسی کے اوپر موقوف ہے۔

ہر ایک کی اپنی اپنی ذمہ داری ہے

ہمارے یہاں جو برائیاں پھیل رہی ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان چیزوں کا خیال نہیں رکھا جاتا اور ضرورت مند کی ضرورت پوری نہیں کی جاتی، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ پریشانی میں زندگیاں گذارتے ہیں، اگر ہر ضرورت مند کی ضرورت اس کی اپنی جگہ اور اپنے گھر بیٹھے پوری ہو جایا کرے؛ تو کوئی بھی پریشان حال نہ رہے۔ بھائی! آپ زیادہ نہ دیجیے، مہینہ میں سو روپے ہی دیجیے، آپ جیسے دس آدمی سو سو روپے دیں گے تو اس کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ جیسے دادا کے بھائی کی اولاد ہے یا پردادا کے بھائی کی اولاد ہے اور اس میں سب تو غریب نہیں ہوتے، دو چار ہی غریب ہوتے ہیں، تو اب دادا اور پردادا کی اولاد

میں جتنے حیثیت والے ہیں ان میں سے سب اگر سوسو روپے دیں گے، تو دو چار افراد کی ضرورتیں تو پوری ہو ہی جائیں گی، اور آج کل سو روپے کی حیثیت ہی کیا ہے؟ آپ یہاں سے اسٹیشن جائیں اور واپس آئیں تو رکشہ والا ہی پچاس ساٹھ روپے لے لیتا ہے۔

اور پھر سب لوگ اس کو اپنی ذمہ داری سمجھیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ فلاں نہیں دیتا تو مَیں کیوں دوں؟ یا فلاں صاحب خیال رکھ رہے ہیں، تو مَیں کیوں دوں؟ ارے بھائی! وہ کتنا خیال کرتے ہیں وہ تو پہلے معلوم کرو۔ بعض مرتبہ یہ بھی ایک مصیبت ہو جاتی ہے کہ کوئی کسی کا خیال رکھتا ہے تو اس کی وجہ سے دوسرے لوگ بے فکر ہو جاتے ہیں، حالانکہ وہ اتنا نہیں دیتا جس سے اس کی ساری ضرورتیں پوری ہو جائیں، اور وہ بے چارہ پریشان ہی رہتا ہے۔ اس لئے بھائی! اگر وہ خیال رکھتا ہے تو وہ اپنا کام کر رہا ہے، اور اپنا فریضہ ادا کر رہا ہے، اب ہمیں اپنا فریضہ ادا کرنا چاہیے؛ سیدھی سادی بات تو یہ ہے۔ اس لئے مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ چیزیں بڑی اہم ہیں، اس کی طرف توجہ ہونی چاہیے۔

بدترین دعوتِ ولیمہ

۲۶۶. وعنه عن النبی ﷺ قال: شَرُّ الطَّعَامِ طَعَامُ الْوَلِيْمَةِ يُمْنَعُهَا مَنْ يَأْتِيْهَا، وَيُدْعٰى اِلَيْهَا مَنْ يَأْبَاهَا، وَمَنْ لَمْ يُجِبِ الدَّعْوَةَ؛ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ. (رواه مسلم)

وفی روایة فی الصحیحین: -عن أبی هريرة من قوله: بِئْسَ الطَّعَامُ طَعَامُ الْوَلِيْمَةِ يُدْعٰى اِلَيْهَا الْأَغْنِيَآءُ، وَيُتْرَكُ الْفُقَرَآءُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ بدترین کھانا اس دعوتِ ولیمہ کا کھانا ہے کہ جو آ سکتا ہے اس کو تو بلایا نہیں جاتا، اور جو انکار کرتا ہے اس کو دعوت دی جاتی ہے۔ اور جو آدمی دعوت قبول نہ کرے، اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔ صحیحین کی روایت میں ہے: بدترین کھانا اس دعوتِ ولیمہ کا کھانا ہے، جس میں مالداروں کو دعوت دی جاتی ہے اور فقیروں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

افادات:- ظاہر ہے کہ فقیر کو دعوت دی جائے گی تو وہ ضرور آئے گا، اور مالدار کو دعوت دو، اور پھر اس کو یاددہانی کراؤ، اور چار مرتبہ وعدہ لو؛ تب بھی بھول جاتا ہے، اور دوسرے روز پوچھو تو کہتا ہے کہ بھول گیا تھا یعنی اس دعوت کا بھی عجیب دستور ہے کہ جو نہیں آرہا ہے اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور جو بے چارہ قدردان ہے اس کا خیال نہیں رکھا جاتا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ آدمی جب دعوت کرے تو اس کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ جس طرح مالداروں کو بلاکر کھلانے کا اہتمام کرتا ہے اسی طرح فقیروں اور غریبوں کو بلانے کا بھی اہتمام کرے۔

صرف مالداروں کو دعوت نہ دیں

اب جب غریبوں کی بات آئی ہے تو مَیں آپ کو بتلادوں کہ ہم لوگ کس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ دیکھو! ہمارے یہاں دعوتیں مختلف حیثیتوں سے دی جاتی ہیں، مثلاً آپ کے یہاں شادی ہے تو رشتہ داری کے لحاظ سے دعوت دیں گے، کاروباری لائن کے لوگ اس لائن کے لوگوں کو دعوت دیتے ہیں، کہیں برادری کا سوچ کر دعوت دی جاتی ہے، کوئی آدمی محلّہ کا ہے اس لئے اس کو دعوت دی جاتی ہے۔ لہٰذا جب آپ رشتہ داری کے لحاظ سے دعوت دینے کا سوچ رہے ہیں تو رشتہ داروں میں سے فقط مالداروں کا انتخاب نہ کیجیے، آپ کے رشتہ داروں میں غریب بھی ہیں، اور شریعت یوں کہتی ہے کہ آپ رشتہ داروں میں جہاں مالداروں کو بلائیں وہیں آپ ڈھونڈیں گے تو غریب بھی مل جائیں گے، لہٰذا آپ ان غریبوں کو مت چھوڑیے۔

اگر آپ کاروباری تعلق کی وجہ سے دعوت دے رہے ہیں تو اس لائن میں بھی

دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ یا کسی ادارے میں کام کر رہے ہیں تو آپ کے ساتھ اس ادارے میں کام کرنے والے بھی دونوں قسم کے لوگ ہوں گے۔ آپ جس حیثیت سے بھی دعوت دے رہے ہو، ہر ایک میں صرف بڑے لوگوں کو اور مالداروں کو مدعو مت کیجیے، بلکہ کمزور اور غریب لوگوں کو بھی یاد رکھیے۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ کسی کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو تب بھی اسے ضرور بلاؤ۔ ہاں! اس حدیث پر عمل کرنے کی نیت سے کسی غریب کو غریب ہونے کی حیثیت سے بغیر کسی تعلق کے بھی دعوت دیں؛ تو بہت ہی اچھا ہے۔

ہمارے یہاں عام طور پر یہ مزاج بنتا چلا جا رہا ہے کہ جب دعوت کا موقعہ آتا ہے تو غریب کو بھول جاتے ہیں۔ محلّہ والوں کو دعوت دیتے ہیں تو کیا محلے میں صرف مالدار لوگ ہی رہتے ہیں؛ کوئی غریب نہیں رہتا؟ اگر محلے والا ہونے کی حیثیت سے دعوت دے رہے ہیں تو جو حیثیت محلے کے مالدار کو حاصل ہے؛ وہی حیثیت محلے کے غریب کو بھی حاصل ہے؛ تو پھر غریب کو بھی دعوت دیجیے۔

کھانا بھی خراب، خانہ بھی خراب

اور جو لوگ صرف ایک ہی طبقہ والوں کو یعنی مالدار طبقہ کو دعوت دیتے ہیں تو مَیں یہ کہا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو نقد سزا دلواتے ہیں کہ جس کو بلایا تھا ایک تو وہ آیا نہیں، جس کی وجہ سے دل دکھا۔ تو یوں کہنا چاہیے کہ کھانا بھی خراب ہوا اور ساتھ ہی خانہ بھی خراب ہوا۔ گویا یہ نقد ([illegible]) سزا ملی۔ اگر وہ صحیح طرح سے دعوت کا اہتمام کرتا تو کھانا بھی صحیح مصرف میں جاتا اور جب بات نکلی ہے تو ایک اور بات یاد آ گئی۔ پرانے زمانہ میں یہ ہوتا تھا کہ مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لئے کھانا کھلاتے تھے، تو

خاص طور پر فقیروں کو کھلایا جاتا تھا، لیکن اب وہ جگہ بھی مالداروں نے لے لی ہے، گویا مالدار لوگ اس میں بھی غریبوں کا حق مارنے لگے ہیں

بہر حال! خلاصہ یہ ہے کہ غریبوں کے معاملہ میں آج کل جو ہماری طرف سے کوتاہی برتی جاتی ہے، یہ روایت ہمیں اس کوتاہی کو دور کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔

مُلاطَفَةُ الْیَتِیْمِ وَالْبَنَاتِ

یتیم اور بچیوں کے ساتھ مہربانی

مجلس (۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ باب کا عنوان قائم کیا گیا تھا یتیموں، لڑکیوں اور تمام کمزوروں، مسکینوں اور شکستہ دلوں کے ساتھ نرمی کرنا اور ان کے ساتھ احسان وشفقت سے پیش آنا۔ یتیموں اور کمزوروں پر شفقت کرنے کا بیان گذر چکا۔ آج جو روایت پیش کرتے ہیں اس میں لڑکیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید آئی ہے۔

بچیوں کے بارے میں اہلِ عرب کا طرزِ عمل

٢٦٧. وعن أنس رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا، جَآءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا وَهُوَ كَهَاتَيْنِ، وَضَمَّ أَصَابِعَهُ. جَارِيَتَيْنِ اَیْ بِنْتَيْنِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی دو بچیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ سنِ بلوغ کو پہنچ جائیں تو میں اور وہ قیامت کے دن اس طرح آئیں گے۔ اور آپ ﷺ نے اپنی دونوں انگلیوں کو ملا دیا۔

پہلے بتلا چکا ہوں کہ نبی کریم ﷺ کی جب بعثت ہوئی اس وقت لڑکیوں کے ساتھ جو نازیبا اور ناروا سلوک کیا جاتا تھا وہ ناقابلِ بیان ہے۔ قرآنِ پاک میں اس کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس کی طرف شروع باب میں آیات کے ذیل میں اشارہ کر چکا ہوں۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَاِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ، أَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ أَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ﴾ ان میں سے کسی کو جب بچی کی پیدائش کی خوش خبری سنائی جاتی ہے تو یہ سن کر ان کا چہرہ کالا پڑ جاتا ہے اور وہ اپنے دم کو اندر ہی اندر گھٹتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ان کو جو خبر دی گئی اس کی برائی کی وجہ سے وہ اپنی قوم سے منہ چھپائے پھرتا ہے۔

گویااس کولوگوں کے سامنے آتے ہوئے شرم آتی ہے کہ کوئی کہے گا کہ اس کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی اور پھر سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ اس بچی کو اپنے گھر میں رہنے دے یا مٹی میں دبادے اور زندہ دفن کردے۔

''مِنْ اِمْلاقٍ'' اور ''خَشْیَةَ اِمْلاقٍ'' کا فرق

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیرِ مظہری میں اس موقعہ پر علامہ بغویؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ عرب کے قبائل میں سے مضر، خزاعہ اور بنوتمیم کے یہاں دستور یہ تھا کہ ان کے یہاں جب لڑکیاں پیدا ہوتی تھیں تو وہ لوگ بچیوں کو زندہ درگور کردیا کرتے تھے۔ اور وہ ایسا دو وجہ سے کرتے تھے، ایک تو فقر وفاقہ کا ڈر لگتا تھا کہ ہم ان کو کیا کھلائیں گے، گویا ان کو بچیوں کے بارے میں ڈر لگا رہتا تھا کہ ان کی وجہ سے ہم فقر وفاقہ میں مبتلا ہوجائیں گے۔ اور بعضوں کو یہ خیال ہوتا تھا کہ ہمارے کھانے کا تو انتظام ہے نہیں، ان کے لئے کہاں سے انتظام کریں گے۔ (تفسیر البغوی، ۵/ ۲۵۔ تفسیر الخازن، ۴/ ۹۶)

چنانچہ قرآنِ پاک میں ایک جگہ فرمایا ہے ﴿لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ، نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ﴾ تم اپنی اولاد کو فقر وفاقہ کے ڈر سے قتل مت کرو کہ اولاد کی کثرت کی وجہ سے ہم غریب ہوجائیں گے اور ان پر خرچ کرنے کے نتیجہ میں ہماری دولت گھٹ جائے گی۔ گویا اتنا تو ان کے پاس موجود ہے کہ وہ اپنی ضرورتیں پوری کر رہے ہیں لیکن ان کو ڈر یہ ہے کہ آنے والی اولاد کو کہاں سے کھلائیں گے، گویا فقر وفاقہ موجود نہیں ہے لیکن آئندہ کا ڈر ہے۔

قرآنِ پاک میں دوسری جگہ ہے ﴿لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ، نَحْنُ

نَــرُزُقُــكُــمُ وَ اِيَّــاهُــمُ﴾ اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کی وجہ سے قتل مت کرو، ہم تم کو بھی روزی دیتے ہیں اوران کو بھی۔ دونوں جگہ دوالگ الگ جملے استعمال کئے گئے ہیں۔

علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک جگہ ہے﴿لا تَــقُتُــلُوٓا أَوُلادَكُمُ مِنُ اِمُلاقٍ﴾ تم اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کی وجہ سے قتل مت کرو۔ گویا فقر و فاقہ پہلے سے موجود ہے، اوراب آنے والی اولاد کے بارے میں ڈر ہورہا ہے کہ ہمارے خود ہی لالے پڑرہے ہیں اور فقر و فاقہ ہم پر سوار ہے، ہم کو ہی دووقت کا کھانا میسر نہیں آرہا ہے تو ان کو کہاں سے کھلائیں گے، تو اس کے جواب میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فقر و فاقہ کی وجہ سے اپنی اولاد کو قتل مت کرو﴿نَحُنُ نَرُزُقُكُمُ وَ اِيَّاهُمُ﴾ جو عربی جاننے والے ہیں وہ غور کریں کہ باری تعالیٰ پہلے فرمارہے ہیں کہ ہم تم کو بھی روزی دیتے ہیں اوران کو بھی دیں گے۔ یہاں (كُــمُ) یعنی''تم کو'' پہلے بیان کیا گیا ہے، اس لئے کہ فقر و فاقہ موجود ہونے کی وجہ سے وہ یوں سوچتے تھے کہ ہمارا ٹھکانہ نہیں ہے، تو ان کو کہاں سے کھلائیں گے۔ چونکہ پہلی فکر اپنی تھی تو باری تعالیٰ نے دلاسہ دلایا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، تم کو بھی روزی ہم ہی دیں گے اوران کو بھی ہم ہی دیں گے۔

جب کہ بعض لوگ وہ ہوتے تھے کہ ان کے پاس اپنا کھانا موجود ہے لیکن وہ یوں سوچتے تھے کہ جب اولاد ہوگی تو ان کو کہاں سے کھلائیں گے، ان کے بارے میں کہا گیا﴿لاتَقُتُلُوٓا أَوُلادَكُمُ خَشُيَةَ اِمُلاقٍ﴾ گویا فقر و فاقہ اس وقت نہیں ہے، لیکن اولاد زیادہ ہونے کی وجہ سے آئندہ اس کا خطرہ ہے، تو ان کے جواب میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے ڈر سے قتل مت کرو تم یوں سوچتے ہو کہ اولاد آئے گی تو خرچ بڑھ جائے گا؛ پھر ہم ان کو کہاں سے کھلائیں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں

﴿نَحۡنُ نَرۡزُقُهُمۡ وَاِیَّاکُمۡ﴾ ہم ان کو بھی روزی دیں گے اور تم کو بھی دیں گے۔ اس آیت میں پہلے بچوں کا تذکرہ کیا گیا، کیونکہ فکر بچوں کا تھا، اپنا کام تو چل رہا تھا۔ پھر آگے فرمایا ﴿اِنَّ قَتۡلَهُمۡ کَانَ خِطۡأً کَبِیۡرًا﴾ اولاد کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ تو بچیوں کو قتل کرنے کی ایک وجہ قرآن نے یہ بیان فرمائی ہے۔

بچیوں کو قتل کرنے کا جاہلانہ نظریہ

اور احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ بچیوں کو قتل کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ غیر کفو میں رشتہ دینا پڑے گا اور وہ لوگ اپنے آپ کو خاندان کے اعتبار سے بڑا سمجھتے تھے۔ قبیلۂ مضر جس سے قریش کا خاندان بھی تھا۔ خزاعہ اور بنو تمیم وغیرہ دوسرے قبائل کے مقابلہ میں اپنے آپ کو اونچا سمجھتے تھے، اس لئے وہ یہ خیال کرتے تھے کہ اپنے گھر لڑکی پیدا ہوئی، جب یہ بڑی ہوگی اور اس قابل ہوگی کہ اس کا نکاح کیا جائے تو پھر اس کو کسی ایسے خاندان میں بیاہ کر دینا پڑے گا جو ہمارے درجہ اور ہماری کیٹیگر ی (category) کا نہیں ہوگا، یہ ہماری بے عزتی ہے۔ تو ایسے خاندان میں لڑکی کو بیاہ کر نہ دینا پڑے اس لئے وہ لڑکی کو قتل کر دیا کرتے تھے، گویا اس کو اپنے لئے عیب سمجھتے تھے کہ کوئی لڑکا ہمارا داماد بنے گا اور لڑکی والا رشتہ پیدا ہوگا۔

رائج الوقت گالیاں

ہمارے سماج میں بعض گالیاں جو رائج ہیں دراصل وہ بھی اسی لڑکی والے رشتہ کی وجہ سے ہیں، مثلاً بیوی کے بھائی کو ''سالا'' کہتے ہیں اور گالی کے طور پر بھی بولتے ہیں۔ بیوی کے باپ کو سسر کہتے ہیں اور گالی کے طور پر ''سسرا'' بول دیتے ہیں، یہ سب رشتے

نکاح کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ تو نکاح کے نتیجہ میں لڑکی کے رشتہ داروں کو جو لقب ملا اس کو اُس زمانہ میں گالی سمجھا جاتا تھا، اور آج کل بھی اسی زمانۂ جاہلیت کی یادگار کے طور پر گالی کی شکل میں جاری ہے۔ حالانکہ اسلام تو زمانۂ جاہلیت کی یادگار کو ختم کرتا ہے۔ جن تین آدمیوں پر اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ غصہ ہوگا ان میں حضور اکرم ﷺ نے اس کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ جو اسلام میں آنے کے بعد جاہلیت کے طریقہ کو پسند کرے۔ (بخاری شریف/ حدیث نمبر ۶۸۸۲)

اور اُس زمانہ میں یہ دستور بھی تھا کہ جب کسی کا نکاح ہوتا تو اس وقت اس کو جو دعا دی جاتی تھی اس کے بارے میں حدیث کی کتابوں میں لکھا ہے کہ یوں کہا جاتا تھا ﴿بِالرِّفَآءِ وَالْبَنِیْنَ﴾ (روضۃ المحدثین، حدیث نمبر ۱۷۹۹۔ بحوالہ فتح الباری، ۲۲۲/۹) یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں خوش حالی عطا فرمائے اور لڑکے دے، یعنی لڑکوں کی دعا دی جاتی تھی۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے نکاح کے موقعہ پر جو دعا سکھلائی اس میں مطلق برکت کا تذکرہ ہے ﴿بَارَکَ اللّٰہُ لَکُمَا وَبَارَکَ عَلَیْکُمَا وَجَمَعَ بَیْنَکُمَا فِیْ خَیْرٍ﴾ اللہ تعالیٰ تمہارے اندر برکت دے یعنی اولاد پیدا ہو، اور تمہارے اوپر بھی برکت نازل فرمائے اور تمہارا جمع ہونا بہتر ہو (روضۃ المحدثین، حدیث نمبر ۱۷۹۸۔ بحوالہ فتح الباری، ۲۲۲/۹) حدیث میں یہ دعا بھی آئی ہے ﴿عَلَی الْأُلْفَةِ وَالْخَیْرِ وَالْبَرَکَةِ وَالطَّیْرِ الْمَیْمُوْنِ وَالسَّعَةِ فِی الرِّزْقِ﴾ خیر و برکت اور محبت کے ساتھ تمہارا جوڑا قائم رہے، اور تم اچھے نصیبے اور قسمت والے بنو، اور تمہاری روزی میں بھی اللہ تعالیٰ خوب کشادگی دے (روضۃ المحدثین، حدیث نمبر ۱۷۹۷۔ بحوالہ فتح الباری، ۲۲۲/۹) تو زمانۂ جاہلیت میں جو لفظ ﴿اَلْبَنِیْنَ﴾ بولا جاتا تھا اس کو اسلام نے ختم کیا۔

غیر اختیاری چیز میں عورت ہی قصوروار کیوں؟

اولاد میں لڑکوں اور لڑکیوں کا پیدا ہونا آدمی کے اختیار کی چیز نہیں ہے۔ اگر کسی پر کوئی عیب لگایا جائے تو وہ چیز ایسی ہونی چاہیے جس میں اس کے اختیار کو دخل بھی ہو، لیکن جس میں اس کے اختیار کو دخل ہی نہ ہو؛ اس میں بھلا کیا عیب لگانا۔ قرآنِ پاک میں خود باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿يَهَبُ لِمَن يَشَآءُ اِنَاثًاوَّيَهَبُ لِمَن يَشَآءُ الذُّكُورَ أَوۡيُزَوِّجُهُمۡ ذُكۡرَانًا وَّاِنَاثًا وَّيَجۡعَلُ مَن يَشَآءُ عَقِيمًا﴾ اللہ تعالیٰ جسکو چاہتا ہے صرف لڑکیاں دیتا ہے اور جسکو چاہتا ہے اکیلے لڑکے ہی دیتا ہے یا پھر دونوں دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ جسکو چاہتا ہے بغیر اولاد کے رکھتا ہے۔

دیکھو! جہاں اللہ تعالیٰ نے اس عطیہ کا تذکرہ کیا وہاں پہلا نام لڑکی کا لیا۔ اس آیت کے پیشِ نظر بعض علماء نے فرمایا ہے کہ جس عورت کو پہلے بچی پیدا ہو؛ وہ بابرکت ہے۔ اور ہمارے سماج میں اُلٹا سمجھا جاتا ہے، کسی کو پہلے لڑکی پیدا ہوئی تو بس ختم ہو گیا، ساس تو معلوم نہیں کیا کیا کہہ ڈالتی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے لڑکی کا تذکرہ کیا کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اکیلی لڑکیاں دیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے اکیلے لڑکے دیتا ہے، یا دونوں دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بغیر اولاد کے رکھتا ہے۔ گویا جو چار صورتیں ہو سکتی ہیں ان چاروں میں اول نمبر پر لڑکی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ خیر! کسی کے یہاں لڑکی کا پیدا ہونا اس کے اختیار کی چیز تو تھی نہیں، پھر اس بے چاری کو کیوں قصوروار گردانا جائے۔

ہم تو زمین ہیں جو بیج ڈالا جاتا ہے اسی کو اُگا دیتے ہیں

کسی شاعر نے اشعار کے اندر ایک قصہ لکھا ہے، وہ اشعار بڑے اچھے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ ایک آدمی کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تو شوہر نے اس پر ناراض ہو کر بیوی کو

طلاق تو نہیں دی لیکن اس کو معلق چھوڑ رکھا تھا اور علیحدگی اختیار کر کے دوسری بیوی کر لی، اور اس کو دوسرے گھر میں رکھا، ایک مرتبہ اس لڑکی کا باپ وہاں سے گذر رہا تھا تو ماں بچی کو دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر کھیل لگا رہی تھی اور جھولا جھلاتے ہوئے یہ اشعار پڑھ رہی تھی:-

مَا لِأَبِیْ حَمْزَةَ لا یَأْتِیْنَا ❁ یَظَلُّ فِی الْبَیْتِ الَّذِیْ یَلِیْنَا

غَضْبَانَ أَن لَّا نَلِدَ الْبَنِیْنَا ❁ تَاللّٰہِ مَا ذٰلِکَ فِیْ أَیْدِیْنَا

وَاِنَّمَا نَأْخُذُ مَا أُعْطِیْنَا ❁ وَنَحْنُ کَالْأَرْضِ لِزَارِعِیْنَا

نُنْبِتُ مَا قَدْ زَرَعُوْهُ فِیْنَا

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابوحمزہ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ہمارے پڑوس میں رہتے ہیں لیکن ہمارے پاس نہیں آتے؟ وہ اس بات پر ناراض ہیں کہ ہم نے لڑکا کیوں نہیں جنا، حالانکہ اللہ کی قسم! یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ ہم تو اسی چیز کو اپنے اندر محفوظ کرتے ہیں جو ہمیں دی جاتی ہے، ہماری مثال تو زمین جیسی ہے، ہمارے اندر جو بیج ڈالا جاتا ہے اسی کو ہم اُگا دیتے ہیں، اب اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ (البیان والتبیین للجاحظ۔ ۱/ ۱۰۸)

غور کیجئے کہ اس نے بات تو بالکل درست کہی، اور یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ مردوں نے عورتوں پر اپنا تسلط جمانے کے لئے لڑکی پیدا ہونے کی صورت میں بھی ماں کو ہی قصوروار ٹھہرایا، حالانکہ بیج تو خود مردوں کا ڈالا ہوا ہے اور عورتیں تو زمین ہیں، اگر قصوروار مانا جائے تو دونوں کو ماننا چاہیے، صرف عورت کو ہی قصوروار کیوں ٹھہرایا جائے؟ یہ تو صریح ناانصافی ہے بلکہ ناانصافی کی بھی انتہاء ہے۔

بچیوں کے ساتھ کیسا ناروا سلوک

بہرحال! اُس زمانہ میں یہ قبائل لڑکیوں کے وجود کو اپنے لئے عیب سمجھتے تھے،

اس لئے ان کو اپنے یہاں زندہ رہنے ہی نہیں دیتے تھے،اور اگر کسی لڑکی کو زندہ رکھنا مقصود بھی ہوتا تو یہ کرتے کہ اس کو بکری کے بالوں کا لباس پہنا کر اونٹ اور بکریاں چرانے کے لئے متعین کر دیتے اور کہہ دیتے کہ تجھے وہیں رہنا ہے،اونٹ اور بکریاں چراتے رہنا، ہمارے یہاں مت آنا۔اور اگر اس کو باقی رکھنا منظور نہ ہوتا تو اسے پانچ سال تک رہنے دیتے تھے، جب چھ سال کی عمر ہوتی تو باپ بچی کی ماں سے کہتا کہ اس کو بناؤ سنگھار کر کے تیار کر دینا اور پہلے سے صحراء میں جا کر ایک گڑھا کھود کر آتا اور پھر اپنے ساتھ بچی کو لے جاتا، وہاں پہنچ کر بچی سے کہتا کہ اس گڑھے کے اندر دیکھو، اس بیچاری معصوم بچی کو تو کچھ پتہ بھی نہ ہوتا، جب وہ اندر جھانکتی تو باپ پیچھے سے دھکا دے کر اندر گرا دیتا اور اس پر مٹی ڈال دیتا۔

بچی کو زندہ درگور کرنے کا دردانگیز واقعہ

ایک مرتبہ ایک قبیلہ کے سردار نے آکر نبی کریم ﷺ کے سامنے اپنا قصہ سنایا کہ میری بیوی حمل سے تھی، اتفاق کی بات کہ جب بچہ جننے کا وقت آیا تو مَیں سفر میں تھا، اس دوران بیوی کو ولادت ہوئی اور لڑکی پیدا ہوئی، ماں نے سوچا کہ باپ اس کو مار ڈالے گا، اس لئے اپنی لڑکی کو اپنی بہن کے یہاں بھیج دیا۔ جب مَیں سفر سے واپس آیا اور مَیں نے پوچھا تو بیوی نے بتلایا کہ ایک مردہ بچہ پیدا ہوا تھا۔ مجھے یہ نہیں بتایا کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ جب مَیں کہیں باہر جاتا تو ماں اس بچی کو اپنی بہن کے پاس سے منگواتی، اس سے محبت اور پیار کرتی، اسی طرح وہ بچی کچھ بڑی ہوئی۔ ایک مرتبہ میں کہیں باہر گیا ہوا تھا، اس نے بچی کو اپنے پاس بلوا رکھا تھا اور وہ واپس جائے اس سے

پہلے ہی مَیں پہنچ گیا،مَیں نے اس بچی کو دیکھا تو مجھے وہ اچھی لگی اور مَیں نے بھی اس بچی کے ساتھ پیار ومحبت کا معاملہ کیا۔مَیں نے پوچھا کہ یہ کس کی بچی ہے؟مَیں نے اس کے ساتھ محبت و پیار کا جو معاملہ کیا تھا اس کی وجہ سے اس کی ماں یہ سمجھی کہ شاید خون کی محبت اثر کر رہی ہے، اس لئے اب حقیقت کو ظاہر کرنے میں کوئی خطرے کی بات نہیں ہے،اس لئے اس نے بتلا دیا کہ یہ تو آپ کی ہی بچی ہے،اور پھر پورا قصہ سنایا۔خیر!اس وقت مَیں نے کچھ نہیں کہا اور اس کو اپنے پاس رہنے کی اجازت دیدی۔

پھر اس نے اپنا قصہ بتاتے ہوئے کہا کہ میرے یہاں وہ بڑی ہوئی،اور مجھ سے بہت پیار کرتی تھی، میں بھی اس سے بڑی محبت کرتا تھا،لیکن ایک روز مجھ پر جاہلانہ جنون سوار ہوا کہ میرے گھر لڑکی ہے۔بس!مَیں اس کو اپنے ساتھ لے کر جنگل گیا اور پہلے سے کوئی تیاری بھی نہیں کی تھی۔وہاں جا کر میں نے اس کے لئے ایک گڑھا کھودنا شروع کیا،جب میں گڑھا کھود رہا تھا اس کی وجہ سے میرے کپڑوں کے اوپر مٹی گر رہی تھی تو وہ بچی ابا ابا کہہ کر مٹی صاف کرتی تھی،لیکن میرے اوپر تو جاہلیت والا جنون ایسا سوار تھا کہ اس کے پیار بھرے جملوں کا بھی مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔جب گڑھا تیار ہوا تو میں نے اس بچی کو اٹھا کر اس گڑھے میں ڈال دیا۔ وہ اندر سے چلا رہی تھی کہ ابا جی! آپ یہ کیا کر رہے ہو؟لیکن مَیں نے اس پر مٹی ڈالنا شروع کی، وہ ابا ابا پکارتی رہی یہاں تک کہ اس کی آواز آنا بند ہوگئی۔جب اس نے یہ قصہ سنایا تو نبی کریم ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔بعض روایتوں میں ہے کہ آپ کی ڈاڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہوگئی اور آپ نے فرمایا﴿وَاللہِ!اِنَّ هٰذِهٖ لَقَسْوَةٌ ، مَنْ لَا يَرْحَمْ لَا يُرْحَمْ﴾ اللہ کی قسم! یہ تو بڑی سخت دلی کی بات ہے، جو آدمی کسی کے ساتھ رحم نہیں کرتا اس کے

ساتھ بھی رحم کا معاملہ نہیں کیا جاتا۔ (التذكرة الحمدونية. ۱/ ۱۹۶)

قیامت کے دن خود بچی سے پوچھا جائے گا

اور جیسا کہ مَیں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے معاشرہ میں آج بھی اس کے اثرات موجود ہیں، حالانکہ حضورِ اکرم ﷺ نے اس کے دور کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات میں اس بات کی طرف بہت زیادہ متوجہ فرمایا ہے، اس لئے کہ ہر نبی اپنی قوم کے اندر جو برائیاں اور بیماریاں ہوتی ہیں ان کو دور کرنے کی اور ان کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے، اسی لئے بچیوں کو زندہ درگور کرنے اور ان کے ساتھ ناانصافی کے معاملہ کو ختم کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے بہت تاکیدی ارشادات فرمائے ہیں۔

اور قرآنِ پاک میں بھی اس سلسلہ میں باقاعدہ تاکید کی گئی ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے ﴿وَاِذَاالْمَوْءُوْدَةُسُئِلَتْ﴾ عدالت کا طریق کار تو یہ ہوتا ہے کہ مجرم سے اس کے جرم کے متعلق پوچھا جاتا ہے کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ لیکن یہاں اس کا جرم اتنا زیادہ شنیع تھا کہ خود اس کو خطاب کے قابل ہی نہیں سمجھا گیا بلکہ جس بچی کو زندہ درگور کیا گیا تھا قیامت کے روز اسی سے پوچھا جائے گا ﴿بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾ کس جرم کی پاداش میں تجھے قتل کیا گیا تھا۔ دیکھئے! قرآنِ کریم نے کیسا انداز اختیار کیا ہے۔ اس بیچاری معصوم سے پوچھا جائے گا کہ تیرا کیا قصور تھا کہ تجھے زندہ درگور کر دیا گیا؟ ظاہر ہے کہ اس بیچاری کا کوئی قصور ہی نہیں ہے۔ قرآنِ پاک میں اس پر خاص تاکید فرمائی ہے اور اس بیماری کو دور کرنے پر خاص زور دیا گیا ہے اور احادیث میں بھی خاص تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ اسی میں سے ایک حدیث یہ بھی ہے۔

دو بچیوں کی پرورش کرنے والوں کے لئے بشارت

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی دو بچیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ سنِ بلوغ کو پہنچ جائیں تو میں اور وہ قیامت کے دن اس طرح آئیں گے۔اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں انگلیوں کو ملا دیا۔ چونکہ وہ لوگ تو بچیوں کو بالغ ہونے ہی نہیں دیتے تھے،اس سے پہلے ہی معاملہ ختم ہوجاتا تھا اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ بشارت ارشاد فرماتے ہیں۔اس مجمع میں جن لوگوں کی دو یا زیادہ بچیاں ہیں اوران کی پرورش کررہے ہیں اور وہ بچیاں بلوغ کو پہنچ چکی ہیں ان سب کے لئے یہ بشارت ہے۔اور غور کیجئے کہ کتنی بڑی بشارت ہے!اور یہ بشارت اُس زمانہ کے لئے خاص نہیں تھی، بلکہ قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت ارشاد فرمائی ہے۔

جس ماحول میں لڑکیوں کے ساتھ زیادتیاں کی جاتی تھیں اس ماحول میں اس بشارت کا آپ اندازہ لگائیے۔ جو بچیوں کے ساتھ اس طرح کا اچھا سلوک کرے گا وہ قیامت کے روز میرے ساتھ اس طرح ہوگا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت ہو اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود اتنی بڑی بشارت سنا دیں؛ تو پھر ظاہر ہے کہ کون ہے جو اس کے لئے آمادہ نہ ہوگا۔

جہنم سے آڑ

۲۶۸. عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: دَخَلَتْ عَلَيَّ امْرَأَةٌ وَمَعَهَا ابْنَتَانِ لَهَا تَسْأَلُ، فَلَمْ تَجِدْ عِنْدِي تَمْرَةً غَيْرَ وَاحِدَةٍ، فَأَعْطَيْتُهَا إِيَّاهَا، فَقَسَمَتْهَا بَيْنَ ابْنَتَيْهَا، وَلَمْ تَأْكُلْ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ میرے پاس ایک ضرورت مند عورت آئی اور اس کے ساتھ اس کی دو بچیاں تھیں اور اس کے پاس کھانے کے واسطے کچھ نہیں تھا، اس نے میرے پاس آ کر سوال کیا، اس وقت

مِنهَا، ثُمَّ قَامَتْ فَخَرَجَتْ،فَدَخَلَ النَّبِیُّ ﷺ عَلَیْنَا، فَأَخْبَرْتُهُ فَقَالَ:مَنِ ابْتُلِیَ مِنْ هٰذِہِ الْبَنَاتِ بِشَیْءٍ،فَأَحْسَنَ اِلَیْهِنَّ، کُنَّ لَهُ سِتْرًامِنَ النَّارِ.

میرے پاس بھی سوائے ایک کھجور کے کچھ نہیں تھا، اس لئے مَیں نے وہ ایک کھجور اس عورت کو دے دی۔اس عورت نے اس کھجور کے دو حصے کئے،اور دونوں کوایک ایک حصہ دیا،اورخود نے کچھ نہیں کھایا۔ پھر وہ اُٹھی اور چلی گئی۔جب نبی کریم ﷺ مکان پرتشریف لائے تومَیں نے آپ کو یہ قصہ سنایا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جوآدمی ان لڑکیوں میں سے کسی کے ذریعہ سے آزمایا گیا، پھراس نے ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا؛تو وہ اس کے لئے جہنم کی آگ سے آڑ بن جائے گی۔

افادات:- یہاں لفظ ”شَیْءٌ“ آیا ہے،جس میں ایک لڑکی بھی آ گئی،یعنی کسی کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی لڑکی دی ہو،یاایک سے زیادہ دی ہو،اوروہ اس کے ذریعہ آزمایا گیا۔ اس لئے کہ کسی کے یہاں لڑکیاں آتی ہیں تو عام طور پر وہ اس کواپنے لئے بوجھ سمجھتا ہے،تو اللہ تعالیٰ کا کسی کے یہاں لڑکیاں دینااس کے لئے ایک طرح کی آزمائش ہے۔

ماں باپ کے لئے تمام اولاد برابر ہے

دیکھو! پہلے بتلا چکا ہوں کہ لڑکیاں ہوں یالڑکے؛اولاد ہونے کی حیثیت سے ماں باپ کے لئے دونوں کا رشتہ برابر ہے،ان میں سے کسی کے ساتھ امتیازی سلوک اور ترجیحی معاملہ کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی،سب کے ساتھ یکساں معاملہ کرنا چاہیے۔ ہمارے سماج میں صرف مرد ہی نہیں بلکہ مائیں بھی یہ زیادتیاں کرتی ہیں کہ لڑکوں کوصبح ناشتہ میں بالائی اورانڈے دیں گی،اور بیچاری لڑکی کو نہ بالائی ملتی ہے اور نہ انڈا۔اسی طرح کوئی مٹھائی یاکوئی اچھی چیز گھر میں آئی جوتھوڑی سی ہے تو ماں ہی یہ زیادتی کرتی ہے کہ لڑکے کو دیتی ہے اورلڑکی کومحروم رکھتی ہے؛ حالانکہ یہ سب ”أَحْسَنَ

اِلَیۡهِنَّ" کے خلاف ہے۔ جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ سب سوچ لیں کہ مَیں جو بات کہہ رہا ہوں وہ غلط ہے؟ اگر غلط ہو تو مجھے بتلائیے۔ ہمارے سماج میں یہ سب ہو رہا ہے۔

اور مَیں تو سمجھتا ہوں کہ باپ تو لڑکیوں کے ساتھ برابری کا معاملہ کرے، لیکن یہ ظلم وزیادتیاں ماں ہی کی طرف سے ہو رہی ہیں، حالانکہ ماں سے شفیق اور مہربان اور کون ہوسکتا ہے۔ لیکن لڑکی خود یہ معاملہ ماں ہی کی طرف سے دیکھ رہی ہے کہ ماں مجھے تو بالائی نہیں دیتی اور بھائیوں کو دیتی ہے، اور ناشتہ میں مجھے انڈا نہیں دیتی اور بھائیوں کو مل رہا ہے۔ اس لئے باپ کو چاہیے کہ جب ایسی بات سامنے آئے تو بیوی کو سمجھائے کہ یہ معاملہ ٹھیک نہیں ہے۔ اور پھر جب اس کے ساتھ بھلائی کا معاملہ نہیں ہوتا اور وہ لڑکی آپ کے گھر میں بیٹی ہونے کی حیثیت سے رہ کر یہ سب دیکھ رہی ہے کہ اس کے ساتھ یہ سب ناانصافی روا رکھ رہے ہیں، اور یہ بے چاری بچی اس گھر میں اسی طرح پرورش پا رہی ہے اور اس کی نشو نما اسی طرح ہو رہی ہے تو ابتداء ہی سے اس کی ذہنیت یہ بن رہی ہے کہ ماں کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ لہٰذا وہ بھی بڑی ہو کر اپنی بچیوں کے ساتھ ایسا ہی کرتی ہے۔ یہ دراصل غلط تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے جس کا وبال ماں باپ ہی پر ہوگا۔

یہ دو پیمانے کیسے ہیں؟

بلکہ آپ غور کیجئے کہ بیٹی کے ساتھ جب آپ ہی ایسی ناانصافی کریں گے اور پھر جب آپ اسی بیٹی کا نکاح کر کے کسی کی بیوی بنا کر رخصت کریں گے اور اُس گھر میں جا کر بھی اس کے ساتھ امتیازی معاملہ اور ترجیحی سلوک کیا جائے گا تو پھر آپ کو ہی اشکال ہوگا اور اس وقت آپ یوں کہیں گے کہ ہماری بیٹی کے ساتھ یہ معاملہ کیوں ہو رہا ہے۔ بھائی! جب آپ کے گھر میں اس کے ساتھ ایسا معاملہ ہو رہا تھا تو آپ نے کبھی اس

کو روکنے کی کوشش نہیں کی، اور جب ایسا معاملہ دوسرے کے گھر میں جا کر اس کے ساتھ ہو رہا ہے تو آپ سماج اور محلّہ میں، مسجد میں اور اپنی مجلسوں میں اس کا چرچا کر رہے ہیں کہ میری بیٹی کے ساتھ یہ معاملہ کیا جا رہا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ بھائی! یہ دو پیمانے کیسے ہیں؟ جب وہ آپ کے گھر میں تھی اس وقت تو یہ معصوم اور چھوٹی سی بچی تھی اور اس پر شریعت کی تکلیف بھی نہیں تھی اس وقت سے اس کے ساتھ یہ معاملہ ہو رہا تھا، جب آپ کی طرف سے کیا گیا تو درست تھا اور ایسا معاملہ جب سسرال والوں کی طرف سے ہو رہا ہے تو آپ اس کو برا کہہ رہے ہیں؟

حالانکہ اس حدیثِ پاک میں تو حضور ﷺ نے ماں باپ کو خاص تاکید فرمائی ہے کہ جو لڑکیوں کے ذریعہ آزمایا گیا اور اس نے ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک اور احسان کا معاملہ کیا؛ تو یہی لڑکیاں اور بیٹیاں اس کے لئے جہنم سے آڑ بن جائیں گی اور ماں باپ کو جہنم کی آگ بھی نہیں لگنے دیں گی۔ ہمارے گھروں میں بہت آسان علاج موجود ہے، اس کے لئے کہیں باہر نکلنے کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اس کے لئے کچھ کمانے کی بھی ضرورت نہیں ہے، بس! ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیجیے، ترجیحی اور امتیازی سلوک مت برتیے، جیسے ہی وہ بچیاں بالغ ہو جائیں گی؛ تو خود بخود ہی یہ فضیلت آپ کو حاصل ہو جائے گی۔

ایک کھجور جنت میں جانے کا ذریعہ بنی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری روایت لاتے ہیں جس میں اوپر جیسا ہی قصہ ہے بس ذرا سا فرق ہے۔

۲۶۹۔عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: جآءَ تنِیْ مِسْکِیْنَةٌ تَحمِلُ اِبْنَتَیْنِ لَهَا، فَأَطْعَمْتُهَا ثَلاثَ تَمَرَاتٍ، فَأَعْطَتْ کُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُمَا تَمْرَةً وَ رَفَعَتْ اِلیٰ فِیْهَا تَمْرَةً لِتَأْکُلَهَا فَاسْتَطْعَمَتْهَا اِبْنَتَاهَا، فَشَقَّتِ التَّمْرَةَ الَّتِیْ کَانَتْ تُرِیْدُ أَنْ تَأْکُلَهَا بَیْنَهُمَا، فَأَعْجَبَنِیْ شَأْنُهَا، فَذَکَرْتُ الَّذِیْ صَنَعَتْ لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ، فقال: اِنَّ اللهَ قَدْ أَوْجَبَ لَهَا بِهَا الْجَنَّةَ، أَوْ أَعْتَقَهَا بِهَا مِنَ النَّارِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مسکین اور غریب عورت اپنی دو بچیوں کو لے کر آئی، مَیں نے اس کو تین کھجوریں دیں، اس نے ایک ایک کھجور ایک ایک لڑکی کو دی اور تیسری کھجور کھانے کے لئے اپنے منہ کی طرف اُٹھائی، اسی دوران ان دونوں بچیوں نے اپنی اپنی کھجوریں نمٹا کر اپنے ہاتھ بڑھائے۔ تو اس عورت نے اپنی اس کھجور کے بھی دو ٹکڑے کئے اور آدھی آدھی ان دونوں بچیوں کو دیدی اور خود کچھ نہیں کھایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس کے اس معاملہ پر مجھے بڑا تعجب ہوا، مَیں نے نبی کریم ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا اس پر حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس کے اس حسنِ سلوک کی وجہ سے اس کے لئے جنت واجب کردی۔

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جہنم سے آزاد کردیا۔ دیکھو! ایک کھجور جنت میں لیجانے کا ذریعہ بنی۔

اس کا مددگار ''اللہ'' ہے

۲۷۰۔عن أبی شریح خویلد بن عمرو الخُزَاعِیّ رضی اللہ عنہ قال: قال النبی ﷺ: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ أُحَرِّجُ حَقَّ الضَّعِیْفَیْنِ؛ اَلْیَتِیْمِ وَالْمَرْأَةِ.

حضرت ابو شریح خویلد بن عمرو خزاعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے دعا کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اے اللہ! دو کمزوروں کے حق کے ضائع کرنے کے بارے میں مَیں اعلان کرتا ہوں؛ یتیم اور عورت۔

افادات:-عورت میں تمام نوع نسواں آگئی، بیٹی بھی اور بیوی بھی۔ چونکہ

عام طور پر جب ان کے حقوق ضائع کئے جاتے ہیں تو ان بے چاریوں میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی قوت کے ذریعہ اپنا حق وصول کرسکیں۔اس روایت سے معلوم ہوا کہ کسی بھی کمزور کا حق ضائع کرنا بڑا خطرناک گناہ ہے، اور اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی غیرت جوش میں آجاتی ہے اور ایسے آدمی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص عتاب وعقاب کا معاملہ کیا جاتا ہے۔اس لئے یہ سمجھ کر کسی کا حق ضائع کرنے کی کبھی جرأت نہیں کرنی چاہیے کہ اس کا تو کوئی بھی مددگار نہیں ہے، اس لئے کہ جس کا کوئی مددگار نہیں ہوتا اس کا مددگار اللہ تعالیٰ خود ہو جاتا ہے۔

تمہارے کمزوروں کی وجہ سے مدد کی جاتی ہے

۱۷۲. وعن مصعب بن سعد بن أبي وقاص رضی اللہ عنہ قال: رَأىٰ سَعْدٌ أَنَّ لَهُ فَضْلاً عَلىٰ مَنْ دُوْنَهُ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: هَلْ تُنْصَرُوْنَ وَتُرْزَقُوْنَ اِلَّا بِضُعَفَآءِ كُمْ.

حضرت مصعب بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ کوئی ایسی بات کہی جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کمزوروں کے مقابلہ میں ان کو فضیلت حاصل ہے، اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے کمزوروں کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی ہے اور تمہیں روزی دی جاتی ہے۔

افادات:- عام طور پر جب کسی کمزور کا معاملہ آتا ہے تو قوی لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ہم اس کی مدد کررہے ہیں اور ہم اس کی حفاظت کررہے ہیں، ہم کما کر اس کو کھلا رہے ہیں لیکن نبی کریم ﷺ بالکل الگ ہی تعلیم ارشاد فرما رہے ہیں، اور نبی کریم ﷺ کی تعلیم جو نظر آرہا ہے اس کے خلاف ہے۔دیکھنے والے یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس کے گھر کے اندر بوڑھی ماں ہے، کمزور دادی ہے جو چلنے پھرنے سے عاجز ہے، بچہ ہے جو پیدائشی طور پر معذور ہے۔تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کی کفالت کرتا ہے، یہ محنت

مزدوری کر کے کما تا اوران کو کھلا تا ہے، یہ ان کو روزی پہنچا تا ہے، یہ ان کی مدد کرتا ہے، لیکن نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ تمہاری مدد ان کی وجہ سے کی جاتی ہے، تم کو ان کی وجہ سے روزی ملتی ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ تم ان کو روزی پہنچا رہے ہو۔

معاشرے کی دُکھتی رَگ

آج کل عام طور پر ہمارے دل و دماغ میں یہی بیٹھا ہوا ہے اور گھروں میں لڑائیاں بھی یہیں سے آتی ہے۔ دیکھو! ترتیب تو یہی ہے کہ شروع میں کاروبار تو باپ ہی جما تا ہے، اور جب بیٹوں کا نمبر آتا ہے، تو پہلے بڑا بیٹا آ کر باپ کا ساتھ دیتا ہے، ابھی چھوٹوں کا وقت نہیں آیا ہے، ان میں سے کوئی اسکول جا رہا ہے، کوئی مدرسہ پڑھ رہا ہے، کوئی اور بھی چھوٹا ہے جب سے باپ ریٹائرڈ (Retired) ہوا ہے، ان کے کاروبار کو بڑے بیٹے نے سنبھال رکھا ہے، اس طرح کاروبار بڑے بیٹے کے ہاتھ میں آتا ہے۔

پھر اس کی شادی بھی ہوگئی اور بڑی بہو گھر میں آئی، اور عام طور پر ماں باپ کو چھوٹی اولاد کے ساتھ محبت زیادہ ہی ہوتی ہے، اور ابھی انہوں نے دیکھا بھی کیا ہے؟ بڑے کو محبت سے محروم نہیں رکھا جاتا، بلکہ اس کو تو بہت محبت مل چکی ہے، اور یہ فطری چیز ہے، اور عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ بڑا جو ہوتا ہے وہ ماں باپ کا پہلا ہی بچہ ہوتا ہے، اس لئے ماں باپ کو اس کے ساتھ محبت آخر تک برابر رہتی ہے۔

خیر! بات یہ چل رہی تھی کہ باپ کے بعد کاروبار بڑا ہی سنبھال لیتا ہے، جب بہو آتی ہے تو وہ یوں کہتی ہے کہ تم محنت مزدوری کرتے ہو اور تھکتے ہو، اور اس کو تو دیکھو، وہ تو برابر اسکول و مدرسہ بھی نہیں جاتا، اِدھر اُدھر تفریح کرتا پھرتا رہتا ہے، اس کو ابا کھلاتے

پلاتے رہتے ہیں، اور تم صبح سے دکان پر جاتے ہو اور دو پہر کا کھانا بھی پتہ نہیں آپ برابر کھاتے ہو یا نہیں، پھر رات کو دیر سے آتے ہو۔ ان سب باتوں کا خلاصہ یہی ہوتا ہے کہ ہم ہی الگ ہو جائیں، اس لئے کہ وہ یوں سمجھتی ہے کہ میرا شوہر ہی کما کر سب کو کھلا رہا ہے۔

کھڑے کھڑے اور پڑے پڑے

اور اس کی باتوں کی تاثیر بھی بڑی عجیب وغریب ہوتی ہے۔ ہمارے حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ ساس اور بہو میں جھگڑا ہوا۔ ساس نے کہا کہ اچھا! میرے بیٹے کو آنے دو، پھر مَیں تجھے بتلاتی ہوں، مَیں اس کو کہوں گی تو وہ تیری برابر خبر لے گا۔ بہو نے کہا کہ مَیں بھی ان سے کہوں گی، اور وہ میری سنیں گے، تمہاری نہیں سنیں گے ساس کہتی ہے کہ میرا بیٹا ہے، اس لئے میری سنے گا۔ تو بہو کہنے لگی کہ وہ تو میری ہی سنیں گے، تمہاری نہیں سنیں گے۔ پوچھا کہ ایسا کیوں؟ تو بہو کہنے لگی کہ تم کھڑے کھڑے کہو گی، اور میں پڑے پڑے کہوں گی۔ اور بات یہی ہے کہ اس کی باتوں میں ایسی تاثیر رہتی ہے کہ مرد اس کی باتوں کے چکر میں آجاتا ہے۔

تو پھنستا ہی چلا جاتا ہے

خیر! پھر بھائیوں سے علیٰحدگی ہو جاتی ہے، ماں باپ کے ساتھ بھی تعلقات کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ پھر آگے یہ ہوتا ہے کہ آج تک تو کاروبار بہت اچھا چل رہا تھا، اب گردش میں آتا ہے، پھر وہ یوں سمجھتا ہے کہ ہاں! ماں باپ سے الگ ہوئے اس لئے انہوں ہی نے کچھ کرایا ہے۔ ارے کم عقل! یہ مصیبت تو تیری بد عملی اور قطع رحمی کی وجہ سے آئی ہے، اب بھول سدھارنے کے بدلے تو شیطان کے چکر میں اور اندر گھستا چلا

جا رہا ہے۔آدمی جب دلدل میں پھنستا ہے تو پھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ دراصل کاروبار میں یہ گردش تو ماں باپ کا حق ادا نہ کرنے کی وجہ سے آئی تھی،اور آپ کو جو کچھ مل رہا تھا وہ ان کی وجہ سے مل رہا تھا،لیکن ان سے تو آپ الگ ہو گئے ہیں،لہٰذا اب ان کا حصہ تمہارے پاس کہاں سے آئے گا۔

پھر جب کاروبار بھی چکر میں آیا تو اب شیطان دوسری سُجھاتا ہے اور عاملوں کے پاس لے جاتا ہے، پھر لوگ عملیات والوں کے پاس جاتے ہیں۔آج کل کے عاملوں سے اللہ بہت زیادہ بچائے،وہ ایسے خطرناک ہوتے ہیں کہ اللہ کی پناہ۔وہ لوگ تو ایسے ایسے وسوسے ڈالتے ہیں کہ شیطان تو کیا ڈالتا؟ جب وہاں پہنچا تو عامل صاحب کہتے ہیں کہ کسی نے کچھ کردیا ہے، پہلے سے اس کے دل میں ایسا خیال تو تھا ہی،اب اس عامل نے اس کو اور زیادہ پختہ کردیا۔حالانکہ گھر والوں سے جب لڑائی ہوتی ہے تو چند دنوں میں ناچاقی ختم ہو جاتی ہے،لیکن یہ عامل لوگ زیادہ پانی پہنچاتے ہیں،اور اکثر یہی کہتے ہیں کہ اندر کا ہی کوئی ہے جس نے کچھ کیا ہے،اور یہ سمجھتا ہے کہ بھائی کے ساتھ لڑائی ہوئی ہے،لہٰذا اسی نے کچھ کرایا ہوگا۔اب بھائی بھائی میں اور زیادہ دوری ہوگئی، اور یہی جھگڑے بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچتے ہیں کہ پھر دونوں زندگی بھر کبھی نہیں ملتے۔ بس! یہ ساری خرابی کی جڑ ہے۔

نوجوانوں کو ایک اہم نصیحت

دیکھو! نوجوان طبقہ سے میں خاص طور پر یہ کہوں گا کہ بیوی کی ضرورتیں ضرور پوری کرو،اور اس سے کہہ دو کہ تجھے جو چاہیے مجھ سے کہنا،زیورات بھی بنا دوں گا اور

تیری ساری باتیں سنوں گا، لیکن اس موضوع پر کبھی بھی زبان مت کھولیو، اس کو پہلے ہی روز حدود بتلا دینے چاہئیں کہ تیری حد یہاں تک ہے، اس سے آگے تجھے نہیں بڑھنا ہے، اس کو صاف صاف بتا دینا چاہیے؛ پھر ان شاء اللہ جھگڑوں کی نوبت نہیں آئے گی۔

بہر حال! میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ تمہارے کمزوروں کی وجہ سے تمہاری مدد ہوتی ہے اور تمہیں روزی بھی انہیں کی وجہ سے دی جاتی ہے، اسی لئے یوں نہ سمجھو کہ ہم انہیں کھلا رہے ہیں، بلکہ ان کا احسان سمجھو کہ وہ ہمیں کھلا رہے ہیں۔

ماں باپ کو اپنے ساتھ لو

انگلینڈ میں قانون ہے کہ وہاں بچوں اور بوڑھوں کو بھی وظیفہ ملتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہاں یہ ہوتا ہے کہ کبھی میاں بیوی میں نااتفاقی ہوتی ہے تو بچوں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے ان کے درمیان جھگڑا ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ بچے جس کے پاس رہیں گے ان کا وظیفہ بھی اسی کے پاس جائے گا۔ اور بچے تو کیا کھائیں گے ؛ سارا وہی کھائے گا۔

اور مَیں کہتا ہوں کہ اگر کبھی کسی مصلحت کی وجہ سے بھائیوں کا چولہا الگ کرنے کی نوبت آوے تو بھائیوں کو اس لئے لڑنا چاہیے کہ ماں باپ کو مَیں اپنے حصہ میں لوں گا۔ آج کل تو معاملہ یہ ہوگیا ہے کہ ان کو ساتھ لینے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا۔ حالانکہ میں تو کہتا ہوں کہ ان کو اپنے ساتھ لو؛ تاکہ ان کا حصہ بھی تمہارے پلڑے میں آوے۔ ناسمجھی اور بے خبری میں لوگ ایسا کر رہے ہیں، لیکن نبی کریم ﷺ کے خبر دینے کے بعد تو ہمیں اس کی حرص ہونی چاہیے۔

مجھے کمزوروں میں ڈھونڈو

۲۷۲. عَنْ أَبِي الدَّرْدَآءِ عُوَيْمِر رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: اِبْغُوْنِي الضُّعَفَآءَ؛ فَاِنَّمَا تُنْصَرُوْنَ وَتُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَآءِكُمْ. (رواه أبو داود باسناد جيد)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ میرے لئے کمزوروں کو تلاش کر کے لاؤ، اس لئے کہ تمہارے کمزوروں کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی ہے اور تمہیں روزی دی جاتی ہے۔

افادات: –"میرے لئے کمزوروں کو تلاش کر کے لاؤ" گویا مَیں ان کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ مجھے کمزوروں میں ڈھونڈو، مَیں وہیں ملوں گا۔ اسی لئے بعض روایتوں میں آتا ہے کہ جہاد اور جنگ کے موقعوں پر نبی کریم ﷺ کمزوروں کو اپنے پاس رکھتے تھے؛ تاکہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کی جائے، اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں اپنی بات اور دعا پیش کرنے کے لئے ان کو ہی واسطہ بنایا جائے۔ لہٰذا ان سب باتوں کا اہتمام ہونا چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

اَلْوَصِیَّةُ بِالنِّسَآءِ

عورتوں کے بارے میں تاکید

مجلس (۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أما بعد:– أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم.

وَعَاشِرُوْھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ. (النسآء. ۱۹)

وقال تعالیٰ:—وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْا أَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِیْلُوْا کُلَّ الْمَیْلِ فَتَذَرُوْھَا کَالْمُعَلَّقَةِ ، وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوْراً رَّحِیْماً . (النسآء. ۱۲۹)

حقوق دوطرح کے ہیں

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے ”اَلْوَصِیَّةُ بِالنِّسَآءِ“ عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کی تاکید۔ آگے کچھ ابواب تک علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ حقوق کو بیان فرمارہے ہیں۔

حقوق دوطرح کے ہیں، ایک تو اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں اور دوسرے حقوق بندوں کے ہیں، یہاں حقوق العباد کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں حقوق العباد کی طرف جیسی توجہ دینی چاہیے وہ نہیں دی جاتی ،ہم لوگوں نے عملی طور پر دین کو عبادتوں ہی کے اندر محدود کر رکھا ہے،نماز روزہ، حج زکوٰۃ، تلاوت وتسبیحات اور جن چیزوں کا تعلق عبادات سے ہے ان کو ادا کرنے کے بعد ہم مطمئن ہوجاتے ہیں کہ ہم نے سوفیصد دین پر عمل کرلیا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عبادات دین کا

بہت اہم شعبہ ہے،عبادات ہی ہیں جن کے ذریعہ سے بندہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ اپنا رشتہ مضبوط کرسکتا ہے،اوراسی کے ذریعہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت آدمی کے دل میں جاگزیں ہوتی ہےاورآگے چل کریہی چیز پوری شریعت پرعمل کرنے کے لئے معین ومددگارثابت ہوتی ہے،اسی لئے نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعداسلام کے ابتدائی زمانہ میں زیادہ تر اسی کی طرف متوجہ کیا گیا۔اورحقوق العباد؛معاشرت اورمعاملات کے احکام کوشروع میں نازل نہیں کیا گیا،اس لئے کہ جب تک بندوں کاتعلق اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مضبوط نہ ہو،اوراللہ تعالیٰ کی محبت بندوں کے دل میں اتنی زیادہ نہ آجائے کہ اس کے لئے ہرچیزکوقربان کرنے کے لئے تیارہوجائیں؛تب تک ان کواحکام کامکلّف بنانا اور پابندکرناقرینِ مصلحت نہیں ہے،اس لئے ابتداء میں عقائدکے درست کرنے اوراس کے بعدعبادات کی ادائیگی پرزیادہ زوردیا گیابعدمیں جب ان چیزوں کے اندرپختگی آگئی اورلوگ دعوت قبول کرچکے،اورایمان ویقین کی مضبوطی کے نتیجہ میں اس قابل ہوچکے کہ اب ان کوحقوق العبادمعاشرت اورمعاملات کے متعلق احکام دیئے جائیں اوران کی ادائیگی کے لئے جس ایثاروقربانی کی ضرورت ہےاس کے لئے تیاروآمادہ ہوگئے؛تب ان کووہ احکام بھی دیئے گئے۔

جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوجاتا ہے

بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ مَیں جب مکہ معظّمہ میں تھی اس وقت چھوٹی بچی تھی اورکھیلا کرتی تھی،اس وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں ﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُأَدْهٰى وَأَمَرُّ﴾ قیامت ان کے وعدے کاوقت ہےاور یہ بڑی مصیبت اور کڑوی چیز ہے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہافرماتی ہیں کہ شروع میں یہی چیزیں(جن میں عقائد،

آخرت اور ایمان کے متعلق زیادہ تر احکامات بتلائے گئے ہیں اور قرآن کی وہ سورتیں جو اواخر کہلاتی ہیں) نازل ہوتی تھیں، اگر شروع ہی سے وہ چیزیں نازل ہوتیں جن میں کہہ دیا جاتا کہ شراب مت پیو اور زنا مت کرو تو وہ لوگ کہہ دیتے کہ ہم سے تو یہ سب نہیں ہو سکے گا، اس لئے پہلے وہ چیزیں نازل کی گئیں جن کے ذریعہ عقائد، ایمان ویقین کو مضبوط کیا گیا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو مضبوط کیا گیا اور اس کے بعد سارے احکام نازل ہوئے۔ (بخاری شریف۔۴۹۹۳)

بہر حال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ عبادات کا شعبہ اس معنٰی کر بڑا اہم اور ضروری ہے کہ اس کے ذریعہ ہی آدمی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا رشتہ اور تعلق مضبوط کر سکتا ہے، اور اسی تعلق کی استواری ومضبوطی کے نتیجہ میں آدمی اس قابل بنتا ہے کہ شریعت میں دیئے گئے دوسرے تمام احکام کی ادائیگی کے لئے جس ایثار وقربانی کی ضرورت پڑتی ہے اس کے لئے وہ تیار ہو جاتا ہے، بندوں کے حقوق آسانی سے ادا کرتا ہے، اپنی خواہشات اور من پسند چیزوں کو قربان کر دیتا ہے، معاملات کی صفائی بھی پیدا ہوتی ہے۔ عبادات کے ذریعہ سے جب کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے دل میں پیدا کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط کر لیتا ہے تو پھر یہ سارے مراحل اس کے لئے بہت آسان ہو جاتے ہیں۔

کیوں ہمیں عبادات کا ثمرہ حاصل نہ ہوا؟

مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ عبادات کا شعبہ بڑا بنیادی اور اہم شعبہ ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن ہم لوگوں نے اپنی ناواقفیت اور شریعت سے جہالت اور اپنے محدود علم کی وجہ سے یوں سمجھ لیا کہ سارا دین صرف عبادات ہی کے اندر منحصر ہے، ایک آدمی نمازوں کا اہتمام کرتا ہے، رمضان المبارک کے روزے بڑے اچھے طریقہ سے

رکھتا ہے، زکوٰۃ بھی ادا کرلیتا ہے، حج بھی کرتا ہے، تلاوت تسبیحات اورنوافل کا اہتمام بھی کرتا ہے؛ تو وہ یوں سمجھتا ہے کہ میں نے سو فیصد (١٠٠%) دین پر عمل کرلیا، اس کے بعد جب ماں باپ کے، بیوی بچوں کے، بھائی بہنوں کے اور پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی کا وقت آتا ہے، یا خرید وفروخت اور تجارت کے معاملات کا جب وقت آتا ہے اور اس میں اپنے دل کی چاہت کو قربان کرنے کی ضرورت پڑتی ہے؛ تو وہ اس کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ اس لئے حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے محدود علم کے نتیجہ میں ہم پر اثر یہ ہوا کہ ہم نے دین کو عبادتوں تک محدود کردیا اور ان عبادتوں کا جو اصل ثمرہ اور فائدہ ہونا چاہیے تھا؛ وہ ہمیں نہیں ہوا، یعنی عبادات کا شعبہ اس لئے رکھا گیا تھا کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ بندوں کا تعلق اتنا مضبوط ہوجاتا کہ اس کے نتیجہ میں دوسرے سارے احکام کی ادائیگی کے ہم قابل بن جاتے، لیکن ہم قابل نہیں بنے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری عبادتیں بھی ناقص ہیں اور اس شعبہ سے ہمیں جو فائدہ حاصل کرنا چاہیے تھا، وہ بھی ہم نے حاصل نہیں کیا۔

کہیں ہمارا ایمان تو ختم نہیں ہو رہا؟

علماء نے دین کو پانچ حصوں پر تقسیم کیا ہے، پہلا حصہ عقائد کا ہے۔ آج کل ایک مصیبت یہ ہوگئی کہ عقائد کی درستگی کا بھی اہتمام نہیں رہا، بہت سے ایسے لوگ ہیں جو نماز، روزہ زکوٰۃ کا اہتمام کرنے والے ہیں؛ وہ بھی عقائد کے سلسلہ کی بنیادی چیزوں سے ناواقف ہیں اور بہت سی مرتبہ ان کی زبان سے ایسے کلمات نکل جاتے ہیں جو کفر تک پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ حالانکہ کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک مسلمان کے لئے یہ جاننا بھی ضروری اور فرضِ عین ہے کہ وہ کون سے کام ہیں اور کون سے کلمات اور باتیں ہیں کہ

جن کے کرنے کے نتیجہ میں اور جن کلمات کے زبان سے نکالنے کے نتیجہ میں آدمی اسلام سے نکل کر کفر میں داخل ہوجاتا ہے، تاکہ وہ اپنے آپ کو ان چیزوں سے بچاسکے اور اپنے ایمان کی حفاظت کرسکے۔

شراب پینے سے زیادہ خطرناک ہے

دوسرا شعبہ عبادات کا ہے، تیسرا شعبہ اخلاق کا ہے، چوتھا شعبہ معاملات کا ہے اور پانچواں شعبہ معاشرت کا ہے۔ معاشرت: جس میں بندوں کے حقوق آتے ہیں اس کی طرف سے بے انتہا غفلت برتی جاتی ہے اور اس میں ہونے والی کوتاہیوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی، مثلاً ایک آدمی شراب پیتا ہے تو اس کو پورا سماج برا سمجھتا ہے اور وہ خود بھی سمجھتا ہے کہ مَیں ایک بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کررہا ہوں، اس کے برخلاف ایک آدمی اگر کسی کی غیبت کرتا ہے تو نہ خود غیبت کرنے والا اس کو برا سمجھتا ہے، اور نہ سننے والے اس کو اہمیت دیتے ہیں، حالانکہ غیبت کرنا بھی ویسا ہی بڑا گناہ ہے جیسا شراب پینا ہے، بلکہ گناہ کی حیثیت اور مرتبہ کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو غیبت کرنا شراب پینے سے زیادہ خطرناک ہے، اس لئے کہ غیبت کو قرآنِ پاک میں جو تشبیہ دی گئی ہے وہ بڑی خطرناک ہے ﴿أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتاً فَكَرِهْتُمُوهُ﴾ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے؟ اس کو تو تم بہت برا سمجھتے ہو۔ گویا قرآنِ پاک میں یہ بتلایا گیا کہ مردار بھائی کا گوشت کھانا جتنا گھناؤنا اور قابلِ نفرت فعل ہے، اپنے مسلمان بھائی کی غیبت کرنا بھی ایسا ہی قابلِ نفرت اور گھناؤنا فعل ہے، بلکہ معنوی اور روحانی طور پر غیبت کرنے کو اسی میں شمار کیا گیا ہے۔

غیبت کی مثالی صورت

آپ نے فضائلِ رمضان میں سنا ہوگا کہ دو عورتوں کو روزہ کی حالت میں بھوک کا بڑا احساس ہوا، جس کو ہم ’’روزہ لگنا‘‘ کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کو اطلاع کی گئی، آپ نے ان کے پاس پیالہ بھیجوایا کہ اس میں قے کرو، قے کی گئی تو اس میں گوشت نکلا، انہوں نے بتلایا کہ ہم نے گوشت تو کھایا بھی نہیں ہے، تو آپ ﷺ نے بتلایا کہ ان دونوں نے غیبت کی تھی (مسند ابویعلیٰ ۳/۱۴۶) اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی برکت سے غیبت کی حقیقت کو لوگوں کے سامنے ظاہر فرمادیا۔ ہر چیز کی شریعت میں ایک صورتِ مثالی ہوا کرتی ہے، ہمارے ظاہری افعال کی جو معنوی تشریح کی جاتی ہے اور اس کی جو صورتِ مثالی بیان فرمائی جاتی ہے اس کو نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں بہت سی مرتبہ ظاہر فرمادیا جاتا تھا۔

غیبت کو زنا سے زیادہ خطرناک کہنے کی وجہ

خیر! مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ غیبت کی کتنی خطرناک تشبیہ دی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ دونوں میں ایک فرق بھی ہے کہ شراب پینا اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے ہے، اگر شرابی کو اپنی اس غلطی اور کوتاہی کا احساس اور اس پر ندامت ہو، اور تنہائی میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے سامنے آنسو بہالے اور توبہ کرلے؛ تو شراب پینے کا گناہ معاف ہوجائے گا، اس کی صفائی کے لئے بندوں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے، جہاں توبہ کی تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا حساب وکتاب صاف ہوچکا ہے۔ لیکن غیبت کا معاملہ ایسا ہے کہ اس میں بندے کا بھی حق ہے، اس لئے جب تک اس کے ساتھ بات صاف نہ کی جائے، اس سے معافی نہ مانگی جائے؛ تب تک غیبت کا گناہ

معاف نہیں ہوتا، اسی لئے غیبت کو حدیثِ پاک میں زنا سے زیادہ خطرناک کہا گیا ہے ﴿اَلْغِیْبَۃُ أَشَدُّ مِنَ الزِّنَا﴾ (شعب الایمان، ۶۷۴۲)

......ہم اتنی اہمیت نہیں دیتے

بہر حال! ہمارے معاشرہ میں بندوں کے حقوق کے معاملہ میں بہت کوتاہی برتی جاتی ہے، اور ان کو اتنی اہمیت ہی نہیں دی جاتی جتنی دی جانی چاہیے، حالانکہ شریعت نے اس کی طرف جتنا متوجہ کیا ہے اور اپنی تعلیمات کے ذریعہ اس کی جتنی زیادہ تاکید کی ہے اور ہمارے ذہنوں میں اس چیز کو بٹھانے کی جتنی کوشش کی ہے، ہم نے اتنی سنجیدگی اور قوت سے نہیں لیا ہے، شریعت نے اس کو جتنی اہمیت دی ہے، ہم اس کو اتنی اہمیت نہیں دیتے۔

احسان کی کیفیت

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے تھے، کراچی میں مقیم تھے، اب تو انتقال ہو چکا ہے، اُس علاقہ میں حضرت حکیم الامتؒ کے خلفاء میں آخر میں انتقال کرنے والے یہی تھے، اب تو حضرت حکیم الامتؒ کے خلفاء میں حضرت مولانا ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم ہی کی شخصیت موجود ہے، اللہ تعالیٰ ان کے سایۂ عاطفت کو باقی رکھے (اب تو وہ بھی چل بسے) خیر! حضرت ڈاکٹر صاحب کے پاس آکر ایک آدمی نے کہا کہ حضرت! مجھے احسان کی کیفیت حاصل ہوگئی۔

نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری زمانہ میں ایک مرتبہ حضورِ اکرم ﷺ صحابۂ کرام کے درمیان تشریف فرما تھے کہ ایک آدمی سفید لباس میں ملبوس آیا، صحابۂ کرام کہتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی اس کو نہیں پہچانتا تھا گویا اجنبی شخص تھا، لیکن اس کے جسم پر سفر کے

کوئی آثار بھی نظر نہیں آتے تھے۔ اُس زمانہ میں جب کوئی آدمی سفر کر کے آتا تو اس کے کپڑے اور اس کا حلیہ ہی بتلادیتا کہ یہ مسافر ہے، آج کل جیسا تو تھا نہیں کہ شتابدی یا راجدھانی میں سفر کر کے آوے اور کپڑے بھی میلے نہ ہوں، اُس زمانہ میں تو سواری پر یا پیدل ہی سفر کیا کرتے تھے، اگر کوئی آدمی دو تین کیلو میٹر سے بھی آتا تھا تب بھی اس کا اثر نمایاں ہوتا تھا کہ یہ باہر سے آیا ہے

بہر حال! اس کے کپڑے بھی صاف شفاف تھے، سفر کا کوئی اثر بھی نہیں تھا اور راوی کہتے ہیں کہ صحابہ میں سے کوئی پہچانتا بھی نہیں تھا، وہ شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آکر بالکل قریب بیٹھ گیا اور نبی کریم ﷺ کے مبارک گھٹنوں سے اپنے گھٹنے ملادیئے، اور کچھ سوالات شروع کئے، پہلا سوال تھا ﴿مَا الْاِسْلَامُ؟﴾ اسلام کیا ہے؟ دوسرا سوال تھا ﴿مَا الْاِیْمَانُ؟﴾ ایمان کیا ہے؟ اور تیسرا سوال تھا ﴿مَا الْاِحْسَانُ؟﴾ احسان کیا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا ﴿أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَأَنَّکَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ یَرَاکَ﴾ احسان یہ ہے کہ تم اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت ایسی کیفیت کے ساتھ کرو گویا تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ کیفیت حاصل نہ ہو تو ہر مؤمن کا یہ یقین تو ہے ہی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ (مسلم شریف، ۱۰۲) یہی کیفیت ہمارے دل ودماغ پر طاری ہو جائے؛ اسی کو احسان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

نماز میں اس کیفیت کا حاصل ہونا ابتدائی درجہ ہے

خیر! اس آدمی نے آکر حضرت ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ مجھے یہ صفت حاصل ہوگئی ہے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مبارک کرے، بہت اچھی بات ہے، لیکن ذرا یہ تو بتلاؤ کہ یہ چیز صرف نماز ہی میں ہے یا اور معاملات میں بھی حاصل

ہے؟ اس نے کہا کہ ہم نے تو حدیث میں یہی پڑھا ہے ﴿أَنْ تَعْبُدَاللهَ﴾ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو۔ اس لئے ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ نماز میں یہ کیفیت حاصل ہوجائے تو کافی ہے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اسی لئے تو مَیں نے پوچھا تھا، اس لئے کہ نماز میں اس کیفیت کا حاصل ہونا تو ابتدائی درجہ ہے، اس کے بعد یہ کیفیت بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھے کہ ہر وقت یہ تصور ہوجائے، آپ گھر میں ہوں، بیوی بچوں کے ساتھ ہوں کسی کے ساتھ کوئی معاملہ ہو رہا ہو، اس وقت بھی یہ کیفیت تمہارے دل و دماغ پر طاری ہو، یہ خیال غالب ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو یا اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ تم فیکٹری میں یا دفتر کے بڑے ہو اور ماتحتوں کے ساتھ کوئی معاملہ کر رہے ہو؛ اس وقت بھی یہ تصور تمہارے دل و دماغ پر حاوی ہو۔ یا تم اپنی دکان پر بیٹھ کر کسی کے ساتھ خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کر رہے ہو؛ اس وقت بھی یہ چیز غالب ہو۔ اپنے پڑوسی کے ساتھ کوئی معاملہ پیش آجاوے اس وقت بھی یہ خیال غالب ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ہر ہر لمحہ اور ہر ہر جگہ یہ کیفیت تمہارے دل و دماغ پر طاری ہوجاوے، اور یہ تصور تم پر غالب آجاوے، اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذاتِ پاک کا استحضار اتنا حاوی ہوجائے جتنا نماز میں ہے، تو پھر ظاہر ہے کہ کون کس کے حق کو مارے گا، پھر تو کوئی بھی بیوی کے اوپر کبھی ظلم نہیں کرے گا، بچوں کے ساتھ زیادتی نہیں کرے گا، کوئی استاذ اپنے شاگرد کے ساتھ برا سلوک نہیں کرے گا، آقا غلام کے ساتھ، سیٹھ نوکر کے ساتھ کبھی کوئی زیادتی نہیں کرے گا، کوئی بیچنے والا خریدنے والے کے ساتھ کسی قسم کی دھوکہ بازی نہیں کریگا، اس لئے کہ اس کو یہ بات پتہ ہے کہ اگرچہ یہ بات سامنے والے کو معلوم نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو جانتا ہے۔

فَأَيْنَ اللهُ؟

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ سفر کے لئے نکلے، ایک چرواہا ملا، اس سے کہا کہ تھوڑا سا دودھ دو۔ اس نے کہا کہ مَیں ان بکریوں کا مالک نہیں ہوں، مَیں تو غلام ہوں، مالک کی طرف سے بکریاں چرانے کا حکم ہے، دودھ نکالنے کا مجھے اختیار دیا نہیں گیا ہے، اس لئے مَیں نہیں دے سکتا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے امتحان کی غرض سے اس سے کہا کہ ایسا کرو کہ ایک بکری مجھے دیدو اور قیمت لے لو، اگر آقا پوچھے تو اس سے کہہ دینا کہ بکری کو بھیڑیا کھا گیا، میرا کام بن جائے گا کہ دودھ پیتا رہوں گا اور پھر ذبح کر کے گوشت استعمال کرلوں گا اور اس کی قیمت تمہارے کام آجائے گی، اس کے جواب میں چرواہا آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے ﴿فَـأَيْـنَ اللهُ؟﴾ اللہ تعالیٰ کہاں جائیں گے؟ یعنی آقا اس وقت نہیں دیکھ رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو دیکھ رہا ہے؟ مَیں اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا؟ (الدرالمنثور۔جزء۔۸/۲۷۳)

دیکھو! اُس زمانہ میں ایک چراوہے پر بھی یہ کیفیت غالب تھی اور یہ مقام اس کو بھی حاصل تھا۔ اُس دور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے نتیجہ میں اور آپ کی برکت سے یہ چیز عام تھی، اسی لئے اس کو خیرالقرون قرار دیا گیا۔ آج یہ چیز بازاروں میں کتنوں کو حاصل ہوگی؟

بندوں کے حقوق کا معاملہ بڑی اہمیت کا حامل ہے

خیر! مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ حقوق کی ادائیگی میں جو کوتاہیاں ہمارے سماج میں کی جاتی ہیں، وہ اسی لئے ہیں کہ ان کو اتنی سنجیدگی سے برتا نہیں جاتا جتنی عبادات کو اہمیت دی جاتی ہے، حالانکہ یہ بھی اہمیت کی چیز ہے۔ اسلئے کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ صحابہ کرام

رضی اللہ عنہم نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ایک عورت ہے جو نماز، روزہ، تہجد وغیرہ کا بڑا اہتمام کرتی ہے، لیکن پڑوسیوں کو تکلیف دیتی ہے؛ اس کے متعلق آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ جہنم میں جائے گی۔ اس کے مقابلہ میں دوسری عورت کے متعلق سوال کیا گیا کہ وہ زیادہ نوافل کا اہتمام تو نہیں کرتی، فرض نمازیں اور روزے وغیرہ بجالاتی ہے، اور تھوڑا بہت صدقہ بھی کرتی ہے، البتہ اس کے پڑوسی اس سے خوش ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ جنت میں جائے گی (مسند احمد، ۹۶۷۵) بندوں کے حقوق کا معاملہ اتنا زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

قرآن وحدیث سے فقہی احکام کیسے نکلے؟

بلکہ آپ اگر فقہ اسلامی کو دیکھیں یعنی قرآن وحدیث کے احکام اور اسلامی قانون پر نظر دوڑائیں تو قرآن میں اگلوں کے قصے بھی ہیں، اوامر اور نواہی بھی ہیں، نصیحتیں بھی ہیں، عقائد بھی بیان کئے گئے ہیں اور بہت ساری چیز ہیں۔ اسی طرح احادیث کے اندر بھی ہیں، علماء نے احادیث کے آٹھ ابواب بتلائے ہیں اور آٹھوں قسم کی احادیث جس کتاب میں موجود ہوں؛ اس کو جامع کہتے ہیں جیسے بخاری شریف جامع ہے۔ خیر! مختلف موضوعات کی احادیث آتی ہیں تو ان احادیث میں اور قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے جو احکامات دیئے اور نبی کریم ﷺ نے جو چیزیں بتلائی ہیں وہ بہت پھیلی ہوئی ہیں اور اس زمانہ میں تربیت کا سلسلہ جاری تھا، اس لئے تدریجی طور پر شریعت کے احکام نازل ہوئے جیسا کہ شروع میں مَیں نے تفصیل سے بتلایا، اس وقت ایسا بھی ہوتا تھا کہ کبھی شروع میں ایک حکم دیا گیا اور بعد میں جب اس پر عمل کے نتیجہ میں لوگوں میں صلاحیت پیدا ہوگئی اور وہ اس قابل ہوگئے کہ اس کے بعد والا حکم قبول کریں تو پہلے والے حکم کو ختم کر کے دوسرا

حکم جاری کیا گیا؛ جس کو نسخ کہتے ہیں۔ یہ سلسلہ بھی جاری تھا۔ اسی لئے قرآن وحدیث کو براہِ راست پڑھ کر شریعت کے احکام کو الگ کرنا اور نکالنا؛ ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فقہاء کرام اور ائمہ عظام کو جزائے خیر دے کہ ان حضرات نے قرآن وحدیث کے تمام ذخائر پر غور وفکر کر کے اسلام کے احکام کو قانونی شکل میں الگ کر دیا۔

قانونی شکل کا مطلب یہ ہے کہ عملی طور پر متشکل کر دیا مثلاً نماز کے متعلق جو احکام قرآن میں دیئے گئے ہیں ان کو قرآنِ پاک کھول کر سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۂ ناس تک آپ ڈھونڈنا چاہیں؛ تو آپ کو نہیں ملیں گے، وہاں تک ہر کس و ناکس کی رسائی نہیں ہو سکتی، یہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہے، پڑھے لکھے بھی اس میں مات کھا جائیں گے۔ سب چیزیں مخلوط تھیں، ان حضرات فقہاءِ کرام نے ایسا کیا کہ زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے احکام کو الگ الگ جمع کیا، عبادات، معاملات میں خرید و فروخت، اجارہ، حوالہ وغیرہ چیزوں کے احکام اور معاشرت میں نکاح، طلاق وغیرہ کے احکام کو مفصل بیان کیا (حوالہ سے مراد ہمارے یہاں جو بولا جاتا ہے وہ نہیں ہے، بلکہ ایک کا دَین دوسرے کی طرف منتقل کرنا مراد ہے) یہ سارے احکامات کتابوں میں تفصیل سے لکھے ہوئے ہیں۔ حضراتِ فقہاءِ کرام کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ انہوں نے آنے والی امت کے واسطے بہت آسانی کر دی، ساری مشقت اور بوجھ انہوں نے اُٹھا لیا۔

امت پر سب سے بڑا احسان کس کا ہے؟

نماز کی مثال لے لیجئے، نماز کیلئے پاکی ناپاکی، طہارت، وضو اور اس کے بعد فرائض، واجبات، ارکان، سنن، مستحبات وغیرہ کی لمبی چوڑی تفصیل کتابوں میں موجود ہے، اس کے بعد نماز کی پوری ترتیب، اس کو ادا کرنے کا پورا طریقہ جس کو ترتیبِ صلوٰۃ کہا جاتا

ہے اور پھر کونسی چیزوں سے نماز ٹوٹ جاتی ہے اور کونسی چیزوں سے ایسا نقص آتا ہے جس کو سجدۂ سہو سے پورا کیا جا سکتا ہے، ان ساری تفصیلات کو الگ الگ کر کے بیان کیا ہے۔ آج ہمارے لئے کتنی آسانی ہوگئی کہ اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ کونسی چیز کا کیا حکم ہے؛ تو آسانی سے ہمیں مل جاتا ہے۔ یہی چیزیں ان حضرات نے قرآن و حدیث میں بڑی مشقت سے غور کر کے نکالی ہیں۔ جو حضراتِ علماء ہیں اور کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں وہ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ پورے قرآن وحدیث کا ذخیرہ کھنگالنے کے بعد انہوں نے یہ چیزیں نکالی ہیں، یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ یہ ان کا ہم پر بڑا احسان ہے۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سب سے بڑا احسان امت پر اگر کسی کا ہے تو وہ حضراتِ فقہاء کا ہے، ان حضرات نے دین کے تمام شعبوں کو منقح کر کے امت کے سامنے پیش کر دیا، اب ہمیں عمل کرنے میں بڑی آسانی ہوگئی ہے، اگر کسی چیز کی خرید و فروخت کرنی ہے تو کتاب اٹھا کر دیکھ لو کہ کس طرح خرید وفروخت کرنی چاہئے، کیسے معاملہ کریں گے تو جائز ہوگا اور کونسی صورت میں ناجائز ہو جائے گا، یہی چیز انہوں نے قرآن وحدیث میں غور وفکر کر کے سمجھائی ہے۔

مثال سے تقلید کی ضرورت کا اثبات

آج کل جہاں اسلاف کے کارناموں پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس میں ایک بہت بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ حضرات ائمۂ اربعہ (امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ) کو بھی نہیں چھوڑا جاتا، حالانکہ انہوں نے بڑی مشقت اٹھا کر احکام کو حدیث و قرآن سے واضح کیا ہے، ہر ایک کا اپنا اپنا طریقہ اور انداز تھا جس کو کچھ فرق کے ساتھ ترتیب دیا گیا، جو لوگ مطالعہ کرتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں، مَیں آپ کو ایک مثال سے سمجھاؤں۔

ہمارا ملکی قانون اور دستور پورا موجود ہے اور تمام اصول باقاعدہ ترتیب دیئے گئے ہیں دستور کی کسی دفعہ کی تشریح اور اس قانون کی وضاحت کرنے کا حق مجھے اور آپ کو نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے مستقل ایک جماعت ہے جس کو وکلاء کہا جاتا ہے اور ان کے اوپر جج ہوتے ہیں اور پھر ججوں کے بھی الگ الگ درجے ہوتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے کہ گجرات ہائی کورٹ کا ایک اہم ریفرنس آیا ہے، کوئی اہم اور خاص فیصلہ اور ججمنٹ آیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ملک کے دستور میں یہ چیز ذرا مبہم تھی (مبہم کو گجراتی والوں نے ([illegible]) بنا دیا ہے) اور ہر مبہم چیز کی وضاحت کرنی پڑتی ہے، جب کورٹ کے اندر کوئی کیس جاتا ہے اور کیس چلتا ہے تو دونوں طرف سے دلائل چلتے ہیں اور دونوں کے دلائل سننے کے بعد جج اپنے فیصلے کے اندر ایک بات طے کرتا ہے، ایسے فیصلے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور آئندہ جا کر وہ بھی قانون کا ایک جزو بن جاتے ہیں، قانون کے ماہرین اس چیز کو سمجھیں گے، پھر آئندہ جب دوسرے کیس لڑے جاتے ہیں تو وکیل اسی فیصلہ کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ فلاں سن میں فلاں ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا تھا اور اس کا یہ مطلب بیان کیا تھا لہٰذا اب یہی مطلب ماننا پڑے گا۔

خیر! مَیں یہ سمجھا رہا تھا کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے اندر جب اتنے مختلف پہلو اور مطلب نکل سکتے تھے اور ان میں سے کونسا مطلب قابلِ قبول اور کونسا مطلب قابلِ رد ہے، اس کا فیصلہ ہر آدمی کے ہاتھ میں نہیں دیا گیا، بلکہ اس کے لئے مخصوص ادارے قائم کئے گئے اور ان اداروں میں جو شخص تیار ہو، اسی کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اس میں کوئی کلام کرے۔ اب وہاں مَیں اور آپ یہ نہیں کہتے کہ کیا ہم انسان نہیں؟ ہم یہاں کے شہری نہیں؟ کیا ہم پر یہ قانون اور دستور لاگو نہیں پڑتا؟ کیا ہمیں یہ حق نہیں ہے کہ ہم

اس کی تشریح کریں؟ وہاں کسی کی ہمت نہیں ہوتی، بڑے بڑے دانشور بھی وہاں خاموش رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھائی! یہاں تو جج صاحب ہی بول سکتے ہیں، سب بھیگی بلّی کی طرح باتیں کرتے ہیں۔ اور جب قرآن وحدیث کی بات آتی ہے تو ہر ایک کی زبان کھل جاتی ہے، حالانکہ قرآن وحدیث سے مسائل کو نکالنے کے لئے کن کن علوم وفنون سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے وہ کتابوں میں تفصیل سے بتلایا گیا ہے، اس سے ان کو کوئی واسطہ نہیں ہوتا؛ پھر بھی کہتے پھرتے ہیں کہ کیا ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس بارے میں کچھ کہیں؟

خیر! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ حضراتِ ائمۂ کرام کا ہم سب پر بڑا احسان ہے کہ انہوں نے ہمیں زندگی کے تمام مسائل کو الگ الگ کر کے بتلا دیا، اگر صرف نماز ہی ہمارے حوالہ کی جاتی کہ اپنے طور پر سمجھ کر نماز پڑھو، تو پتہ نہیں ہم نماز کی کتنی مٹی پلید کرتے۔

تقلید کی حقیقت کیا ہے؟

اِس زمانہ میں چند لوگ آئے جو یہ کہتے ہیں کہ ائمۂ کرام کی تقلید تو بڑا ظلم ہے۔ تقلید کی حقیقت کیا ہے؟ تقلید کا مطلب صرف اتنا ہی ہے جیسے جج کے فیصلہ کو بنیادی حیثیت دی جاتی ہے اور اس کی قانونی مہارت کی وجہ سے اس کو تسلیم جاتا ہے، وہاں کوئی نہیں کہتا کہ یہ تقلید ہے اسی طرح یہاں پر بھی ہم نے ان حضراتِ فقہاء کی مہارت پر اعتماد کیا۔

ایک شکل تو یہ تھی کہ قرآن وحدیث میں ہم براہِ راست غور کرتے اور نماز کا طریقہ نکالتے، اور اس کے مطابق نماز پڑھتے۔ اور ایک شکل یہ ہے کہ جو حضرات اس کے ماہرین تھے اور پھر تقویٰ وطہارت، اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ تعلق کی مضبوطی میں آگے بڑھے ہوئے تھے، ایسے لوگ جن کو ہر چیز میں خوفِ خدا دامن گیر تھا، انہوں نے قرآن وحدیث

میں غور وفکر کر کے جس بات کو قانونی حیثیت دی، اب ہم ان پر اعتماد کریں۔ بس! اسی اعتماد کا نام تقلید ہے۔ اور اسی کو اِس زمانہ میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ گناہ اور شرک ہے۔

غیر مقلدین بھی درحقیقت مقلد ہی ہیں

اور جو تقلید چھوڑنے کی بات کرتے ہیں ان لوگوں کے پاس ہے بھی کیا؟ جو تقلید کے معاملہ میں اعتراض کرتے ہیں ان کے پاس مسائل بھی گنے چنے ہیں، امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیے یا نہیں؟ رفعِ یدین کرنا چاہیے یا نہیں؟ ایسے چند مسائل ہیں جن کے اندر وہ لوگ ناواقفوں کو الجھاتے رہتے ہیں، انہیں لوگوں سے اگر خرید وفروخت کا کوئی مسئلہ پوچھ لو، تو ہدایہ اٹھا کر بتلائیں گے۔ یہ بات مَیں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ انہی لوگوں کا اقرار ہے۔

حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ جو دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے، پہلے مسجد فتح پوری کے مدرسہ میں تھے، وہ فرماتے ہیں کہ کچھ غیر مقلدین سے ہم نے سوالات کیے تو انہوں نے اقرار کیا کہ ہم بھی ان مسائل میں ہدایہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں، ہدایہ میں اگر کسی حدیث کا حوالہ دیا ہو تو پھر نصب الرایہ وغیرہ میں دیکھ کر لوگوں کو بتاتے ہیں کہ فلاں کتاب میں یوں لکھا ہے۔

فقہ اسلامی بڑی عظیم نعمت ہے

تو درحقیقت ان فقہاءِ کرام اور ائمۂ عظام کا بڑا احسان ہے، یہ تو ایک چیز ضمناً آ گئی تو سمجھدار لوگوں کے سامنے مَیں اسلیئے پیش کرتا ہوں تا کہ اس کی اہمیت کو سمجھیں کہ فقہ اسلامی بڑی عظیم نعمت ہے، اس فقہ اسلامی کی وجہ سے امت کا رشتہ ایک ڈور میں

بندھا ہوا تھا اور مضبوطی کے ساتھ اس پر عمل ہوتا تھا، مخالفین نے جب یہ چاہا کہ امت کو منتشر کیا جائے تو انتشار پیدا کرنے کے لئے انہوں نے جو مکائد اور تدابیر سوچیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ائمۂ عظام سے ان کو کاٹ دو، لہٰذا انہوں نے یوں کہنا شروع کیا کہ تم لوگ اللہ ورسول پر ایمان لائے ہو، یا امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ وغیرہ پر؟

احمقانہ سوال

بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ حنفی ہیں یا مسلمان؟ اولاً تو ان کا یہ سوال ہی غلط ہے، یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے کوئی یہ کہے کہ آپ ہندوستانی ہیں کہ گجراتی؟ اگر آپ سے یہ سوال کیا جائے تو آپ اس سوال کو کیا کہیں گے؟ یہ تو حماقت در حماقت ہے۔ گجراتی تو ہندوستانی کی ایک شاخ ہے۔ ہاں! یہ سوال ہوسکتا ہے کہ آپ گجراتی ہیں یا مہاراشٹرین؟ لیکن حنفی شافعی ہیں یا محمدی ومسلمان؟ یہ سوال ہی بے کار ہے۔ وہ لوگ ایسی بات کر کے عوام کو دھوکہ دیتے ہیں۔

بندر کو ادرک کی گرہ مل گئی

بات یہ چل رہی تھی کہ اسلامی فقہ میں حضراتِ فقہاء نے قرآن وحدیث میں جتنی قانونی چیزیں تھیں ان کو الگ الگ کر کے جمع کر دیا اور کتابی شکل میں مدون کر دیا اب ہمارے لئے بڑی آسانی ہوگئی کہ کسی بھی مسئلہ کا حکم معلوم کرنا ہو تو کتابوں کو کھول کر دیکھ لو، اسی طرح حقوق اللہ اور حقوق العباد کو بھی کتابوں میں الگ کر کے بتلایا ہے۔ اب مثلاً ہم فقہ حنفی پر عمل کرتے ہیں تو مدارس میں انہی مسائل کو پڑھایا جاتا ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن وحدیث میں غور وفکر کر کے مسائل کو وضاحت کے ساتھ پیش

کیا ہے، انہی پر اعتماد کرتے ہوئے ہم عمل کرتے ہیں۔

فقہ حنفی کی ایک مشہور کتاب ہے جس کا نام ''ہدایہ'' ہے، جو عالم بننے والوں کو پڑھائی جاتی ہے، اس کتاب کے بڑے ضخیم چار حصے ہیں، ان چار حصوں میں سے صرف ایک ہی حصہ میں عبادات کا ذکر ہے، باقی تین حصوں میں معاشرت معاملات اور حقوق العباد کی چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ حدود حقوق اللہ میں آتی ہیں لیکن وہ تھوڑا سا حصہ ہے، لہٰذا یوں سمجھئے کہ دین کے مسائل میں سے پونا حصہ حقوق العباد سے تعلق رکھتا ہے اور پاؤ حصہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتا ہے۔ شریعت کے اندر حقوق العباد کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ گویا پونا دین حقوق العباد ہے۔ اب ہم صرف عبادات کو پکڑ لیں اور اس پر عمل کر کے یوں سمجھیں کہ ہم سو فیصد مسلمان ہیں۔ پاؤ حصہ پر عمل کرتے ہیں، پونے حصہ پر عمل نہیں کرتے اور اپنے کو پورا مسلمان سمجھتے ہیں، یہ تو ایسا ہی ہوا کہ جیسے کسی بندر کو ادرک کی گرہ مل گئی تو وہ اپنے آپ کو پنساری سمجھنے لگا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ بندوں کے حقوق سے تعلق رکھنے والے احکام کو بھی عملی جامہ پہنایا جائے۔

باب کا عنوان

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب حقوق العباد کے متعلق قائم کیا اور اس میں سب سے پہلے عورتوں کے حقوق بیان کرنا چاہتے ہیں، اس لئے باب کا عنوان قائم کیا ہے ''اَلْوَصِيَّةُ بِالنِّسَآءِ'' اور مَیں عرض کر چکا ہوں کہ بندوں کے حقوق میں سب سے زیادہ کوتاہی عورتوں کے سلسلہ میں کی جاتی ہے، عورتوں کو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا، مثلاً ہمارے سماج میں بھی مردوں کے لئے بولتے ہیں کہ دو آدمی آئے۔ تو کیا عورت آدمی نہیں ہے؟ آدمی یہ آدم کی طرف نسبت ہے یعنی حضرت آدم کی اولاد۔ مرد ہو یا عورت؛ دونوں کو آدمی کہیں گے۔

لیکن ہمارے عرف میں بھی آدمی کا لفظ فقط مردوں کے لئے ہی بولتے ہیں، عورتوں کے لئے نہیں بولا جاتا، یہ بھی دراصل زمانۂ جاہلیت کی خوبو ہے جو آج تک چلی آرہی ہے کہ عورتوں کو انسانیت سے الگ چیز سمجھا جاتا تھا۔ آدمی بولنے والے گویا یہی سمجھتے ہیں۔

عورتوں کے حقوق میں بیداری اسلام کے بعد آئی

خیر! عورتوں کے حقوق میں سب سے زیادہ کوتاہی برتی جاتی تھی، اس لئے اسلام نے آکر عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کی طرف متوجہ کیا اور عورتوں کے وہ حقوق بتلائے جن کی وجہ سے ان کو ایک خاص مقام عطا ہوا۔ آپ اندازہ لگائیں کہ اُس زمانہ میں عورتوں کو کیا سمجھا جاتا تھا مثلاً باپ نے دوسری بیوی سے شادی کی تو باپ کے انتقال کے بعد بیٹے جہاں باپ کی جائیداد، مال ودولت کے مالک بنتے تھے، وہیں باپ کی دوسری بیوی کے بھی مالک سمجھے جاتے تھے گویا وہ بھی باپ کی وراثت میں شامل سمجھی جاتی تھی ﴿لَا یَحِلُّ لَکُمْ أَن تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرْهًا﴾ کی تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی منقول ہے جو بخاری شریف کے اندر موجود ہے۔ (بخاری شریف، ۴۳۰۳)

ہمارے ہندوستان کے اندر بعض علاقوں میں آج بھی ایسے قبائل موجود ہیں۔ بھرواڑ قوم کے اندر بھی عورتوں کے معاملہ میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ مرنے والے کے مال و جائیداد کے ساتھ اس کی بیوی بھی میراث میں تقسیم ہوتی ہے، کیونکہ اس کو بھی پیسے خرچ کر کے لایا گیا ہے اور جتنی چیزیں پیسے خرچ کر کے آئی ہیں ان کو میراث میں شمار کرتے ہیں۔

مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ اُس زمانہ میں عورت کو انسان کا مقام ہی نہیں دیا جاتا تھا اسلام نے آکر عورتوں کے حقوق کی طرف توجہ دلائی۔ تمام مؤرخین اس بات کو لکھتے آئے ہیں خاص طور پر تاریخ کی بنیادی حکمتوں پر غور کرنے والے حضرات لکھتے ہیں کہ عورتوں

کے حقوق کے باب میں بیداری اسلام کے بعد آئی ہے، سب سے پہلے اسلام نے عورتوں کے حقوق کی طرف متوجہ کیا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ یوروپ اور برطانیہ والوں کے یہاں اٹھارہویں صدی تک عورت ایک مال سمجھی جاتی تھی، اور شوہر کو یہ اختیار ہوتا تھا کہ وہ بیوی کو فروخت کرنا چاہے تو کردے، یہ تو اسلام کی برکت ہے کہ یوروپ کا علاقہ اس سے آشنا ہوا۔ اسپین کے اندر اسلامی قانون آیا اور اسی سے یوروپ کے اندر ترقیاں آئیں اور پھر دھیرے دھیرے ان میں بیداریاں آئیں۔

تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اب جب عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں بیداری آئی تو ایسے بیدار ہوئے کہ سب کی نیندیں خراب کرڈالی، حقوق کے نام پر حد سے آگے بڑھ گئے:-

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ❁ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

جیسا معاملہ ہوگیا ہے۔ ایک تو وہ حال تھا اور اب عورتوں کو آزادی دینے پر آئے تو ایسی آزادی دی کہ ان کی معاشرتی زندگی تباہ وبرباد ہوگئی، ازدواجی اور معاشرتی زندگی کے نام پر وہاں کچھ ہے ہی نہیں۔ ہمارے یہاں جو خاندانی نظام ہے اور ماں باپ کے حقوق کا اہتمام ہے اور میاں بیوی کے آپس کے حقوق کا معاملہ ہے، اولاد کی تعلیم وتربیت کی فکر ہے، یوروپ وغیرہ میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ شوہر بھی کمانے کے واسطے جاتا ہے اور بیوی بھی جاتی ہے، اولاد کو ''بچہ گھر'' (Children home) کے حوالہ کردیا جاتا ہے، ماں باپ بوڑھے ہوں تو ان کو ''بڈھا گھر'' (Nursing home) کے حوالہ کردیا جاتا ہے۔

ابھی ایک دو ہفتہ پہلے گجرات متر (ગુજરાત મિત્ર) اخبار میں ایک خط پڑھا تھا جو امریکہ سے کسی صاحب نے لکھا تھا، وہ سورت کا رہنے والا تھا، اپنے زمانہ میں ٹی بی

کا بڑا مشہور ڈاکٹر تھا، اس نے اپنے بچوں کو بھی ڈاکٹر بنایا اور امریکہ بھیجا، پھر ان کے اصرار پر جب میاں بیوی وہاں گئے تو بچوں نے ان کے ساتھ ایسی ذلت وتحقیر کا معاملہ کیا کہ ان کا کوئی بھی سہارا نہ رہا۔

میانہ روی ہی اصل چیز ہے

مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ ان کے یہاں آزادیاں ایسی آئیں کہ پورا معاشرتی نظام تباہ وبرباد ہوگیا۔ اسلام ایک معتدل مذہب ہے، اور میانہ روی ہی اصل چیز ہے، کسی کے حق کے معاملہ میں اتنی زیادتی کرنا کہ دوسرے کی حق تلفی ہو، اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ بھائی! آپ بخار کا ایسا علاج کریں کہ ایک دم ٹھنڈے ہوجائیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے، بخار کی آئی ہوئی گرمی کو دور ضرور کرنا چاہیے لیکن اتنی بھی ٹھنڈک پیدا نہیں کرنی ہے کہ آدمی پورا ہی ٹھنڈا ہوجائے، آدمی کی طبیعت میں گرمی اور ٹھنڈی اعتدال کے ساتھ ہونا مطلوب ہے۔

عورتوں کے حقوق کا بیجا شور

خیر! آج کل ان لوگوں نے عورتوں کے حقوق کے نام سے جو بیجا شور مچا رکھا ہے اور امریکن ایمبیسی (Embassy) والے بھی جو چاہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟ وہ تو مَیں اور آپ سب جانتے ہیں۔ درحقیقت مردوں کا طبقہ زمانۂ جاہلیت کے اندر بھی عورتوں کا استحصال کرتا رہا، جس کو گجراتی میں (NttuMtKt) کہتے ہیں، اور اب اس دورِ ترقی میں بھی یہی کر رہا ہے۔ اور پھر مساوات کا نعرہ لگاتے ہیں کہ مرد جو کام کرسکتا ہے وہ عورت کیوں نہیں کرسکتی، اس لئے جو کام بھی کریں دونوں مل کر کریں۔ مَیں کہا کرتا ہوں کہ

ایسا ہی ہے تو پھر بچے جنوانے کا کام صرف عورت سے ہی کیوں لیا جاتا ہے؟ مردوں کو بھی اس میں شریک کرو۔ لیکن دراصل یہ قدرت کی بنی ہوئی ایسی چیز ہے، اس میں وہ لوگ کچھ بھی نہیں کرسکتے، یہ فطری نظام ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری عورت پر ڈالی ہے اور اسی کے نتیجہ میں گھریلو ذمہ داریاں بھی آتی ہیں اب گھریلو ذمہ داریوں میں ان لوگوں نے چکر ڈال دیا، لیکن اِس میں وہ کیا کرسکتے ہیں؟ لامحالہ بچے تو عورت ہی کو جننے ہیں اور اس کی وجہ سے دوسری دشواریاں پیش آتی ہیں، اس وقت مَیں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔

وقت بہت ہو چکا ہے اس لئے بقیہ مضمون ان شاء اللہ آئندہ مجلس میں بیان کروں گا۔

اَلْوَصِيَّةُ بِالنِّسَآءِ

عورتوں کے بارے میں تاکید

مجلس (۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حسنِ اخلاق کے ساتھ زندگی گزارو

جیسا کہ پچھلی مجلس میں بتلایا تھا، علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے عنوان قائم کیا ہے کہ عورتوں کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ نے کیا کیا تاکیدیں فرمائی ہیں۔ پہلے اللہ تعالیٰ کا ایک ارشاد پیش کیا ہے ﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ یہ سورۂ نسآء کی آیت کا ایک ٹکڑا ہے کہ عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے ساتھ اور حسنِ اخلاق کے ساتھ زندگی گزارو۔ جیسا کہ پہلے بتلا چکا ہوں کہ چونکہ زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کے حقوق کے معاملہ میں بہت زیادہ بے پروائی برتی جاتی تھی اس لئے اسلام نے اس سلسلہ میں خاص تاکید فرمائی ہے۔ گویا عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور حسنِ معاشرت یعنی اچھے طریقہ سے زندگی گزارنے کی اللہ تبارک وتعالیٰ نے خاص تاکید فرمائی بلکہ حکم دیا۔ ﴿عَاشِرُوْا﴾ امر کا صیغہ ہے جس کے ذریعہ حکم دیا جاتا ہے۔ معاشرت کا معنیٰ دو افراد کا ایک ساتھ رہ کر زندگی گزارنا، چونکہ شوہر اور بیوی ایک ساتھ مل کر زندگی گزارتے ہیں، اس لئے حدیثِ پاک میں شوہر کو ﴿عَشِیْرٌ﴾ کہا گیا یعنی وہ آدمی جس کے ساتھ زندگی گزاری جائے، اسی کو گجراتی میں (BJtltmtt:te) اور اردو میں ''رفیقِ حیات'' کہتے ہیں۔

خیر! حسنِ معاشرت کی اللہ تعالیٰ نے خاص تاکید فرمائی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بھی اپنے ارشادات میں اس موضوع پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی سفارش

یہاں ایک چیز خاص طور پر غور طلب ہے کہ عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے

متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص تاکید فرمائی گئی ہے۔حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم ایک مثال سے اس بات کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کسی کا نکاح کسی لڑکی کے ساتھ ہوا اور جب رخصتی کا وقت آیا اور وہ لڑکی اس کے گھر آئی تو اس علاقہ کا کلکٹر، یا انسپکٹر یا آئی جی پی کہنے لگا کہ دیکھو! یہ ہمارے دوست کی لڑکی ہے، اس کے ساتھ اچھا معاملہ کرنا، جب یہ معلوم ہوگیا کہ یہ لڑکی جو ہمارے گھر میں دولہن بن کر آئی ہے، اس کا باپ آئی جی پی، یا ڈی ایس پی کا دوست ہے، تو یہ سن کر دولہے صاحب کا پسینہ چھوٹ جائے گا، جب وہ لڑکی رخصت ہوکر اس کے گھر میں آجائے گی اور کبھی کوئی معاملہ ہوگا تو وہ ہمیشہ ڈرتا رہے گا، اس کے دل ودماغ اور تصور میں یہی رہے گا کہ فلاں نے اس کی طرفداری کی تھی، ڈی ایس پی کا چہرہ ہی ہر وقت اس کے سامنے گھومتا رہے گا کہ اگر اس کے ساتھ کہیں کوئی ناروا سلوک ہوگیا اور وہاں اطلاع مل گئی تو ہمارا حلیہ بگڑ جائے گا اور جواب دہی مشکل ہوجائے گی۔

تو دیکھئے! دنیا کی حکومت کے ایک کارندے کی طرف سے اگر کسی لڑکی کی سفارش آپ تک پہنچ گئی تو آپ کو اس کے معاملہ میں بہت زیادہ احتیاط کا سلوک کرنا پڑتا ہے، اس کے ساتھ شفقت اور ہمدردی والا رویہ اپنانا پڑتا ہے؛ تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر تاکید کی جائے کہ یہ ہماری بندیاں ہیں ان کے ساتھ اچھا سلوک کیجیو ، اور بھلائی کے ساتھ زندگی گزاریو؛ تو ایک مؤمن کو مؤمن ہونے کے ناتہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جانے والی تاکید پر کیسی توجہ دینی چاہیے؟ یہ سوچنے کی چیز ہے۔اور جب ایک فوجدار کا اتنا ڈر لگا ہوا ہے کہ اگر اس کی سفارش کی طرف توجہ نہیں کی گئی تو اس کا انجام کیا ہوگا؛ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تاکید کی گئی ہے اگر اس کا خیال نہیں رکھا گیا تو اس کا انجام بھی سوچنا چاہیے۔

پھر سے علوم کا سلسلہ شروع ہو گیا

حضرت اقدس حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں پورا نظام الاوقات بنا ہوا تھا، اسی کے مطابق سارے کام ہوتے تھے، صبح کو تفریح کے لئے تشریف لے جاتے تھے، وہاں سے واپسی کے بعد بیان القرآن کی تالیف کا کام فرماتے تھے۔ ایک روز ایسا ہوا کہ حضرت کی اہلیہ محترمہ کو کسی جگہ جانا تھا اور انہوں نے گھر میں کچھ مرغیاں پال رکھی تھیں، جاتے ہوئے انہوں نے حضرت سے کہہ دیا کہ فلاں وقت مرغیوں کو کھول دینا اور دانہ پانی دیدینا۔ چنانچہ فجر کے بعد حضرت تو اپنے معمول کے مطابق چلے گئے اور عادت نہیں تھی اس لئے یاد بھی نہیں رہا، تفریح کے دوران قرآنِ پاک کی تلاوت کا بھی معمول تھا، وہاں سے آنے کے بعد دار التصنیف میں بیان القرآن کی تالیف کے لئے تشریف لے گئے، حضرت فرماتے ہیں کہ جب مَیں لکھنے کے لئے بیٹھا تو کوئی بھی چیز ذہن میں نہیں آرہی تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا لکھوں، دیر تک سوچتا رہا لیکن ایک لفظ بھی نہیں لکھ پایا پھر مَیں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ! مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میرے کس گناہ کی وجہ سے اس وقت مَیں کچھ نہیں لکھ پا رہا ہوں؛ تاکہ مَیں اپنے اس گناہ سے توبہ کروں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل میں ڈالا گیا کہ ہماری ایک مخلوق مرغیاں ڈربے میں بند پڑی ہیں، ابھی تک ان کو دانہ پانی نہیں ملا ہے؛ پھر تم پر علوم کی بارش کیسے ہو؟ حضرت فوراً اُٹھے، جاکر ان مرغیوں کو نکالا، دانہ دیا، ان کے پاس پانی رکھا، اس سلسلہ میں جو کوتاہی ہوئی اس سے توبہ کی، پھر دار التصنیف میں جاکر بیٹھے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ بیٹھتے ہی علوم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ایسے گھرانے پر کیسے اتریں؟

تو دیکھئے! یہاں حضرت سے قصداً ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ نادانستہ طور پر بھول سے ایک ایسی مخلوق جو انسان نہیں ہے اس کے ساتھ اس کے حق کی ادائیگی میں غفلت ہوئی، اس کا نتیجہ ایک شیخِ وقت اور اپنے وقت کے سید العلماء کے ساتھ یہ ہوا کہ علوم کا فیضان جو باری تعالیٰ کی طرف سے ان کے قلب پر ہوتا تھا وہ منقطع ہو گیا۔ اب اگر اشرف المخلوقات کے ساتھ اور اس میں بھی کمزور صنف عورت کے ساتھ جو بے چاری بہت کچھ قربانی دے کر تمہارے گھر آئی ہوئی ہے، اس کے ساتھ کسی گھر میں زیادتی ہو اور وہ بھی نادانستہ نہیں، بلکہ دانستہ اور قصداً؛ تو پھر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ایسے گھرانے پر کیسے اتریں؟ اس کے بعد بھی اگر لوگ اس بات کی توقع اور امید رکھیں کہ ہمارے کام بنیں؛ تو یہ محال ہے۔

کام کیوں بگڑتے ہیں؟

بہت سی مرتبہ گھرانے والوں کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے ساتھ قدرت کی طرف سے یہ جو معاملہ ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ روٹھے ہوئے ہیں اور ہمارے کام بگڑ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل وکرم کا معاملہ نہیں ہو رہا ہے؛ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس طرف دھیان ہی نہیں جاتا اور اس کو اپنا قصور سمجھا ہی نہیں ہے، اس کو قابلِ اعتناء، قابلِ اہتمام اور قابلِ توجہ چیز سمجھا ہی نہیں ہے کہ اس کی طرف دھیان جائے۔ ہر وقت پریشان رہتے ہیں اور پھر مزید نحوست یہ آتی ہے کہ دوسروں پر بدگمانیاں کرتے ہیں کہ کسی نے کچھ کرا دیا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مزید عذاب ہے کہ دوسری پگڈنڈی پر چل پڑتا ہے، اب معلوم نہیں کہاں پہنچے گا، اصل بیماری کی طرف توجہ کرے تو اس کا علاج بھی ہو، اور صحیح علاج ہو تو پھر شفا بھی ہو۔

ہماری نگاہ محدود ہے

خیر! یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے خاص طور پر تاکید کی گئی ہے ﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ. فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰىٓ اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلا ٹکڑا ہی پیش کیا ہے لیکن مَیں نے اس کے آگے کا دوسرا ٹکڑا بھی اس لئے پڑھا کہ آگے جو روایتیں آرہی ہیں ان میں اس سے روشنی ملے گی۔ اگر تم شادی کر کے کسی عورت کو لے آئے اب تم ان کو ناپسند سمجھتے ہو، وہ تمہیں اچھی نہیں لگتی؛ تو ان کے ساتھ ناروا اور غلط سلوک کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی چیز کو تم ناپسند کرتے ہو اور نتیجہ کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے اس میں تمہارے لئے بہت بڑی بھلائی رکھی ہے۔ ہم تو ناقص ہیں، اس دیوار کے پیچھے کیا ہے یہ بھی ہمیں معلوم نہیں ہے، بلکہ اگر دیوار ہٹادی جائے اور سامنے افق تک کھول دیا جائے، تب بھی ہماری نگاہ محدود ہے، ہماری آنکھوں کا یہ حال ہے کہ کھلا ہوا ہونے کے باوجود ایک حد سے آگے نہیں دیکھ سکے گی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خاص طور پر تنبیہ فرمادی۔

قرآن کا انداز اصولی ہے لیکن......

بہرحال! قرآنِ پاک میں میاں بیوی کے تعلقات کے متعلق بڑی تفصیلات ہیں، علماء نے لکھا ہے کہ نماز جیسی اہم عبادت کے متعلق قرآنِ پاک میں تقریباً تہتر (۷۳) جگہ پر حکم دیا گیا ہے، لیکن بس اجمالی طور پر فرمادیا کہ نماز قائم کرو اور جو لوگ نماز قائم کرتے ہیں ان کا یہ مقام ہے، لیکن نماز کے متعلق تفصیلات نہیں ہیں کہ مثلاً کتنے

وقت کی نماز پڑھیں اور فجر ظہر عصر وغیرہ کی کتنی رکعتیں ہیں، نماز میں کتنے فرض ہیں، کن چیزوں سے نماز ٹوٹ جاتی ہے نماز کا طریقہ کیا ہے وغیرہ وغیرہ؛ ایسی کوئی تفصیل قرآنِ پاک کے اندر موجود نہیں ہے، نبی کریم ﷺ نے اپنے افعال کے ذریعہ اس کی تفصیل بتلائی ہے، حدیثِ پاک میں آتا ہے ﴿صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ﴾ جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھو، اسی طرح تم بھی نماز پڑھو (سنن کبریٰ، ۴۰۲۲) حضورِ اکرم ﷺ نے اپنے ارشادات سے اور اپنے عمل سے نماز کی تفصیلات بتلائی ہیں۔ تو نماز جیسی اہم عبادت کے بھی جزئیات یعنی چھوٹے چھوٹے مسائل قرآنِ پاک میں نہیں بتلائے، اس لئے کہ قرآن کا انداز تو اصولی ہے، وہ تو بنیادی چیزیں بتلاتا ہے اور اس کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ یہی حال زکوٰۃ کا ہے۔ زکوٰۃ کس پر واجب ہے، کتنا نصاب ہونا چاہیے، کتنی مقدار میں زکوٰۃ نکالنی چاہیے، کون کون سے مال میں زکوٰۃ لی جائے گی، کب دی جائے، ایسی کوئی تفصیل نہیں ہے۔ گویا ان سب چیزوں کے متعلق قرآنِ پاک اصولی ہدایتیں دیتا ہے۔ لیکن سوچنے کی چیز یہ ہے کہ میاں بیوی کے مسائل کے متعلق قرآنِ پاک میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی بیان کیا گیا ہے، میاں بیوی کے تعلقات سے مختلف جزئیات قرآنِ پاک میں موجود ہیں مثلاً اگر دونوں میں ناگواری پیدا ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے، بیوی ناپسند ہے تو کیا سلوک کرو، اگر عورتوں کی طرف سے نافرمانی ہو تو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے ﴿وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ﴾ یہ پورا مضمون قرآنِ پاک میں موجود ہے۔ اور بھی بہت ساری تفصیلات ہیں جو علماء جانتے ہیں۔

گھر جنت یا جہنم

میاں بیوی سے متعلق فروعی مسائل کو قرآنِ پاک میں کیوں ذکر کیا گیا ہے؟ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات اگر ٹھیک، درست اور استوار ہیں تو پورا معاشرہ، پوری سوسائٹی اور پورے سماج کی بنیاد اس پر قائم ہے، میاں اگر بیوی کے حقوق ادا کر رہے ہیں، بیوی اگر میاں کا حق ادا کر رہی ہے تو گھر جنت کا نمونہ ہے، بچے بھی ماں باپ کی محبت پائیں گے، تعلقات کی استواری کی وجہ سے دونوں میں سے ہر ایک اپنے فرائضِ منصبی اور ذمہ داری ادا کرے گا، بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کی جائے گی۔ اگر تعلقات ٹھیک ہیں تو یہ سب کچھ ہوگا۔

اور اگر میاں بیوی کے تعلقات ٹھیک نہیں ہیں، جہاں شوہر گھر میں آیا کہ لڑائی شروع ہوئی، نہ سلام نہ کلام، جتنی دیر میاں گھر میں ہے جھگڑا ہو رہا ہے، نہ شوہر بیوی کے حقوق ادا کر رہا ہے، اور نہ بیوی شوہر کے حقوق ادا کرتی ہے؛ تو ان سے جو اولاد ہوگی آپ اندازہ لگائیے کہ ان پر کیا گزرے گی اور وہ کیا تأثر لیں گے؟ چھوٹے چھوٹے بچوں کی نفسیات پر کیا اثر ہوگا؟ بچے جن کی گود میں پل رہے ہیں وہ اپنے بڑوں کو لڑتے ہوئے اور ایک دوسرے کو گالی دیتے ہوئے اور ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہوئے، ایک دوسرے پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے اور ایک دوسرے کی تذلیل و تحقیر کرتے ہوئے دیکھیں گے؛ تو ان بچوں پر کیا اثر پڑے گا؟ نہ وہ باپ کی شفقت پا سکتے ہیں اور نہ ماں کی محبت ان کو ملے گی، روزانہ کی اس جھک جھک میں وہ بڑے ہوں گے، نہ ان کی تعلیم کی طرف کسی کی توجہ ہے، اور نہ تربیت کی طرف۔ جب یہی بچے بڑے ہوں گے تو چونکہ انہیں کے ذریعہ سماج تشکیل پا رہا ہے اور انہیں سے سوسائٹی بنتی ہے، معاشرہ انہیں سے قائم ہوتا ہے، جب معاشرہ میں ایسے ہی بچے

جمع ہوں گے؛ تو پھر کیا ہوگا؟ سارا معاشرہ جہنم کدہ بن جائے گا۔

مغربی معاشرہ کا بڑا المیہ

آج یوروپ اور امریکہ کا المیہ اور سب سے بڑا پروبلم یہی ہے۔ وہاں معاشرتی اور گھریلو زندگی نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ ماں بھی صبح سویرے گھر سے کمانے کے واسطے نکلتی ہے، اگر اپنی گاڑی ہے تو خود ہی ڈرائیو کرتے ہوئے اور اگر اپنی گاڑی نہیں ہے تو سواری بدلتے ہوئے ملازمت پر آفس پہنچتی ہے۔ گویا روزانہ دو گھنٹے اپنے دفتر پہنچنے میں اور واپسی میں دو گھنٹے لگتے ہیں، کل چار گھنٹے اسی میں نکلتے ہیں، اور ملازمت کا چھ یا آٹھ گھنٹے کا جو وقت ہوتا ہے وہ الگ رہا، گویا دس یا بارہ گھنٹے ماں کے اس طرح گزرتے ہیں، اور یہاں بچوں کو ''بچہ گھر'' (Children Home) میں رکھ دیا جاتا ہے، وہاں کی ماہانہ ایک، ڈیڑھ ہزار ڈالر فیس ہوتی ہے، وہ ادا کر دیجئے اور بچے کو ان کے حوالہ کر دیجئے۔ وہاں جو عورتیں تنخواہ لے کر کام کاج کریں گی، وہ ماں کی شفقت کہاں دیں گی؟ محبت اور توجہ سے تربیت تھوڑے ہی کریں گی، اس طرح بچے اپنے ماں باپ کی شفقت و محبت سے محروم رہتے ہیں۔

اراکین دارالامراء کا رپورٹ

حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم نے بتلایا کہ انگلینڈ میں ابھی تازہ شمارہ میں انہوں نے پڑھا کہ وہاں کی دارالامراء (راجیہ سبھا) کے کچھ اراکین کی ایک کمیٹی وہاں کی معاشرت کا جائزہ لینے کے لئے بنی تھی، انہوں نے جو رپورٹ پیش کی اس میں انہوں نے سفارش کی ہے کہ ہمارے یہاں یہ قانون لازمی طور پر پاس کیا جائے

کہ ماں ہفتہ میں کم سے کم چار دن گھر میں رہے، وہ اگر گھر میں رہے گی تو بچوں کو محبت ملے گی اوران کی تعلیم وتربیت میں کچھ حصہ ملے گا؛ ورنہ پھر ہمارے معاشرہ میں آئندہ اور زیادہ بگاڑ آئے گا جس کا بہت بڑا خطرہ ہے۔

ان کے پاس کوئی حل نہیں ہے

ایک صاحب جو ہمارے محبت والے ہیں انہوں نے کل ہی بتلایا کہ امریکہ میں اس وقت بہت غوروفکر کرنے کے بعد یہ طے ہوا کہ چونکہ بیوی بھی کمارہی ہے اورشوہر بھی اپنا کمارہا ہے، اس لئے دونوں اپنا اپنا گھر بنائیں، بیوی اپنے گھر میں رہے اورشوہراپنے گھر میں رہے، آٹھ دن شوہر بیوی کے گھر جاکر رہے اور دوسرے آٹھ دن بیوی شوہر کے گھر جاکر رہے۔ایسی تدبیریں چلتی رہتی ہیں، لیکن معاشرت کو درست کرنے کا کوئی حل ان کے پاس نہیں ہے، اورکوئی حل کبھی ملنے والا بھی نہیں ہے۔

وہ باریک بیں اور باخبر ہے

خالقِ کائنات جس نے سب کو پیدا کیا وہی سب سے زیادہ واقف ہے ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ جو پیدا کرنے والا ہے وہ سب کچھ جانتا ہے۔مثلاً آپ نے کوئی چیز بنائی، اس میں کیا خوبی اورکمال ہے اور کیا کمی اور کمزوری ہے، اس کو آپ بخوبی جانتے ہیں جب بنانے والا ہی جانتا ہے تو وہی اس کا علاج بھی کرے گا اور وہی اس کا صحیح طریقہ استعمال بھی بتلائے گا، اگراس کے مطابق آپ نے اس چیز کواستعمال کیا تب تو ٹھیک ہے، ورنہ پھر گڑبڑ شروع ہوجائے گی۔تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، انسان کی دو صنف ہیں، مرد اور عورت، دونوں کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور دونوں

میں کیا خوبیاں اور کیا نقائص ہیں کس میں کیا کمال ہے اور کس کی کیا کمزوری ہے؛ وہ اللہ تعالیٰ بخوبی جانتے ہیں، اسی کے مطابق اس نے احکامات دیئے ہیں ﴿وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾ یہاں اللہ تعالیٰ کی جو صفت بیان فرمائی ہے اس کو سوچ کر وجد آ جاتا ہے۔ فرمایا کہ وہ باریک بیں اور باخبر ہے۔ انسانی مشین میں کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اور اسی کے مطابق اس نے حکم دیا ہے۔ اگر اس کے حکم کے مطابق چلو گے تب تو سب کچھ برابر رہے گا؛ ورنہ پھر گڑبڑ شروع ہو جائے گی۔

بہر حال! اسلام نے جو طریقۂ زندگی پیش کیا ہے اور معاشرت کا جو انداز انسانیت کو بتلایا ہے؛ وہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے، اگر اس کے مطابق معاشرت ہوگی، تب تو ٹھیک ہے؛ ورنہ پھر تکالیف پیش آئیں گی۔

تعددِ ازواج پر اعتراض کیوں؟......

دوسری آیت میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا أَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ، وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ اگر کسی آدمی نے ایک سے زیادہ بیویاں کی ہیں تو ہر ایک کے ساتھ ان کے حقوق میں برابری ضروری ہے۔ درمیان میں ایک بات یاد آئی تو مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کو پیش کر دوں۔

دیکھئے! اسلام نے چار بیویاں کرنے کی اجازت دی ہے، اسلام کا یہ حکم بھی آج کل لوگوں کے لئے اعتراض کی چیز بن گئی ہے کہ اسلام میں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت ہے۔ حالانکہ تنور کیس اور مدگل کیس وغیرہ جو سپریم کورٹ میں چلے اور مسلم پرسنل لاء کا معاملہ زیرِ غور آیا تو اس میں ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ یہ ایک فطری حکم ہے، اس لئے کہ

اگر دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہیں دی گئی اور پہلے سے جو بیوی ہے اس کو چھوڑنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی؛ تو پھر شوہر اس کو تنور میں نہیں جھونکے گا تو اور کیا کرے گا؟

اور اسلام معاشرہ میں زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ بتلاتا ہے۔ بعض مرتبہ ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ دوسری بیوی کی ضرورت پیش آتی ہے مثلاً عورت ایسی بیماری میں مبتلا ہوگئی کہ اب وہ مرد کے لئے فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں رہی تو اب شوہر کیا اس عورت کو چھوڑ دے؟ اس کو ایسے حالات میں چھوڑ دینے کو بھی شرافت گوارا نہیں کرتی، لہٰذا اس کو رہنے دو، لیکن مرد کی ضرورت کا اب کیا کیا جائے؟ تو شریعتِ مطہرہ نے اس کے لئے دوسرا نکاح کرنے کی اجازت دی ہے۔

یہ کہاں کا انصاف ہے؟

لیکن ان کے یہاں تو کسی بھی حیثیت سے دوسرے نکاح کی اجازت ہی نہیں ہے ہاں! ان کے یہاں ایک شکل ہے کہ کسی عورت کے ساتھ friendship قائم کر لیجئے یعنی دوستی کا معاہدہ کر لیجئے، لیکن اس عورت کو بیوی ہونے کے حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔ وہ عورت اس مرد کے ساتھ زندگی گزارے گی اور یہ مرد اس سے فائدہ بھی اٹھائے گا، اور اگر اس سے بچے پیدا ہوں گے تو ان بچوں کو وراثت بھی ملے گی، لیکن اگر یہ مرد مر جائے گا تو اس عورت کو وراثت میں حصہ نہیں ملے گا۔ اب غور کیجئے کہ یہ کونسے انصاف کی بات ہے۔ یہ عورت بھی آخر اس مرد کو راحت پہنچا رہی ہے، ایک عورت کی طرف سے مرد کو جو ضرورتیں ہوتی ہیں وہ تمام یہ مہیا کر رہی ہے، اس سے پیدا ہونے والی اولاد بھی اس کی شمار ہوتی ہے، پھر ان کو سگی اولاد کی طرح وراثت میں حصہ بھی مل رہا ہے؛ تو پھر آخر اس عورت کو کیوں حصہ نہ ملے؟ انسانوں کے بنائے ہوئے تمام قوانین کا یہی حال ہوتا ہے، حالانکہ اسلام کے

قوانین پر اعتراضات کرتے ہیں لیکن ان کے پاس جو مشکلات ہیں ان کا کوئی بھی حل ان کے پاس ہے ہی نہیں۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب دامت برکاتہم (رحمۃ اللہ علیہ) نے احمد آباد میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اجلاس میں کسی فرانسیسی عورت کا نام لیا تھا جس نے عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں بہت کچھ مطالعہ، تحقیق اور اسٹڈی کی تھی، اس عورت نے کہا کہ یہ فطرت کا تقاضہ ہے اور اس میں عورتوں کا بھی فائدہ ہے کہ مرد کو ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت قانونی طور پر دی جائے۔ اور بھی بہت تفصیل فرمائی تھی، یہ ساری چیزیں تسلیم کرنے کے باوجود بھی اسلامی قوانین پر اعتراض ہے، تو اب کسی کو کیا کہا جائے۔

ایک مغالطہ اور اس کا ازالہ

بہر حال! اسلام میں ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ حکم بھی دیا ہے کہ انصاف سے کام لو، عدل و مساوات اور سب کے ساتھ برابری ہونی چاہیے اب برابری کا جو حکم دیا ہے اور انصاف کے تقاضوں کو مدنظر رکھنے کی جو تاکید کی گئی ہے، اسی سلسلہ میں ایک بات کی طرف قرآنِ پاک نے اشارہ کر دیا چونکہ وہ بھی انصاف و برابری کے ذیل ہی میں آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر تم چاہو تب بھی پورے طور پر عورتوں کے درمیان انصاف اور برابری نہیں کر سکتے۔ اس آیت سے بعض نادان جو اپنے آپ کو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بہت زیادہ اسٹڈی کرنے والے ہیں، انہوں نے ایک اور بات نکالی کہ دیکھو! قرآن میں یوں ہے کہ تم چاہو تب بھی عورتوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے، اور ایک سے زیادہ کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی گئی ہے کہ انصاف کرو اور چونکہ انصاف کر ہی نہیں سکتے لہٰذا ایک سے زیادہ بیویاں کرنا جائز نہیں ہے۔

انہوں نے توڑ پھوڑ کر یہ مطلب نکال لیا، لیکن قرآنِ کریم جو بات صاف کہہ رہا ہے وہ ان کو نظر نہیں آتی، قرآن ہی میں یہ آیت بھی ہے ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ یہ آیت ان کو نظر نہیں آئی۔

حالانکہ اُس آیت کا مطلب کیا ہے وہ مَیں عرض کرتا ہوں کہ شوہر بحیثیت شوہر کے عورت کو جو کچھ دیتا ہے اور اس کے جو حقوق ادا کرتا ہے، وہ دو طرح کے ہیں، ایک تو وہ ہیں جن میں طبعی اور فطری طور پر شوہر انصاف کے تقاضوں کو پورا کرسکتا ہے مثلاً نان نفقہ کسوہ سکنٰی جس کو ہم اردو میں کھانا پینا، کپڑا لتہ، رہائش کا انتظام، تحفہ اور ہدیہ دینا وغیرہ وغیرہ کہتے ہیں، ان تمام چیزوں میں برابری ہوسکتی ہے، اس میں کوئی اشکال کی بات نہیں ہے۔ جیسا گھر ایک کو دیا، دوسری کو بھی ویسا ہی دے سکتے ہیں۔ جیسا فلیٹ ایک کو بنا کر دیا؛ ویسا ہی دوسری کو بھی بنا کر دیجئے۔ جو فرنیچر ایک کو دیا؛ دوسری کو بھی دو۔ ایک ہی انٹیریر کو آرڈر دو کہ ایک ہی طرح کا فرنیچر (Same to Same) دونوں فلیٹوں میں لگا دیجیو۔ یہ سب ہوسکتا ہے۔ اسی طرح کپڑوں میں بھی ہوسکتا ہے کہ ایک جیسے دونوں کے لئے سلوا دیئے، یا برابر رقم دونوں کو دیدی کہ اپنی اپنی پسند سے بنالینا۔ یہ اور اس جیسی چیزیں تو وہ ہیں جن میں کوئی آدمی اگر برابری کرنا چاہے تو کرسکتا ہے، اور اگر نہ کرنا چاہے تو پھر دوسری بات ہے۔

محبت تو غیر اختیاری چیز ہے

اور بعض چیزیں ایسی ہیں جو آدمی کے اختیار کے ساتھ تعلق نہیں رکھتیں، بلکہ اس کی طبیعت کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، مثلاً کسی کے ساتھ محبت کا زیادہ ہونا اور کسی کے ساتھ کم ہونا، کوئی آدمی چاہے کہ دونوں کے ساتھ محبت برابر رکھے؛ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

اس لئے کہ محبت تو غیر اختیاری چیز ہے، دل کا کسی کی طرف مائل ہونا اختیار کی چیز نہیں ہے۔ اور محبت کی کمی بیشی جن بنیادوں پر ہوا کرتی ہے وہ بنیادیں بھی ہمارے اختیار میں نہیں ہیں۔ کسی کی خوبی کی وجہ سے، کسی کے حسن کی وجہ سے، کسی کے کمال کی وجہ سے، کسی کے اچھے اخلاق کی وجہ سے محبت زیادہ ہوتی ہے۔ کسی میں کوئی کمال ہوتا ہے اور کسی میں کوئی دوسری خوبی ہوتی ہے۔ جس طرح سب کے چہرے یکساں نہیں؛ اسی طرح سب کے اوصاف بھی یکساں نہیں۔ سب کی خوبیاں ایک طرح کی نہیں۔ ہر ایک کی عادتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے کسی کے ساتھ محبت زیادہ ہوتی ہے، اور کسی کے ساتھ کم ہوتی ہے۔ اس میں آدمی کے اختیار کو دخل ہی نہیں۔ وہ اگر چاہے تب بھی برابری نہیں کرسکتا۔ یہ سیدھی سادی بات ہے۔

اسی طرح صحبت کرنے کا معاملہ آتا ہے، تو صحبت کا تعلق بھی آدمی کی طبیعت کے نشاط سے ہے، گزشتہ کل جس کی باری تھی اس وقت طبیعت میں نشاط تھا اور آپ کو بھی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کے ساتھ صحبت کی۔ اب ضروری تو نہیں ہے کہ دوسرے روز دوسری کی باری کے وقت بھی طبیعت کے اندر نشاط ہو، اگر ضرورت محسوس نہیں ہوتی تو آج کل جو گولی ویاگرا ([illegible]) نکلی ہے، وہ لینا ضروری نہیں ہے، بلکہ یہ تو طبیعت کی آمادگی سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ (اس جملے سے حاضرینِ مجلس بہت محظوظ ہوئے)

اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے......

بہرحال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ عورتوں کے حقوق سے تعلق رکھنے والی بعض چیزیں تو وہ ہیں جن کے اوپر آدمی کا بس نہیں چلتا اور وہ آدمی کے اختیار میں بھی نہیں ہیں۔ اسی لئے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ازواجِ مطہرات کے حقوق کی ادائیگی

میں برابری کرنے کے ساتھ ساتھ دعا بھی فرماتے تھے ﴿أَللّٰھُمَّ ھٰذَاقَسْمِیْ فِیْمَا أَمْلِکُ، فَلا تَلُمْنِیْ فِیْمَا تَمْلِکُ وَلاأَمْلِکُ﴾ اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے ان چیزوں میں جو میرے اختیار میں ہیں اور جن کا مَیں مالک ہوں یعنی جن میں مَیں برابری کرسکتا ہوں، پس تو میری پکڑ نہ کیجیو ان چیزوں میں جن کا تو مالک ہے (یعنی محبت) اور وہ میرے اختیار میں نہیں ہے (ابوداود شریف، ۲۱۳۶)

اسی بات کو اس آیت کے اندر بیان کیا گیا ہے ﴿وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْا أَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَلَوْحَرَصْتُمْ﴾ اور عورتوں کے درمیان ہرگز تم پورا پورا انصاف نہیں کرسکو گے اگر چہ تم خود چاہو جیسا کہ ابھی مَیں نے تفصیل سے ذکر کیا کہ تم چاہو تب بھی ان چیزوں میں برابری نہیں کرسکو گے، اس لئے کہ وہ غیر اختیاری چیزیں ہیں۔ آگے باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿فَلاتَمِیْلُوْا کُلَّ الْمَیْلِ فَتَذَرُوْھَاکَالْمُعَلَّقَةِ﴾ اس لئے ایسا نہ کیجیو کہ ایک ہی طرف پورے پورے جھک جاؤ یعنی ایک کی محبت کے نتیجہ میں سب کچھ اسی کے حصے میں آرہا ہے، اور دوسری بے چاری کا معاملہ بالکل معلق کررکھا ہے، اگر میلان ومحبت میں انصاف نہ ہوسکے تو کوئی بات نہیں، لیکن کھانے پینے، کپڑے، نفقہ میں اور دوسری چیزوں میں تو انصاف کرو۔

جیسا گناہ؛ ویسی سزا

آخرت میں جو سزائیں ہیں ان میں گناہ کی نوعیت کو مدِ نظر رکھا جائے گا، جیسا گناہ ہوگا ویسی ہی سزا ہوگی۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ اگر کسی آدمی کی دو بیویاں ہوں گی اور ان میں سے ایک کی طرف جھک گیا اور دوسرے کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی، تو قیامت کے روز ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کا آدھا دھڑ (بدن کا آدھا حصہ) لقوہ

(فالج) شدہ ہوگا (ابوداود شریف،۲۱۳۳) یعنی وہ ایک کی طرف مائل ہوا تھا تو میدانِ حشر میں اس طرح آئے گا کہ بدن کے آدھے حصے پر لقوہ ہوجائے گا، پھر آگے کی سزا تو الگ رہے گی۔

"کَالْمُعَلَّقَةِ" کی تفسیر

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ﴿کَالْمُعَلَّقَةِ﴾ کی تفسیر بخاری شریف میں منقول ہے کہ اس بے چاری کو ایسا بنادیا کہ نہ تو اس کو بغیر شوہر کا کہہ سکتے ہیں، اس لئے کہ اگر بغیر شوہر کی ہوتی تو وہ نکاح کرسکتی تھی، لیکن وہ تو ایک شوہر کے نکاح میں ہے اس لئے بغیر شوہر کی بھی نہیں ہے۔ اور نہ شوہر والی کہی جاسکتی ہے یعنی شوہر والی عورت کا تو شوہر حق ادا کرتا ہے اور اس کو محبت دیتا ہے، یہ بے چاری اس سے بھی محروم ہے۔ تو اس کو نہ تو شوہر والی کہہ سکتے ہیں اور نہ بغیر شوہر والی کہہ سکتے ہیں۔ (بخاری شریف،۴۶۰۰)

ازدواجی تعلقات کی درستگی کا راز

آیت کا یہ ٹکڑا پوری بات کا مین پوئنٹ (Main Point) ہے ﴿وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا﴾ تم حالات کو ٹھیک کرو، حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کرو اور درستگی کا خیال رکھو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ نکاح والی زندگی میں ازدواجی تعلقات کی درستگی کے لئے جو خاص تاکید فرمائی ہے وہ یہی ہے۔ نکاح کے خطبہ میں جو تین آیتیں پڑھی جاتی ہیں ان میں بھی یہی بات ہے ﴿یَاأَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ﴾ ﴿یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ ﴿یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا﴾ ان تینوں جگہوں پر تقویٰ کا حکم اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی تاکید فرمائی ہے، جب دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر ہوگا تو وہ تمام حقوق ادا کرے گا۔

اپنی لڑکی کس کو دوں؟

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ مَیں اپنی لڑکی کس کو دوں؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ ایسا لڑکا ڈھونڈو جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو، اس لئے کہ اگر وہ اس کے ساتھ محبت کرے گا تو اس کا حق ادا کرے گا ہی۔ لیکن اگر وہ اس لڑکی کو پسند نہیں کرے گا اور اس سے محبت نہیں کرے گا؛ تب بھی اللہ کے ڈر کی وجہ سے اس کی حق تلفی بھی نہیں کرے گا۔ نکاح کے اندر دینداری کو اختیار کرنے کی تاکید اسی وجہ آئی ہے۔ بہر حال! تقویٰ بنیادی چیز ہے۔

میاں بیوی کے تعلقات کے اندر بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو لوگوں کے سامنے کھولی نہیں جاسکتیں، بلکہ گھر والوں کے سامنے بھی نہیں کھولی جاسکتیں، خاندان والوں کے سامنے بھی ان کا اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ جب ماں باپ کے سامنے بھی زبان نہیں کھلتی، تو پھر باہر والوں کی بات تو دور رہی، اس لئے جب تک تقویٰ نہیں ہوگا؛ تب تک بات نہیں بنے گی۔

انسانی فطرت کا لحاظ

دیکھو! شریعت نے انسانی فطرت کا کتنا لحاظ کیا ہے۔ ابوداود شریف کی روایت ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شوہر اپنی بیوی کی کسی بات پر اگر ناراض ہوا اور بیوی کی پٹائی کی؛ تو اس سے یوں مت پوچھنا کہ کیوں مارا (ابوداود شریف، ۲۱۴۹) حضور ﷺ نے یہ تاکید فرمائی کہ اس سے پوچھا نہ جائے، اس لئے کہ کوئی ایسی بات ہوسکتی ہے جو بیان کرنے کے قابل نہ ہو۔ کوئی بچے کی پٹائی کرے اور پوچھا جائے تو اس کی وجہ بتلائی

جاسکتی ہے، لیکن بیوی کی پٹائی کی ہے اور وجہ بتائی جائے یہ ضروری نہیں ہے۔ وہاں ہر چیز بتانے کی نہیں ہوتی، بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ نبی کریم ﷺ نے بھی اپنی تعلیمات میں فطری تقاضوں کا اتنا زیادہ لحاظ کیا ہے کہ شوہر بیوی کی پٹائی کرے تو اس سے پوچھا نہ جائے۔

﴿وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ اگر تم درستگی کا خیال رکھو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو یعنی محبت کے فطری طور پر کم اور زیادہ ہونے کے باوجود تمام بیویوں کے ساتھ خرچہ وغیرہ میں اور حقوق کی ادائیگی میں مساوات کا اہتمام کرتے رہو اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے بھی رہتے رہو، پھر بھی اگر غیر اختیاری طور پر تمہارا دل کسی ایک کی طرف زیادہ مائل ہے؛ تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے اور مہربانی کرنے والے ہیں۔

آیتوں کے بارے میں یہ کچھ تفصیل تھی، آگے روایتیں پیش فرماتے ہیں۔

یہ میری وصیت ہے

۲۷۳. عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ خَيْرًا، فَاِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ، وَاِنَّ أَعْوَجَ مَافِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ. فَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهُ كَسَرْتَهُ، وَاِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ. (متفق عليه)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عورتوں کے معاملہ میں میری طرف سے حسنِ سلوک اور بھلائی کی تاکید اور نصیحت قبول کرو، اس لئے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی میں بھی سب سے ٹیڑھا حصہ اوپر والا ہوتا ہے، اگر تم اس کو سیدھا کرنے جاؤ گے تو توڑ ڈالو گے اور اگر اس کو یوں ہی چھوڑ دو گے تو اور زیادہ ٹیڑھی ہوتی چلی جائے گی، اس لئے عورتوں کے معاملہ میں میری طرف سے حسنِ سلوک کی تاکید اور وصیت قبول کرو۔

وفی روایۃ فی الصحیحین: اَلْمَرْأَۃُ کَالضِّلَعِ ، اِنْ أَقَمْتَھَا کَسَرْتَھَا ، وَاِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِھَا، اِسْتَمْتَعْتَ وَفِیْھَا عِوَجٌ.

صحیحین کی روایت میں ہے کہ عورت پسلی کی طرح ہے، اگر تم نے اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کی تو توڑ ڈالو گے، اور اگر ٹیڑھے پن کے ساتھ ہی اس سے فائدہ اُٹھایا تو خوب فائدہ اُٹھاؤ گے۔

وفی روایۃلمسلم : اِنَّ الْمَرْأَۃَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ ، لَنْ تَسْتَقِیْمَ لَکَ عَلیٰ طَرِیْقَۃٍ ، فَاِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِھَا، اِسْتَمْتَعْتَ وَفِیْھَا عِوَجٌ ، وَاِنْ ذَھَبْتَ تُقِیْمُھَا کَسَرْتَھَا وَ کَسْرُھَا طَلَاقُھَا.

مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ یقیناً عورت پسلی سے پیدا ہوئی ہے، ہر وقت تمہارے ساتھ ایک ہی طریقہ سے پیش نہیں آتی، اس لئے اگر ٹیڑھے پن کے ساتھ ہی اس سے فائدہ اُٹھایا تو خوب فائدہ اُٹھاؤ گے، اور اگر اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو توڑ ڈالو گے، اور توڑنا طلاق ہے۔

افادات: -اس روایت میں حضورِ اکرم ﷺ مردوں کو عورتوں کے ساتھ بھلائی اور حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آنے کی خاص تاکید فرما رہے ہیں۔ اور وہ نصیحت جو بڑی تاکید اور اہمیت کے ساتھ کی جاوے؛ اس کو وصیت کہتے ہیں۔ ویسے یہ بھی نصیحت کا ہی ایک حصہ اور قسم ہے، لیکن بڑے اہتمام کے ساتھ جو نصیحت کی جاتی ہے اس کو وصیت کہتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ عورتوں کے معاملہ میں بھلائی سے پیش آنے کی تاکیدی نصیحت قبول کرو۔

’’عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے‘‘ کا مطلب

اس لئے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ پسلی سے پیدا ہونے کا مطلب شراح حدیث نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حوا کو حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا کیا تو گویا تمام عورتوں کی بنیاد حضرت حوا ہیں جو پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔ اور پسلی

میں بھی سب سے ٹیڑھا حصہ اوپر والا ہوتا ہے (فتح الباری) یکھو! کوئی بھی ٹیڑھی چیز ہو، اس کا ٹیڑھا پن اس کے اخیری حصہ پر سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے، گجراتی میں کہاوت ہے (પાઘડી નો વળ છેડે) کسی چیز کا ٹیڑھا پن بتلانے کے لئے یہ جملہ بولا جاتا ہے، کسی بھی چیز کا اگر درمیانی حصہ ٹیڑھا ہو تو سیدھا کرنے سے کچھ دیر کے لئے وہ سیدھا ہو جائے گا، لیکن اوپر جا کر اس کی کجی سب سے زیادہ نمایاں ہوگی۔

خیر! عورت پسلی سے پیدا ہوئی اور اس کا سب سے ٹیڑھا حصہ اوپر والا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ تو بعض حضرات فرماتے ہیں کہ انسان کے جسم میں اوپر کا حصہ چہرے کا ہے، وہ مراد ہے، گویا عورت کی زبان کے اندر ٹیڑھا پن بہت زیادہ ہوتا ہے۔

اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا دماغ مراد ہے یعنی ٹیڑھے دماغ اور ٹیڑھی کھوپڑی کی ہوتی ہیں۔ تو پسلی کے اندر سب سے زیادہ کجی والا حصہ اوپر والا ہے۔

عورت کا ٹیڑھا پن ہی اس کی خوبی ہے

پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ﴾ اگر تم اس کو سیدھا کرنے جاؤ گے تو توڑ ڈالو گے۔ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جب اس حدیث کو کہتے اور سنتے ہیں کہ حضور ﷺ نے عورت کو ٹیڑھی پسلی فرمایا تو اس وقت گویا ہم اس کو عیب کے طور پر بیان کرتے ہیں لیکن نبی کریم ﷺ نے دراصل اس کی فطرت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی دو صنفیں اور دو قسمیں پیدا کی ہیں؛ مرد اور عورت۔ مرد کی کچھ مزاجی کیفیتیں اور خصوصیتیں ہیں اور عورت کی بھی کچھ مزاجی خصوصیتیں ہیں گویا اللہ تعالیٰ نے مرد کی فطرت الگ بنائی ہے اور عورت کی فطرت الگ بنائی ہے۔ یہاں نبی کریم ﷺ عورت کی فطرت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں

اوراس کوپسلی کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں، گویا پسلی کا ٹیڑھا ہونا یہ اس کا عیب نہیں ہے بلکہ فطری ہے،اور یہی اس کا حسن ہے۔اور پسلی کوسیدھا کرنے کے لئے اگر توڑا گیا تو پھر دوبارہ جوڑنے کے لئے اس کوٹیڑھا ہی کرنا پڑے گا،اس کوسیدھی کر کے جوڑنا چاہیں گے تو وہ نہیں جڑے گی۔ جیسے گاڑی کے اندر اسپرنگ (Spring) ٹیڑھی ہی ہوتی ہے، اور اس کا ٹیڑھا ہونا ہی اس کی خوبصورتی ہے،اگر اس کوسیدھی کرنا چاہو گے؛ تو وہ بےکار ہو جائے گی، گویا پسلی کے ساتھ تشبیہ دے کر اس کی خصوصیت کی طرف اشارہ کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتلایا گیا کہ اس کا ٹیڑھا پن اس کے لئے عیب کی چیز نہیں ہے، بلکہ خوبی کی چیز ہے۔

ایک ہی چیز خوبی بھی اور عیب بھی

کوئی چیز ایک صنف کے لئے خوبی کی ہوتی ہے اور وہی چیز دوسری صنف کے لئے عیب کی ہوتی ہے۔ ہمارے مدرسوں کے اندر فارسی کا ایک جملہ بولا جاتا ہے کہ جوشاگرد استاذ کے سامنے نہ بولے؛ اس کو مدرسہ سے نکال دو،اور جو مرید شیخ کے سامنے بولے؛ اس کو خانقاہ سے نکال دو۔ پڑھنے والے طالبِ علم کے لئے کمال یہ ہے کہ وہ بولے اور سوالات ہی کرتا رہے کہ یہ کیوں اور ایسا کیوں؟ چپ چاپ بیٹھا رہے یہ اس کے لئے بری صفت ہے اور مرید کا شیخ کے سامنے بولنا بری صفت ہے، یہ اس کے حق میں عیب اور گستاخی شمار ہوتا ہے۔اس لئے ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چیز ایک کے حق میں خوبی ہو اور وہی دوسرے کے حق میں عیب ہو۔

مرد کی خوبی الگ،عورت کی جدا

مرد کو دنیا کے اندر کاروبار کرنا ہے،معاملات کوسنبھالنا ہے،اس لئے مرد کے حق

میں غافل ہونا اور جاہل ہونا یہ عیب ہے، کیونکہ دنیا کے حالات سے بے خبر ہوگا تو معاملات کو کیسے سنبھالے گا، لیکن عورتوں کے حق میں غافل ہونا خوبی کی چیز ہے، قرآنِ پاک میں موجود ہے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغَافِلاتِ الْمُؤْمِنَاتِ﴾ وہ لوگ جو تہمت لگاتے ہیں ان عورتوں پر جو پاک دامن ہیں اور غافلات یعنی بے خبر ہیں اور ایمان والیاں ہیں۔ معلوم ہوا کہ عورتوں کو بے خبر ہونا چاہیے یعنی دنیا کے معاملات سے بے خبر ہونا اور گھر کے اندر کے معاملات سے باخبر ہونا چاہیے جیسے بچوں کی تربیت اور پرورش وغیرہ امور سے تو واقف ہونا چاہیے، لیکن باہر کی چیزوں سے بے خبر ہونا ان کے حق میں خوبی کی بات ہے، جو عورت باہر کے معاملات اور چیزوں سے جتنی زیادہ باخبر ہوگی، اتنا ہی اس کے حق میں عیب کی بات ہے، اور شوہر کے لئے بھی دردِ سر ہے۔ دیکھو! قرآنِ پاک نے عورتوں کے لئے ﴿غَافِلاتٌ﴾ کا وصف خوبی کے طور پر استعمال کیا ہے، مرد کے لئے یہ وصف استعمال نہیں کیا۔

برائی کے انداز میں تعریف

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جب تہمت لگائی گئی تھی تب نبی کریم ﷺ نے لوگوں سے مشورہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ گھر کی باندی سے پوچھ لیجئے، وہ ان کے بارے میں زیادہ واقف ہوگی۔ لہٰذا حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں آیا کرتی تھیں، ان سے حضورِ اکرم ﷺ نے پوچھا، انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق جو جملہ کہا، مَیں وہ بتلانا چاہتا ہوں، انہوں کہا کہ بس! ان کا حال تو یہ ہے کہ آٹا گوندھ کر روٹی پکائے بغیر سو جاتی ہیں اور بکری آ کر آٹا کھا جاتی ہے یعنی ایسی غافل ہیں اور کوئی چیز ان میں قابلِ گرفت نہیں ہے۔ (بخاری شریف، ۳۹۱۰)

یہ بات جو حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے بیان کی وہ حقیقت میں عیب کے طور پر بیان نہیں کی، بلکہ مدح بمایشبہ الذم کے قبیل سے ہے یعنی کبھی کسی کی تعریف ایسے انداز میں کی جاتی ہے جس سے اس کی مذمت معلوم ہوتی ہو، جیسے کسی کی سخاوت کے بارے میں یوں کہا جائے کہ فلاں میں کوئی عیب نہیں ہے، بس! لوگوں پر اتنی سخاوت کرتا ہے کہ ہمیشہ کڑکا ہی رہتا ہے، یہاں اس کو "کڑکا" کہہ کر قائل نے اس کی برائی بیان کی لیکن درحقیقت وہ اس کی برائی بیان کرنا نہیں چاہتا بلکہ برائی کے انداز میں اس کی تعریف کر رہا ہے۔ جیسے عربی کا ایک شعر ہے:-

لَاعَيْبَ فِيهِمْ غَيْرَأَنَّ سُيُوفَهُمْ ❁ بِهِنَّ فُلُوْلٌ مِنْ قِرَاعِ الْكَتَائِبِ

شاعر کسی قبیلہ والوں کی تعریف کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ ان میں عیب نہیں ہے، بس اتنا ہے کہ ان کی تلواروں کے اندر دشمن کے لشکر سے لڑنے کی وجہ سے دندانے پڑے ہوئے ہیں۔ ویسے تو تلوار کے اندر دندانہ ہونا اور تلوار کا کند ہونا اور اس کی دھار کا ٹوٹا ہوا ہونا عیب کی بات ہے، لیکن اس قبیلہ والوں کی تلوار کی دھاریں اس لئے ٹوٹی ہوئی ہیں کہ وہ ہمیشہ دشمن کے لشکروں سے ٹکراتی ہی رہتی ہیں۔ گویا یہاں تعریف ایسے انداز میں کی گئی ہے جو برائی معلوم ہوتی ہے۔

ٹیڑھاپن تو اس کی فطرت ہی ہے

بہرحال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ یہ جو فرمایا ہے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی تو درحقیقت یہ اس کے لئے خوبی کی چیز ہے، اب مرد کو یہ تاکید کی گئی کہ تم یہ نہ سوچنا کہ یہ میرے جیسی بن جاوے۔ گڑبڑ یہیں سے پیدا ہوئی کہ یہ وصف عورت کے حق میں برائی کے طور پر بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں

ہے۔اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگرتم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو توڑ ڈالو گے یعنی جدائی کی نوبت آجائے گی، یہ ٹیڑھا پن تو اس کی فطرت ہی ہے، پسلی کی فطرت ہی ٹیڑھی ہوتی ہے، پسلی کو سیدھا کرنے جائیں گے تو وہ ٹوٹ جائے گی، اگر اس کو درست کرنا ہے تو ٹیڑھی رکھتے ہوئے ہی درست کرو؛ تب ہی درست ہوگی۔

فطری کج ادائیوں کے ساتھ ہی زندگی بسر ہوگی

پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر اس کو یوں ہی چھوڑ دوگے تو اور زیادہ ٹیڑھی ہوتی چلی جائے گی، اس لئے اس پر نگرانی تو ضرور کرنی پڑے گی، اس کو ایک دم سے اس کے حال پر بھی نہیں چھوڑ دینا ہے، لیکن ایک دم سیدھا بھی کرنے کی کوشش نہیں کرنی ہے؛ ورنہ معاملہ گڑبڑ میں پڑ جائے گا۔اس لئے آپ یوں نہ سوچیے کہ مَیں جیسا ہوں ویسی ہی یہ بھی بن جائے، بلکہ اس کی فطری کج ادائیوں کو برداشت کرتے ہوئے آپ اس کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہیں گے؛ تب ہی زندگی بسر ہوگی۔ ورنہ جب آپ سے کج ادائیاں برداشت نہیں ہوتیں تو پھر یہ طے کرلیجئے کہ ہمیں شادی کرنی ہی نہیں ہے۔﴿فَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ﴾ حضور ﷺ پھر سے فرماتے ہیں کہ عورتوں کے حق میں میری طرف سے بھلائی کی تاکیدی نصیحت قبول کرو۔

جیسا چل رہا ہے چلنے دو

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے ایک اور اشارہ مستنبط کیا ہے، بڑی حکمت کی بات فرمائی ہے۔اور یہ مَیں اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ آج کل یہ بھی ایک بیماری عام ہے کہ دنیا کے اندر کوئی اچھا بھلا نیکی اور بھلائی کا نظام چل رہا ہے

اوراس میں کچھ کمی بھی ہے مثلاً کوئی ادارہ اور مدرسہ ہے،مکتب یا مسجد کا مینجمنٹ (Management) ہے، یہ سب کام چل رہے ہیں،لیکن ان میں کچھ کمی بھی ہے، اب اگر آپ اس کمی کو بالکل دور کرنا چاہیں گے تو یہ جس طرح چل رہا ہے وہ بھی ختم ہوجائے گا۔حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح چل رہا ہے اسی طرح اس کو چلتے رہنے دو؛ تاکہ اس سے جو فائدہ ہورہا ہے وہ ہوتا رہے،آپ اصلاح کے جذبہ میں آکر اور درستگی کا علَم اُٹھا کر میدان میں آئیں گے اور اس نظام کو ختم کردیں گے،تو تھوڑا بہت جو کام ہورہا ہے وہ بھی ختم ہوجائے گا۔

ہر ایک ہی اپنے آپ کو اصلاحی کہتا ہے

بہت سی مرتبہ یہ ہوتا ہے کہ صرف لیبل اصلاح کا ہوتا ہے،حالانکہ ہر اصلاح قابلِ قبول بھی نہیں اور ہر اصلاح مطلوب بھی نہیں۔قرآنِ پاک میں آیا ہے،منافقین کہا کرتے تھے ﴿وَاِذَاقِیْلَ لَهُمْ لَاتُفْسِدُوْافِی الْأَرْضِ قَالُوْااِنَّمَانَحْنُ مُصْلِحُوْنَ﴾جب منافقین سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فسادات مت پھیلاؤ اور گڑبڑ مت کرو،تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرتے ہیں ﴿اِنَّمَانَحْنُ مُصْلِحُوْنَ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿أَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّایَشْعُرُوْنَ(سورۂ بقرہ.۱۲)﴾ سنو!وہی اصل میں فساد مچانے والے ہیں لیکن وہ نہیں سمجھتے،وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ ہم اصلاح کررہے ہیں۔دنیا میں کون ہے جو اپنے متعلق یہ کہتا ہو کہ مَیں فسادی ہوں،ہر ایک ہی اپنے آپ کو اصلاحی کہتا ہے، لیکن اس کا فیصلہ اپنی ذات سے نہیں کرنا چاہیے،بلکہ فیصلہ تو اہلِ صلاح اور سمجھ دار لوگ کریں گے۔یہ دیکھو کہ اہل اللہ اور نیک لوگ ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، انہیں کی رائے معتبر ہے،ورنہ دنیا میں اپنے متعلق کوئی بھی برائی کا خیال نہیں رکھتا۔

بہرحال! عورتوں کے سلسلہ میں شریعت نے یہ تاکید تو فرمائی کہ ان کو ایسے ہی نہیں چھوڑ دیا جائے بلکہ ان کی نگرانی ہوتی رہے، لیکن اتنا زیادہ تشدد بھی نہ ہو کہ توڑ کی نوبت آجائے۔

آج یہیں بات کو ختم کرتے ہیں، باقی باتیں ان شاء اللہ آئندہ مجلس میں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح سمجھ نصیب فرمائے اور نیکی کی توفیق عطا فرمائے۔

اَلْوَصِيَّةُ بِالنِّسَآءِ

عورتوں کے بارے میں تاکید

مجلس (۳)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی خصوصی تاکید کے سلسلہ میں یہ بیان چل رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی خصوصی تاکید فرمائی ہے۔

شرم کی بات ہے!

۲۷۴. عن عبداللہ بن زمعة رضی اللہ عنہ أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ يَخْطُبُ، وَذَكَرَ النَّاقَةَ وَالَّذِيْ عَقَرَهَا، فَقَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: ﴿اِذِانْبَعَثَ أَشْقَاهَا﴾ اِنْبَعَثَ لَهَا رَجُلٌ عَزِيْزٌ، عَارِمٌ مَنِيْعٌ فِيْ رَهْطِهِ. ثُمَّ ذَكَرَ النِّسَآءَ، فَوَعَظَ فِيْهِنَّ، فَقَالَ: يَعْمِدُ أَحَدُكُمْ فَيَجْلِدُ امْرَأَتَهُ جَلْدَ الْعَبْدِ، فَلَعَلَّهُ يُضَاجِعُهَا مِنْ آخِرِ يَوْمِهِ ثُمَّ وَعَظَهُمْ فِيْ ضِحْكِهِمْ مِنَ الضَّرْطَةِ، وَقَالَ: لِمَ يَضْحَكُ أَحَدُكُمْ مِمَّا يَفْعَلُ؟ (متفق علیه)

حضرت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو وعظ فرماتے ہوئے سنا، آپ نے اپنے اس وعظ میں حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا اور جس نے اس کی کوچیں کاٹ ڈالی تھیں تذکرہ فرمایا۔ اس وقت اس قوم کا سب سے زیادہ بدبخت، بڑا شریر قسم کا آدمی جو اپنے قبیلہ میں بڑا مضبوط اور قوت والا سمجھا جاتا تھا وہ اس اونٹنی کو ختم کرنے کے لئے تیزی سے اُٹھا۔ راوی کہتے ہیں کہ اسی وعظ میں حضور ﷺ نے عورتوں کا بھی تذکرہ فرمایا، چنانچہ عورتوں کے بارے نصیحت فرمائی کہ تم میں سے کوئی آدمی اپنی بیوی کو پیٹنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو غلام کی طرح پٹائی کرتا ہے، اس وقت اس کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ بعد میں اسی کو پہلو میں لے کر سونا ہے۔ اسی وعظ میں کسی کی ریح خارج ہونے پر لوگوں کے ہنسنے کے بارے میں نصیحت فرمائی کہ کوئی آدمی ایسی چیز پر کیوں ہنستا ہے جو خود کو بھی پیش آتی ہے؟

افادات: — حضرت صالح علیہ السلام قومِ ثمود کی طرف بھیجے گئے تھے، ان لوگوں نے معجزہ کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے چٹان سے ایک اونٹنی پیدا کی اور اس اونٹنی کے متعلق ایک تاکید یہ فرمائی کہ اس کے ساتھ کوئی ناروا سلوک نہ کیا جائے۔ وہ اونٹنی قدرت کی خاص

نشانی تھی۔ان لوگوں کے یہاں پانی کی تنگی تھی، ویسے بھی اونٹنی کو پانی کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے، لہٰذا یہ طے کیا گیا کہ ایک روز اونٹنی پانی پیئے گی اور دوسرے روز گاؤں والے پانی لیں گے۔اس اونٹنی کو اتنا پانی درکار تھا کہ سارا پانی ختم کردیتی تھی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں کی یہ ایک آزمائش تھی لیکن وہ لوگ اس اونٹنی کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کرسکے، انہیں میں سے ایک آدمی نے پہلے اس کی کوچیں کاٹ دیں اور پھر اس اونٹنی کو قتل کردیا، قرآنِ پاک میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے ﴿اِذِ انۢبَعَثَ اَشۡقَاهَا﴾ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس وقت اس قوم کا سب سے زیادہ بدبخت بڑا شریر قسم کا آدمی جو اپنے قبیلہ میں بڑا مضبوط اور قوت والا سمجھا جاتا تھا وہ اس اونٹنی کو ختم کرنے کے لئے تیزی سے اُٹھا۔

﴿یَعۡمِدُ اَحَدُکُمۡ فَیَجۡلِدُ امۡرَاَتَهٗ جَلۡدَ الۡعَبۡدِ، فَلَعَلَّهٗ یُضَاجِعُهَا مِنۡ آخِرِ یَوۡمِهٖ﴾ تم میں سے کوئی آدمی اپنی بیوی کو پیٹنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو غلام کی طرح اس کی پٹائی کرتا ہے ''غلام کی طرح پٹائی کرنا'' یہ تمثیل کے لئے بولا جاتا ہے، جس سے پٹائی کے بہت زیادہ سخت ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے، جیسے ہم اپنی بول چال میں ''جانور کی طرح مارنا'' بولتے ہیں تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی آدمی اپنی بیوی کو بے رحمی سے پیٹتا ہے اور جس وقت وہ اس کی پٹائی کررہا ہوتا ہے اس کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اس طرح بے رحمانہ پٹائی کرکے مَیں جس شخصیت کا دل توڑ رہا ہوں اور جس کو تکلیف پہنچا رہا ہوں، اسی سے پھر مجھے ایک طرح کی راحت اور سکون حاصل کرنا ہے۔حالانکہ کسی ایسے آدمی سے جب ہمارا کوئی معاملہ پڑتا ہے تو ہم اس کی بہت زیادہ رعایت کرتے ہیں، اس کے مزاج کا خیال رکھتے ہیں یہاں بیوی سے بھی راحت وسکون حاصل کرنے کا بہت بڑا کام ہم لے رہے ہیں، اس کو پہلو میں لے کر سوتے ہیں ﴿یُضَاجِعُهَا﴾ کا مطلب یہی ہے کہ

اس کے ساتھ سوکر راحت حاصل کرتے ہیں، اب جس نے دن میں تو اس کی پٹائی کی اور پھر رات کو اسی کو لے کر سوتا ہے، تو کیا اس کو ذرا بھی شرم نہیں آتی؟ اس کی شرافت کہاں چلی گئی؟ مروت کا تقاضہ کہاں رخصت ہوگیا؟ اس طرح ارشاد فرما کر حضور اکرم ﷺ عورتوں کی پٹائی کرنے سے رُکنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

ایسی حرکت شریف انسان گوارا نہیں کرسکتا

حضور ﷺ نے خصوصی انداز میں عجیب وغریب طریقہ سے سمجھایا کہ جس شخصیت سے تم راحت پا رہے ہو، اسی کو تم پیٹو! یہ مناسب نہیں ہے۔ ایک آدمی آپ کی پٹائی کرے اور پھر تھوڑی دیر بعد آپ ہی سے اپنی کوئی ضرورت پوری کرنا چاہے تو آپ اس کے ساتھ کیا معاملہ کریں گے؟ آپ کے دل میں اس کے متعلق کیسے جذبات موجزن ہوں گے؟ یہاں حضور ﷺ بھی یہی فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی آدمی غلام کی طرح بے رحمی سے اپنی بیوی کی پٹائی کرتا ہے اور پھر اسی کے ساتھ سوتا ہے اور راحت حاصل کرتا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ یہ ایسی حرکت ہے کہ جس کو شریف انسان گوارا نہیں کرسکتا۔

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ عورتوں کے ذریعہ سے ہم شوہروں کو جو راحت ملتی ہے اور جو آرام پہنچتا ہے؛ وہ اتنا زیادہ ہے کہ جس کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ یوروپ اور امریکہ میں ایسا کوئی نظام ہی نہیں ہے کہ بیوی شوہر کی خدمت کرے، اس کو راحت پہنچانے کا انتظام کرے، دونوں اپنے اپنے طور پر اپنی اپنی ضرورتیں پوری کرتے ہیں، قانونی طور پر کوئی ایک دوسرے کو راحت پہنچانے کا پابند نہیں ہے، اور اخلاقی طور پر بھی اس کو ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ وہاں تو ہر چیز کی قیمت لگائی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں اخلاق ومروت کے تقاضوں کے مطابق ایک ایسا اسلامی معاشرہ قائم ہوا ہے کہ جس کے پیشِ نظر عورتیں

خدمتیں کرتی ہیں اورراحتیں پہنچاتی ہیں،اوران کی طرف سے پہنچنے والی راحتیں بےانتہاء ہیں۔

بعض کام عورتیں ہی کرسکتی ہیں

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی تفسیر میں اس آیت ﴿وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً﴾ کے تحت لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے ہی اندر سے تمہارے لئے جوڑے پیدا فرمائے یعنی عورتیں پیدا فرمائیں،تا کہ تم ان کے ذریعہ سے سکون حاصل کرواور تمہارے درمیان محبت اور شفقت کے جذبات پیدا فرمادئے۔

﴿لِتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے لکھا ہے کہ عورتیں گھر کے ایسے ایسے کام انجام دیتی ہیں کہ اگر وہ کام مردوں کو کرنے پڑیں تب پتہ چلے، بچوں ہی کو لے لیجئے کہ بچوں کی پرورش اوران کی نگرانی کرنا،ان کوسنبھالنا؛ یہ عورتوں کا کام ہے اوروہ بڑے صبر وضبط کے ساتھ اپنے اس فریضہ اور ذمہ داری کو انجام دیتی ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ بچہ جب ضد کرتا ہے،اس وقت اس کو بڑی محبت سے سمجھاتی ہے،یہی معاملہ اگر ہمارے حوالہ کیا جائے،تو معلوم نہیں ہم کیا کریں۔

نظام درہم برہم ہوجاتا ہے

ایک صاحب کی بیوی کسی ضرورت سے کہیں گئی ہوئی تھی اور بچے کوشوہر کے حوالہ کرگئی تھی،وہ بچہ چھوٹا چار پانچ مہینے کا تھا،جب وہ اس سے کسی طرح نہیں بہلا تواس نے پٹائی شروع کردی۔ہمارا حال یہ ہے کہ ہم سے توصبر وضبط نہیں ہوسکتا،اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ اس کام کوانجام دیتی ہیں،گھریلو کاموں میں کھانا

پکانا وغیرہ بھی بہت بڑا کام ہے، اگر ایک دن کے لئے عورت گھر میں موجود نہ ہوتو پھر دیکھو کہ نظام کیسا درہم برہم ہوجاتا ہے۔ بستر ٹھیک کرنے کی بھی صلاحیت ہمارے اندر نہیں ہے۔ بہرحال! جتنے بھی کام عورتوں کے ہیں وہ اس انداز کے ہیں کہ ان کے ذریعہ آدمی ایک طرح کا سکون حاصل کرتا ہے۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے

حضرت قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ جب بھی غسل کر کے کپڑے بدلنے ہوتے تھے تو ہمیشہ اہلیہ محترمہ کا یہ معمول تھا کہ نواڑ پائجامہ میں ڈال کر تیار کر دیتی تھی۔ ہمارے یہاں یہ رواج نہیں ہے، یوپی میں رواج ہے کہ پائجامہ جب دھوتے ہیں تو نواڑ نکال دیتے ہیں اور جب پہننے کا وقت آتا ہے تو نواڑ ڈالی جاتی ہے، ہمارے یہاں تو نواڑ ڈالی ہوئی ہی رہتی ہے، اس لئے ہمیں اس بات کا اندازہ نہیں ہے۔

بہرحال! حضرت فرماتے ہیں کہ جب بھی مَیں غسل کر کے فارغ ہوتا تو اہلیہ کپڑے لاتی اور اس میں نواڑ ڈالی ہوئی ہوتی تھی اس لئے زندگی بھر کبھی احساس نہیں ہوا، اہلیہ کے انتقال کے بعد پہلی مرتبہ جب غسل کر کے کپڑے بدلنے کی نوبت آئی اور بہو نے کپڑے بھیجے تو پائجامہ کے اوپر نواڑ رکھی ہوئی تھی، یہ دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ یہ معمولی سی چھوٹی خدمت زندگی بھر وہ انجام دیتی تھی، پوری زندگی جس کام کی نوبت ہی آنے نہیں دی، آج وہ کام مجھے خود ہی کرنا پڑ رہا ہے۔ چھوٹی سی خدمت کی آدمی کو قدر نہیں ہوتی یا اس کی طرف خیال نہیں جاتا۔ غور کیجئے کہ اس چیز کا آدمی کی طبیعت پر کیسا اثر پڑتا ہے اور کیا کیفیت طاری ہوتی ہے۔ تو واقعہ یہ ہے کہ عورتیں ہماری جو خدمات انجام دیتی ہیں، معمولی معمولی خدمتیں ہوتی ہیں جو بڑی قابلِ قدر ہوتی ہیں لیکن ہمیں

ان خدمات کی قدر نہیں ہوتی، جب وہ ہاتھ سے نکل جاتی ہے اس وقت پتہ چلتا ہے کہ یہ چھوٹی سی تھی لیکن بڑی عجیب وغریب چیز تھی اور ان کی قدر بعدِ زوالِ نعمت ہوتی ہے۔

اللہ اور اس کے رسول کی سفارش

اب ان خدمات کے ساتھ ساتھ ان کی طرف سے کوئی بات کجی کی یا طبیعت کے خلاف پیش آئے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پٹائی کردی جائے، بلکہ حدیثِ پاک کے پیش نظر اس کے ساتھ رحم وکرم کا اور شفقت کا معاملہ کیجئے۔ باری تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں ﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ اور حضور ﷺ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی کے اوپر کا حصہ سب سے زیادہ ٹیڑھا ہوا کرتا ہے، اگر تم اس کو سیدھا کرنے جاؤ گے تو وہ ٹوٹ جائے گی، لہٰذا اس سے اسی حالت میں فائدہ اٹھاتے رہو، اور اگر ناگواری کی کوئی بات اس سے سرزد ہو جائے تو درگذر سے کام لو۔ جیسے کسی کا بچہ کم عقل ہو اور عمر بڑی ہونے کے باوجود اس کی سمجھ اتنی نہیں ہے جتنی عام طور پر ہوا کرتی ہے، ایسا بچہ اگر کوئی ایسی حرکت کرتا ہے، تو ہم درگذر کر دیتے ہیں کہ اس کی سمجھ کم ہے، اس سے نادانی کی بات سرزد ہو جایا کرتی ہے، ہمیں اس کے ساتھ شفقت اور رحم وکرم کا معاملہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح یہ بھی ایک ناسمجھ ہے، اس کے ساتھ بھی شفقت اور رحم وکرم کا معاملہ کرنا چاہیے۔

اور یہ بھی سوچو کہ اگر ہماری بیٹی ہو اور اس کی سمجھ اور عقل میں کچھ کمی ہو اور ایسی بیٹی کی شادی کر کے ہم کسی کے یہاں بھیجیں تو ہم کتنا خیال کریں گے، سسرال والوں کو خاص تاکید کریں گے کہ اس کی طبیعت میں ذرا کمزوری ہے، اس کا خیال رکھنا۔ دیکھئے! یہاں اللہ تعالیٰ سفارش کر رہے ہیں اور نبی کریم ﷺ اس کا مزاج بتلا رہے ہیں، اس کے بعد اگر اس کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش آجائے؛ تو ہمیں درگذر سے کام لینا چاہیے۔

اُلٹی چال

اور مَیں تو کہا کرتا ہوں کہ جہاں درگذر کرنی چاہیے ہم وہاں نہیں کرتے اور جہاں نہیں کرنی چاہیے وہاں کرتے ہیں، مثلاً آپ کے کھانے میں نمک کم پڑ گیا تو یہ غلطی معاف نہیں ہوتی، مرچ زیادہ کیوں ہوگئی؟ ہمارے کپڑے برابر کیوں نہیں دھلے؟ وہاں تو پٹائی کا معاملہ کرتے ہیں۔ اور اگر نماز نہیں پڑھتی تو بھولے سے بھی اس کو کچھ نہیں کہیں گے، جہاں کہنا چاہیے؛ وہاں نہیں کہتے اور جہاں درگذر سے کام لینا چاہیے؛ وہاں درگذر سے کام نہیں لیا جاتا

بس! اللہ تعالیٰ نے اسی پر میری مغفرت کردی

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے ملفوظات میں ہے کہ دار العلوم دیوبند جو قائم ہوا اس کی تاریخ میں لکھا ہے کہ اس کے سب سے پہلے استاذ بھی محمود اور سب سے پہلے شاگرد بھی محمود تھے۔ ملا محمود میرٹھ کے رہنے والے عالم تھے، قدیم زمانہ میں عالم کے لئے ''مُلّا'' کا لفظ لگایا جاتا تھا، آج بھی سرحد کے علاقہ میں یہی لفظ بولا جاتا ہے۔ تو پڑھانے والے مُلّا محمود تھے اور ان کے پاس پڑھنے والے حضرت مولانا محمود الحسن صاحب نوراللہ مرقدہٗ تھے جو بعد میں ''شیخ الہند'' کہلائے۔ تو حضرت مفتی شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت مُلّا محمود کو انتقال کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا؟ انھوں نے جواب میں فرمایا کہ ایک روز ایسا ہوا کہ کھچڑی میں نمک کم تھا، دل میں تو آیا کہ بیوی کو تنبیہ کروں کہ نمک کم ہے لیکن پھر مَیں نے سوچا کہ انسان ہے، اندازے سے جو چیز ڈالی جاتی ہے کبھی کم اور کبھی زیادہ

ہو جاتی ہے، کمی بیشی کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس پر مَیں ناگواری کا اظہار کروں اور اس کو کچھ کہوں، اس لئے مَیں نے صبر سے کام لیا، بس! اللہ تعالیٰ نے اسی پر میری مغفرت کر دی۔ انہوں نے صرف تنبیہ کا ارادہ کیا تھا، پٹائی کا نہیں۔

دیکھو! اتنے بڑے عالم تھے اور عملی بڑی بڑی خدمات انجام دی تھیں، لیکن ان میں سے کسی چیز کا وہاں تذکرہ نہیں آیا۔

بیوی کے ساتھ کبھی لہجہ بدل کر بھی بات نہیں کی

حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے خلفاء میں سے ہیں، حضرت کے مجازین میں کراچی میں سب آخر میں انہیں کا انتقال ہوا۔ ان کے متعلق حضرت مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ انہوں نے مجلس میں فرمایا کہ آج ہماری ازواجی زندگی کے ترپین سال (۵۳) سال ہوئے، کبھی بیوی کے ساتھ لہجہ بدل کر بھی بات نہیں کی۔ اندازہ لگایئے کہ پٹائی کرنا اور سخت سست کہنا تو دور کی بات رہی، صرف لہجہ بدل کر بھی بات نہیں کی۔

حضرت مفتی محمد تقی صاحب نے اس پر جو تبصرہ فرمایا ہے وہ واقعۃً ہم سب لوگوں کے لئے قابلِ غور ہے، فرماتے ہیں کہ لوگ کرامتیں ڈھونڈتے ہیں، پانی پر چلنا اور آسمان پر اڑنا؛ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے، یہ ہے مشکل کام کہ ترپین سال (۵۳) کی میاں بیوی کی زندگی میں کیا کبھی کوئی ایسے حالات ہی پیش نہیں آئے ہوں گے؟ ان کی بیوی کوئی آسمان سے اُتری ہوئی حور تو تھی نہیں، اور وہ بھی فرشتہ تو نہیں تھے، ان کے درمیان ناگواری کی باتیں ضرور پیش آئی ہوں گی، اس کے باوجود لہجہ بدل کر بھی بات نہیں کی۔ اس سے ان کے اخلاق واوصاف کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں خوش اخلاقی یہی ہے۔

یہ حضورا کرم ﷺ کے اعلیٰ اخلاق ہیں

روایتوں میں آتا ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ کی دس سال خدمت کی، کوئی کام مَیں نے کیا ہو اس کے متعلق حضور ﷺ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کیوں کیا؟ اور اگر نہیں کیا تو یہ نہیں فرمایا کہ یہ کیوں نہیں کیا (بخاری شریف، ٦٠٣٨) حدیثِ پاک کی تشریح کرنے والے علماء اس موقع پر لکھتے ہیں کہ یہ دراصل حضورا کرم ﷺ کے اخلاق بتلائے جارہے ہیں، اس لئے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ تو نوعمر لڑکے تھے، دس سال کی عمر میں خدمت میں لگے اور دس سال خدمت کی، ظاہر ہے کہ ان کی طرف سے تو ایسی بے شمار باتیں پیش آئی ہوں گی جن پر تنبیہ کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن حضور ﷺ نے کبھی ٹوکا نہیں۔ گویا یہ حضورا کرم ﷺ کے اعلیٰ اخلاق ہیں۔

تو حضرت ڈاکٹر صاحب نے ترپین (۵۳) سال کی زندگی میں کبھی لہجہ بدل کر بات نہیں کی، اس سے ہمیں ان کے اعلیٰ اخلاق کا اندازہ لگانا چاہیے، ورنہ ظاہر ہے کہ بیوی کی طرف سے کوئی نہ کوئی بات تو ضرور پیش آئی ہی ہوگی۔

اپنی بیوی سے پوری زندگی میں پانی بھی نہیں مانگا

ایک اور قدم آگے بڑھاتے ہوئے ان کی اہلیہ خود فرماتی ہیں کہ انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ مجھے پانی دو (اپنی بیوی سے پوری زندگی میں پانی بھی نہیں مانگا) جب ہم نے محسوس کیا کہ ان کو پانی کی ضرورت ہے اور خود پانی لا کر ان کو پیش کیا، وہ دوسری بات ہے، لیکن انہوں نے کبھی مطالبہ نہیں فرمایا۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ خود ہی پوری کرلیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ مَیں تو یوں سمجھتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے

اپنے بندوں کی خدمت کے لئے پیدا کیا ہے، مَیں تو خادم ہوں، مخدوم نہیں ہوں، مجھے تو بڑوں کی، چھوٹوں کی، بیوی کی، مریضوں کی سب کی خدمت کرنی ہے۔ انہوں نے کسی سے کبھی خدمت کا مطالبہ نہیں کیا غور کیجئے کہ جس آدمی کا نظریہ ہی ایسا ہو؛ کیا وہ کبھی کسی سے تکلیف محسوس کرسکتا ہے؟

مَیں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اللہ کے ایسے بندے دنیا میں ہیں جو نبی کریم ﷺ کے ان ارشادات کو عملی جامہ پہنا کر ہمارے لئے نمونہ چھوڑ گئے۔ اگر آپ یوں کہیں کہ آپ تو صحابہ کے قصے بیان کرتے ہیں، تابعین کے قصے سناتے ہیں، ہم کہاں ان کی حرص کرسکتے ہیں، ابھی تو یہ دور چودھویں صدی کا آیا ہے، تو مَیں نے جو حضرت ڈاکٹر صاحب کا واقعہ سنایا، یہ کوئی پرانے زمانہ کی شخصیت نہیں ہیں، ابھی ماضی قریب میں گزرے ہیں۔ لہٰذا یہ چیز بڑی قابلِ توجہ ہے، اس کا خاص طور پر اہتمام کرنا چاہیے۔

قومِ لوط کی ایک برائی

﴿ثُمَّ وَعَظَهُمْ فِيْ ضِحْكِهِمْ مِنَ الضَّرْطَةِ، وَقَالَ: لِمَ يَضْحَكُ أَحَدُكُمْ مِمَّا يَفْعَلُ؟﴾

اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے اسی وعظ وخطبہ میں ایک تیسری نصیحت یہ بھی فرمائی کہ کبھی کسی کی ریح زور سے خارج ہوجاتی ہے، تو لوگ ہنستے ہیں، اس پر آپ ﷺ نے نصیحت فرمائی کہ یہ ہنسنے کی چیز نہیں ہے، اس لئے کہ جو لوگ ہنس رہے ہیں، کیا ان کو ریح خارج نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہر ایک کو پیش آتی ہے، تو پھر اس پر ہنسنا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ یعنی نبی کریم ﷺ اس بات پر غور وفکر کی دعوت دے رہے ہیں کہ یہ کیا فعل ہے؟ اگر کسی کی طرف سے کوئی ایسا عیب کا کام صادر ہوتا ہے جو دوسرے میں نہ ہو، اور اس پر کوئی ایسی بات کہی جائے، تو سمجھ میں بھی آنے

والی چیز ہے، لیکن ریح کا خارج ہونا تو ہر ایک کو پیش آتا ہے، پھر کسی پر ہنسنا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ یہ نامناسب فعل ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے، اور قوم لوط کی بری عادتوں کے سلسلہ میں کتابوں میں لکھا ہے ﴿وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْکُمُ الْمُنْکَر﴾ اپنی مجلسوں میں جو نامناسب حرکتیں کرتے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی لکھا ہے کہ وہ لوگ زور سے ریح خارج کر کے ہنسا کرتے تھے، گویا یہ قوم لوط کی برائیوں میں سے ہے۔ (الدر المنثور)

دنیا کی ساخت ہی اس انداز کی ہے

۲۷۵. عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ﴿لَایَفْرَکْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً، اِنْ کَرِهَ مِنْهَا خُلُقاً، رَضِیَ مِنْهَا آخَرَ﴾ أَوْقَالَ ﴿غَیْرَهُ﴾ (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی ایمان والا مرد ایمان والی عورت سے بغض نہ رکھے، اگر کوئی عادت اس کو ناپسند ہے تو اسی کی کوئی دوسری بات اس کو اچھی بھی لگتی ہے۔

افادات:- یہاں ایمان والی عورت سے اپنی بیوی مراد ہے یعنی کوئی شوہر اپنی بیوی سے بُغض اور دشمنی نہ رکھے۔ حضور اکرم ﷺ کے ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ دیکھو! جب دو آدمی ساتھ مل کر زندگی گذارتے ہیں تو یہ ایک طبعی چیز ہے کہ دونوں میں ہر ایک کی طرف سے دوسرے کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے، اس میں کبھی کوئی بات ضرور پیش آئے گی جس کی وجہ سے اس کو ناگواری اور تکلیف ہو، اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا کے اندر جتنی بھی چیزیں پیدا فرمائی ہیں، ان سب میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوں، خیر ہی خیر ہو، ایسا نہیں ہے، بلکہ دنیا کی ساخت اور بناوٹ ہی اس انداز کی رکھی ہے کہ اس میں خیر اور شر، بھلائی اور برائی، خوبی اور نقص یہ دونوں ملے جلے ہیں، کہیں کوئی ایسا نظر نہیں آئے گا کہ اس میں خوبی ہی خوبی ہو، نقص نہ ہو۔ بھلائی ہی بھلائی ہو، اس میں

برائی نہ ہو۔ خیر ہی خیر ہو، اس میں شر نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی بناوٹ ہی ایسی رکھی ہے۔

ہر چیز میں خیر اور شر کا پہلو ہے

نبی کریم ﷺ نے جو دعائیں مختلف چیزوں کے استعمال کے واسطے سکھلائیں ہیں ان سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً لباس کے سلسلہ میں دعا آتی ہے کہ جب آدمی کوئی نیا لباس پہنے، کرتہ، پائجامہ یا نئی چادر استعمال کرے، تو اسے یہ دعا پڑھنی چاہیے ﴿أَللّٰهُمَّ اِنِّیْ أَسْأَلُکَ خَیْرَهٗ وَخَیْرَ مَاصُنِعَ لَهٗ، وَأَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّهٖ وَشَرِّ مَاصُنِعَ لَهٗ﴾ اے اللہ! اس لباس کے اندر جو خیر و بھلائی تو نے رکھی ہے اور جن مقاصدِ خیر میں یہ لباس استعمال کیا جاتا ہے اس کا مَیں تجھ سے سوال کرتا ہوں، اور اے اللہ! اس لباس کے اندر جو شر و برائی تو نے رکھی ہے اور جن بری چیزوں میں یہ استعمال میں آتا ہے، اس سے مَیں تیری پناہ چاہتا ہوں (ابوداود شریف، ۴۰۲۰)

آج تو ہم نے یہ دعائیں پڑھنا بھی چھوڑ دی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ چیزوں کا نقصان ہمیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً سواری کے لئے کوئی گھوڑا خریدا تو حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ اس گھوڑے کی پیشانی کے بال پکڑ کر یہ دعا پڑھو ﴿أَللّٰهُمَّ اِنِّیْ أَسْأَلُکَ خَیْرَهٗ وَخَیْرَ مَاجُبِلَ عَلَیْهِ﴾ اے اللہ! اس کے اندر جو خیر و بھلائی ہو اس کا مَیں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور جس خیر و بھلائی پر وہ پیدا کیا گیا ہے اس کا سوال کرتا ہوں (سنن النسائی، ۱۰۰۶۹) تو ہم جب کوئی بھی چیز خرید کر لائیں مثلاً گاڑی لائیں، نئی ماروتی لائیں، تو اس میں بیٹھنے سے پہلے اس پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا پڑھ لینی چاہئے، اس کی برکت یہ ہوگی کہ اس گاڑی کے شر سے حفاظت ہوگی۔ بہت سی مرتبہ نئی گاڑی ہوتی ہے اور حادثہ کا شکار ہو جاتی ہے، تو گاڑی تو جاتی ہے، ساتھ میں مالک کو بھی لے جاتی ہے، یہ اس کا شر ہی تو ہے، یہ گاڑی

کی برائی ہی تو ہوئی کہ اس میں سواری کے نتیجہ میں آپ کو تکلیف پہنچی، اُس سے جہاں راحت پہنچ رہی ہے، وہاں تکلیف بھی پہنچ سکتی ہے۔ ہر چیز کا حال ایسا ہی ہے۔ اسی طرح مثلاً یہ کرسی ہے، اس میں خیر بھی ہے اور اگر یہ الٹ گئی تو اسی پر بیٹھنے کے نتیجہ میں آپ بھی الٹ گئے اور چوٹ آئی، یہ اس کا شر ہوا۔ ہر چیز میں غور کرو گے تو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ ہر چیز میں خیر کا پہلو بھی ہے اور شر کا بھی پہلو ہے۔

تعلیمات بذریعہ دعوات

تو نبی کریم ﷺ نے ہر چیز کے استعمال کے وقت جو دعائیں بتلائی ہیں اگر ان دعاؤں کا ہم اہتمام کریں تو بہت بڑا فائدہ حاصل ہو، لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ہم اپنے فائدے کی چیزوں میں بھی سنتوں کا اہتمام نہیں کرتے۔ اگر ہماری زندگی میں سنتوں کا اہتمام آجائے؛ تو خیر ہی خیر اور برکت ہی برکت ہو۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی تعلیمات کی روح اس کا نچوڑ اور خلاصہ مسنون دعائیں ہیں، آپ ﷺ نے اپنی دعاؤں کے ذریعہ لوگوں کو بڑی اہم تعلیمات دی ہیں۔ خیر! ابھی مَیں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔

نفرت کو دور رکھنے کا بہترین طریقہ

میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ ہر چیز کے اندر خوبی بھی ہے اور برائی ہے۔ عورت بھی دنیا کی ایک مخلوق ہے، اس کے اندر بھی کوئی برائی ہے تو کوئی خوبی بھی ہے، دونوں باتیں موجود ہیں، اب اس کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے اور اس سے کس طرح سے فائدہ اٹھانا چاہیے؟ حضور اکرم ﷺ اس کا طریقہ بتلا رہے ہیں کہ بھائی! جب اس کی طرف سے کوئی

ایسی بات پیش آئے جو آپ کے لئے تکلیف دہ ہے، آپ اس کی اس عادت کو پسند نہیں کرتے، تو اس وقت آپ اس ناپسندیدہ عادت سے اپنا دھیان ہٹانے کے لئے اس کی پسندیدہ چیزوں کا تصور کیجئے، نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی ناپسندیدہ عادت کی وجہ سے آپ کے دل میں اس کے متعلق ناگواری کے جو جذبات پیدا ہوئے ہیں وہ رک جائیں گے۔ اور اگر ہم یہ طریقہ نہیں اپنائیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ دھیرے دھیرے کینہ اور بغض بڑھتا جائے گا اور ازدواجی زندگی جہنم بن جائے گی اور پھر جدائی کی نوبت آجائے گی۔ عورت کے متعلق اپنے دل میں پیدا ہونے والی نفرت کو دور رکھنے کے لئے یہ بہترین طریقہ ہے۔

اللہ کے رجال اور ان کا کمال

درحقیقت انسان بڑا ناشکرا ہے، اور ناشکری کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک ہی چیز کو لے کر بیٹھ جاتا ہے، کسی ساتھی میں سو خوبیاں ہوں لیکن اگر اس کا ایک عیب اور برائی سامنے آئے گی تو اس کا تذکرہ بار بار کرے گا اور جو سو خوبیاں ہیں ان کا تذکرہ ہی نہیں کرے گا۔ اگر انسان کا یہ مزاج رہا تو کبھی بھی شکر کی عادت نہیں بنے گی۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جو میاں صاحب کے نام سے مشہور ہیں) کو بہت سخت بخار تھا، مَیں نے پوچھا کہ حضرت! کیا حال ہے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ الحمد للہ! میری آنکھیں صحیح سلامت ہیں، کان سے بھی اچھی طرح فائدہ اٹھا رہا ہوں، ہاتھ پیر برابر کام کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ؛ ہر چیز گنوانے کے بعد فرمایا کہ بس! ذرا سا بخار ہے حالانکہ اس وقت ایک سو چار ڈگری بخار تھا لیکن دیکھو کہ کتنا شکر ادا کر کے بیان کیا۔ بیان کا یہ بھی ایک انداز ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتنی ساری نعمتیں ہیں اور یہاں تو مزاج کا سوال کیا گیا تھا اگر اس کے جواب میں شکوہ وشکایت کے طور پر نہیں بلکہ اظہارِ واقعہ کے طور پر بولتے ؛ تو کوئی حرج کی بات بھی نہیں تھی ،مسئلہ اپنی جگہ پر یہی ہے ،لیکن اللہ کے ان مخصوص بندوں کا یہ کمال ہے کہ ایسی حالت میں بھی وہ یہی کہتے ہیں کہ اللہ کا یہ بھی احسان ہے اور یہ نعمت بھی حاصل ہے،اور سب ٹھیک ہے،ٹھیک ہے،ٹھیک ہے،ایک لمبی فہرست شمار کرانے کے بعد آخر میں فرماتے ہیں کہ بس! ذرا سا بخار ہے۔اور ہمارا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

جس ہاتھ سے پوری زندگی میٹھی چیزیں کھاتا رہا

ایک آقا نے ککڑی کی قاش کاٹ کر اپنے غلام کو دی،اس نے اس کو کھائی،لیکن کوئی ایسا تأثر نہیں دیا اور اپنے چہرے سے بھی ذرہ برابر ظاہر ہونے نہیں دیا کہ یہ کڑوی ہے، حالانکہ وہ بہت کڑوی تھی، جیسے میٹھی ککڑی کھائی جاتی ہے ایسی ہی رغبت سے اس کو کھایا۔ اور دوسری خود اپنے منھ میں رکھی تب پتہ چلا کہ یہ تو بہت کڑوی ہے،اس نے اپنے اس غلام سے کہا کہ اللہ کے بندے! تو نے بتلایا کیوں نہیں کہ یہ ککڑی اتنی کڑوی ہے۔اس کا جواب ہم لوگوں کے لئے بڑا قابل عبرت ہے۔اس نے کہا کہ جس ہاتھ سے اب تک پوری زندگی میٹھی چیزیں کھاتا رہا؛ اگر ایک چیز کڑوی مل گئی تو کیا مَیں اس کا اظہار کروں؟ واقعہ یہی ہے کہ ہم لوگوں کا مزاج ناشکری والا بن گیا ہے،جس کو ٹھیک کرنا بہت ضروری ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ دیکھو! اگر کسی نے آپ کو آدھا گلاس پانی دیا تو اس کی تعبیر کے دو انداز ہیں، جس کی طبیعت میں ناشکری ہے وہ یوں کہے گا کہ آدھا گلاس خالی ہے،اور جس کی طبیعت میں شکر ہے، وہ کہے گا کہ آدھا گلاس بھر کر دیا ہے۔

......تب ہی زندگی گذر سکتی ہے

بہرحال! حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر اپنی بیوی سے کوئی بات ناگواری کی اپنی طبیعت کے خلاف دیکھے، تو اس کے ساتھ بغض نہ رکھے، اس لئے کہ اگر اس کی ایک بات ناپسند آئی ہے، تو دوسری کوئی بات پسند آئے گی، ہمارا یہی انداز ہونا چاہیے؛ تب ہی زندگی گذر سکتی ہے۔ ورنہ اگر کسی ایک ایسی بات کو کوئی آدمی لے کر بیٹھ جاتا ہے جو اس کی طبیعت کے خلاف ہوئی ہے؛ تو پھر ایسے آدمی کو چاہیے کہ نکاح کا ارادہ ہی ترک کر دے، اس لئے کہ کوئی بھی عورت آئے گی اس میں کوئی نہ کوئی بات تو ایسی ضرور ہوگی، جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ کسی میں یہ خرابی دیکھی تو اس کو الگ کر دیا، پھر دوسری لائے، ویسے پہلی کو الگ کر دینے کے بعد دوسری عورت جلدی سے ملنے والی نہیں ہے، اور اگر مل گئی تو اس میں بھی وہی بات ہوگی، اب اس کے ساتھ بھی اسی طرح کیا تو تیسری کا معاملہ تو اور زیادہ سنگین ہو جائے گا۔ اور مان لو کہ اگر مل بھی گئی تو اس میں بھی وہی بات ہوگی۔ تو اب سوال پیدا ہوگا کہ اس کو بھی الگ کر دے گا؟ نہیں! بلکہ اب تو سوچے گا کہ اس کو تو ایسے ہی چلالو، اس کے ساتھ تو خدا واسطے سمجھوتہ کر لو۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ بھائی! یہ سمجھوتہ والی بات آج آپ کی سمجھ میں آئی؟ یہی معاملہ پہلی والی کے ساتھ کرتے تو دو دو کو طلاق دینے کی نوبت آتی؟

آں چہ کند دانا کند ناداں ۞ لیک بعد از خرابی بسیار

فارسی کا ایک مقولہ ہے کہ جو کام عقل مند کرتا ہے وہی کام بیوقوف بھی کرتا ہے، لیکن بیوقوف وہ کام بہت ساری خرابی پیدا ہونے کے بعد کرتا ہے، اور عقل مند آدمی پہلے ہی دن وہ کام کر لیتا ہے۔ بہرحال! نبی کریم ﷺ نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ اس کی ایک

بات اگر آپ کو ناپسند ہے، تو دوسری آپ کو پسند آئے گی۔

وفاداری سے اونچی چیز اور کیا ہوسکتی ہے؟

حضرت اقدس تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے ایک بزرگ کا قصہ بیان فرمایا ہے کہ ان کی بیوی بڑی جھگڑالو تھی، وہ جب بھی گھر میں آویں تو جھگڑا شروع کر دیتی تھی۔ وہ بڑے صبر سے کام لیتے تھے۔ کسی نے کہا کہ یہ کیا روز روز کی جھک جھک ہے، اس کو طلاق دے دو، انہوں نے کہا کہ بھائی! اس کو الگ کرنا تو بہت آسان ہے، جب چاہوں الگ کر دوں، اس میں کیا دیر لگتی ہے، یہ تو میرے ہاتھ کا معاملہ ہے، لیکن اس کے اندر ایک ایسی خوبی ہے جس کی وجہ سے مَیں اس کو الگ کرنا نہیں چاہتا۔ پوچھا کہ وہ خوبی کیا ہے؟ تو فرمایا کہ بڑی وفادار ہے، اگر آج حکومت مجھے گرفتار کر لے، تو جاتے وقت مَیں اس کو جس جگہ چھوڑ کر جاؤں گا، اگر دس سال کے بعد بھی واپس آؤں گا تو وہ وہیں بیٹھی ہوئی مجھے ملے گی۔ اور واقعی بات ایسی ہی ہے۔

حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کی عورتوں میں وفاداری والا وصف بڑا قابلِ رشک ہے، یہ تو آپ یوروپ وامریکہ جا کر پوچھو، وہاں یہ جنس گراں مایہ آپ کو نہیں ملے گی، وہاں تو یہ چیز بالکل ہی مفقود ہے، اور اب تو وہ برائیاں ہمارے سماج میں بھی آرہی ہیں، ہمارے یہاں بھی دیکھو گے تو ایسے لوگ آپ کو ملیں گے۔ تو ان کی وفاداری سے اونچی چیز اور کیا ہوسکتی ہے؟ اس وصف کی خاطر تو سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہے، اس کی دوسری ساری کمی کوتاہیوں کو برداشت کیا جاسکتا ہے، اسی لئے عورت کی اس خوبی کو مدِ نظر رکھنے کی تاکید کی جارہی ہے۔ بگڑی ہوئی بند گھڑی کا حال مَیں نے پہلے بھی عرض کیا تھا۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانہ میں

حضرت مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ جو گھڑی بند پڑی ہے، وہ بھی چوبیس گھنٹے میں دو مرتبہ صحیح وقت بتلاتی ہے، مثلاً نو (۹) بجے بند ہوگئی ہے، تو جب رات کے نو (۹) بجیں گے تو اس میں بھی نو (۹) بتائے گی، اور اسی طرح دن میں بھی ہوگا، تو چوبیس گھنٹے میں دو وقت وہ بھی صحیح وقت بتلاتی ہے۔ اس مثال کا حاصل صرف اتنا ہی ہے کہ کسی بھی چیز کو بالکل بے کار اور مہمل نہ سمجھو، یہ نہ سمجھو کہ اس میں کوئی خوبی ہے ہی نہیں، جس کو تم بالکل بے کار سمجھ رہے ہو؛ اس میں بھی کوئی نہ کوئی خوبی ضرور ہوگی۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانہ میں ❁ کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانہ میں

(اقبال)

اَلْوَصِيَّةُ بِالنِّسَآءِ

عورتوں کے بارے میں تاکید

مجلس (۴)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عورتوں کے متعلق نبی کریم ﷺ نے جو تاکید فرمائی ہے اسی کا بیان چل رہا ہے۔ آج ایک روایت پیش کرتے ہیں۔

۲۷۶. وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْأَحْوَصِ الْجُشَمِيِّ رضی اللہ عنہ أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ يَقُوْلُ بَعْدَأَنْ حَمِدَاللّٰهَ تعالیٰ وَ أَثْنٰى عَلَيْهِ وَذَكَّرَوَوَعَظَ، ثُمَّ قَالَ: أَلَاوَاسْتَوْصُوْابِالنِّسَآءِ خَيْراً، فَاِنَّمَاهُنَّ عَوَانٍ عِنْدَكُمْ لَيْسَ تَمْلِكُوْنَ مِنْهُنَّ شَيْئاً غَيْرَذٰلِكَ، اِلَّاأَن يَّأْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ، فَاِنْ فَعَلْنَ فَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ، وَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْباًغَيْرَمُبَرِّحٍ، فَاِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَاتَبْغُوْاعَلَيْهِنَّ سَبِيْلاً؛ أَلَا اِنَّ لَكُمْ عَلٰى نِسَآئِكُمْ حَقًّا وَلِنِسَآئِكُمْ عَلَيْكُمْ حَقًّا؛ فَحَقُّكُمْ عَلَيْهِنَّ أَن لَّا يُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ مَنْ تَكْرَهُوْنَ، وَلَا يَأْذَنَّ فِىْ بُيُوْتِكُمْ لِمَنْ تَكْرَهُوْنَ، أَلَا وَحَقُّهُنَّ عَلَيْكُمْ أَنْ تُحْسِنُوْا اِلَيْهِنَّ فِىْ كِسْوَتِهِنَّ وَطَعَامِهِنَّ.

(رواہ الترمذی وقال حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ)

حضرت عمرو بن احوص جشمی رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو حجۃ الوداع میں فرماتے ہوئے سنا جس میں آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان فرمائی اور لوگوں کو نصیحت بھی فرمائی، آپ نے فرمایا: سنو اور آگاہ ہو جاؤ! عورتوں کے سلسلہ میں میری طرف سے بھلائی اور حسنِ سلوک کی نصیحت قبول کرو، یہ عورتیں تمہارے پاس قیدیوں کی طرح ہیں، اس کے علاوہ اور کسی اور چیز کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ کھلّم کھلاّ کسی فاحشہ کا ارتکاب کریں، اگر وہ ایسا کرتی ہیں تو پھر اصلاح کے لئے ان سے بستر الگ کرلو، اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو پھر ان کی ایسی پٹائی بھی کر سکتے ہو جو سخت نہ ہو۔ پھر اگر وہ تمہاری بات ماننے لگیں تو پھر آگے کوئی سخت اقدام کرنے کی ضرورت نہیں ہے سنو! تمہارا تمہاری عورتوں پر حق ہے اور تمہاری عورتوں کا تم پر حق ہے۔ تمہارا حق ان پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی ایسے آدمی کو آنے نہ دیں جس کے آنے کو تم پسند نہیں کرتے، اور تمہارے گھر میں بھی ایسے آدمی کو آنے نہ دیں جن کا آنا تمہیں

گوارا نہیں ہے۔ سنو! اور ان کا حق تم پر یہ بھی ہے کہ ان کے ساتھ ان کے لباس اور ان کے کھانے پینے کے معاملہ میں اچھائی اور بھلائی کا سلوک کرو۔

حجۃ الوداع کا مختصر پس منظر

حجۃ الوداع یعنی ۱۰ھ میں نبی کریم ﷺ نے جو حج فرمایا تھا اور حج کی فرضیت کے بعد یہی ایک حج نبی کریم ﷺ نے کیا ہے اور آپ نے پہلے ہی سے اعلان فرما دیا تھا کہ مَیں اس سال حج کرنے والا ہوں، تم لوگ بھی میرے ساتھ چلو، چنانچہ صحابہ کرام کی بہت بڑی تعداد اور بہت بڑا مجمع نبی کریم ﷺ کے ساتھ حج کے لئے چلا، اور اسی موقع پر آپ نے صحابہ کرام سے یہ بھی فرمایا تھا کہ شاید آئندہ مَیں تم کو نہ دیکھ سکوں اور تم سے ملاقات نہ ہو سکے، گویا آپ نے ایسا انداز اختیار فرمایا جیسے کوئی رخصت ہونے والا اور الوداع کہنے والا اختیار کرتا ہے، گویا یہ ایک الوداعی پروگرام تھا اسی لئے اس حج کو حجۃ الوداع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گویا آپ کو معلوم تھا کہ اتنا بڑا مجمع جس کے سامنے مَیں اپنی باتیں پیش کر رہا ہوں، دوبارہ جمع ہونے والا نہیں ہے، اور پھر ایسی باتیں کہنے کا دوبارہ موقع ملنے والا نہیں ہے۔ اس میں آپ ﷺ نے اپنی امت کو ان کی زندگی میں پیش آنے والی اہم اہم چیزوں کی طرف رہنمائی فرمائی، اور جہاں جہاں آپ کو اندیشہ تھا کہ امت کا پاؤں پھسل سکتا ہے، یا اس معاملہ میں امت راہِ راست سے ہٹ سکتی ہے، گمراہی میں مبتلا ہو سکتی ہے؛ ایسے امور کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ نے بڑے اہتمام سے رہنمائی فرمائی۔

اس حج میں نبی کریم ﷺ نے ایک خطبہ دیا تھا، جو بڑا عظیم الشان ہے، جس میں نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو ان خاص خاص چیزوں کی تاکید و وصیت فرمائی تھی جن کے متعلق آپ کو خطرہ تھا کہ امت ان کی وجہ سے فتنوں میں مبتلا ہو سکتی ہے، یا امت کی

طرف سے ان حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی واقع ہوسکتی ہے، ایسی اہم اہم چیزیں ارشاد فرمائی تھیں، اور ایسے موقع پر آدمی اہم چیزوں کو ہی بیان کیا کرتا ہے۔ ویسے تو یہ خطبہ بڑا لمبا ہے، اس میں بہت ساری چیزیں ہیں لیکن حضرات محدثین موضوع کی مناسبت سے اس کے مختلف اجزاء کو اپنی کتابوں میں پیش کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کو اندیشہ تھا

حضرت عمرو بن احوص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے اس خطبہ میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان فرمائی اور لوگوں کو نصیحت بھی فرمائی۔ چونکہ اس خطبہ میں نبی کریم ﷺ نے اور بھی بہت ساری باتیں ارشاد فرمائی تھیں اور راوی ان چیزوں کا تذکرہ چھوڑ رہے ہیں اس لئے انہوں نے اجمالی طور پر کہا ﴿ذَكَّرَ وَوَعَظَ﴾ اور پھر راوی آپ کے خطبہ کے اس اہم جزو کو نقل فرماتے ہیں جس کو اس بیان سے مناسبت ہے۔

اس خطبہ میں نبی کریم ﷺ نے عورتوں کے حقوق کے متعلق بڑی اہمیت کے ساتھ امت کو متوجہ کیا، جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کا معاملہ بھی ان امور میں سے تھا جن کے متعلق نبی کریم ﷺ کو یہ اندیشہ تھا کہ امت کی طرف سے اس کی ادائیگی کے معاملہ میں کوتاہی کا صدور ہوسکتا ہے، اس لئے آپ ﷺ نے اپنے اس خطبہ میں بڑی اہمیت کے ساتھ جو چیزیں ارشاد فرمائیں ان میں اس کو بھی شامل فرمایا۔

چنانچہ فرمایا ﴿أَلَا وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ خَيْرًا﴾ کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے عربی زبان میں لفظ ﴿أَلَا﴾ استعمال کیا جاتا ہے، سنو اور آگاہ ہو جاؤ، عورتوں کے سلسلہ میں میری طرف سے بھلائی اور حسنِ سلوک کی نصیحت قبول کرو، مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ اچھائی کا سلوک کرو۔ عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید دوسرے موقعوں پر

بھی فرمائی ہے لیکن اس موقع پر بھی نبی کریم ﷺ نے اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اس بات کی وصیت و نصیحت فرمائی۔

عورتیں تمہارے پاس قیدی ہیں

پھر نبی کریم ﷺ نے ان کے ساتھ حسنِ سلوک کے واسطے ان کا ایک ایسا عجیب و غریب وصف بیان فرمایا کہ اگر آدمی اس وصف پر غور کرے تو یقیناً کبھی بھی عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے معاملہ میں کوتاہی نہیں کرے گا ﴿فَاِنَّمَا هُنَّ عَوَانٍ عِنْدَكُمْ﴾ علامہ نوویؒ نے اسی کو فرمایا ہے ﴿عَوَانٍ أَیْ أَسِیْرَاتٌ جَمْعُ عَانِیَةٍ .شَبَّهَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَلْمَرْأَةَ فِیْ دُخُوْلِهَا تَحْتَ حُكْمِ الزَوْجِ بِالْأَسِیْرِ﴾ "عَوَانٍ" "عَانِیَةٌ" کی جمع ہے، عربی زبان میں "عَانِیْ" قیدی کو کہتے ہیں، اس کا مؤنث "عَانِیَةٌ" ہے، یعنی قیدی عورت ہو تو اس کو "عَانِیَةٌ" کہا جائے گا۔

گویا نبی کریم ﷺ حسنِ سلوک کی جو تاکید فرما رہے ہیں اس میں آپ نے ان کا ایک ایسا وصف بیان کیا کہ آدمی اگر اس وصف کو سوچے تو کبھی اس کے ساتھ زیادتی اور بے انصافی کا معاملہ نہیں کر سکتا، اور وہ وصف بیان کیا ﴿فَاِنَّمَا هُنَّ عَوَانٍ عِنْدَكُمْ﴾ یہ عورتیں تمہارے پاس قیدیوں کی طرح ہیں یعنی نکاح کے بعد وہ تمہارے پاس آئیں تو ان کی حیثیت تمہارے یہاں قیدی جیسی ہوگئی، یہ وہ شخصیت ہے کہ جس نے اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دیا ہے۔

قابلِ غور مضمون

سوچنے کی چیز ہے کہ ایک نادان اور نا تجربہ کار لڑکی جس نے ابھی دنیا نہیں دیکھی ہے اس کی پیدائش گھر میں اپنے ماں باپ کے یہاں ہوئی، وہیں پلی بڑھی، وہیں اس کی

تعلیم وتربیت ہوئی، وہیں اپنے بھائی بہنوں میں، رشتہ داروں اور سہیلیوں میں پروان چڑھی، اپنے ملنے والوں میں بڑے آرام وراحت سے زندگی گذار رہی تھی، جب عمر کی اس منزل میں پہنچی جس میں عورت کو نکاح کے بعد خاوند کے حوالہ کیا جاتا ہے، اس وقت اس کے ماں باپ نے اس کا رشتہ تمہارے ساتھ طے کر کے نکاح کر کے تمہارے حوالہ کر دیا، اب تمہارے یہاں اس کے لئے بالکل اجنبی ماحول ہے، اس نے بالکل اجنبی گھر میں ایک اجنبی شخص کے حوالہ اپنے آپ کو کر دیا ہے۔ ہم اگر کسی اجنبی ماحول میں ایک دو دن کے لئے پہنچ جاتے ہیں اور اجنبی لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، تو وہاں ہم پر جو کچھ گذرتی ہے اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیسی مشقت اور تکلیفیں لاحق ہوتی ہیں اور اس کی وجہ سے کیسی مصیبتوں میں گرفتار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن یہ عورت زندگی بھر کے لئے اپنے اصلی ماحول کو چھوڑ کر آئی ہے۔ غور کیجئے کہ اس نے کتنی بڑی قربانی دی ہے۔

حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ اگر شوہر عورت کی صرف اسی ایک قربانی پر غور کرے تو کبھی بھی اس کے ساتھ ناروا سلوک نہیں کرے گا۔ اس نے اپنی ماں کو چھوڑا، باپ کو چھوڑا، اپنے اُس گھر کو چھوڑا؛ جہاں پیدا ہوئی، پلی بڑھی، اپنے بھائی بہنوں کو چھوڑا، اگر دادا دادی، نانا نانی ہیں؛ تو ان کو چھوڑا، دوسرے تمام رشتہ داروں کو چھوڑا، اپنے بچپن کی سہیلیوں کو چھوڑا۔

اپنے گھر سے کس کو تعلق نہیں ہوتا؟

اپنے وطن اور پیدائش والے گھر کے ساتھ کس کو تعلق نہیں ہوتا؟ ہم لوگ اپنی عمر کی جس منزل میں ہیں، وہاں پہنچنے کے بعد بھی اگر ہم وطن سے دور ہو جائیں تو کچھ دنوں تک تو ہوسکتا ہے کہ صبر وتحمل سے کام لیں، لیکن ایک وقت آتا ہے کہ آدمی کو وطن کی یاد آتی ہی ہے۔

ہجرت کے موقعہ پر جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو مدینہ منورہ کی آب وہوا ٹھنڈی ہونے کی وجہ سے باہر کا کوئی آدمی جب وہاں جاتا تھا تو وہ ایک مخصوص قسم کے بخار میں مبتلا ہو جاتا تھا، یہ حضرات بھی وہاں جانے کے بعد اسی بیماری میں مبتلا ہوئے، ان بیمار ہونے والوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی تھے بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت موجود ہے کہ جب مَیں اپنے والد حضرت ابوبکر کی عیادت کے لئے اور تیمارداری کے لئے پہنچی تو وہ مکہ مکرمہ کی یاد اور فراق میں اشعار پڑھ رہے تھے، اسی طرح حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ بھی مکہ مکرمہ کی یاد میں اشعار پڑھ رہے ہیں (بخاری شریف، ۳۹۲۶) معلوم ہوا کہ اپنے وطن اور گھر کی یاد فطری چیز ہے۔

......تو ہمارے دل پر کیا گذرے گی؟

اب یہ لڑکی جو اپنے والدین کے یہاں سے سب چھوڑ چھاڑ کر، سب کچھ قربان کر کے رخصت ہو کر آپ کے یہاں آگئی، آخر کس بنیاد پر؟ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ اگر ہم سے یہ کہا جائے کہ تمہارا نکاح ہونے والا ہے اور نکاح کے بعد آپ کو اپنے ماں باپ، بھائی بہن اور اپنا گھر جس میں آپ پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور پروان چڑھے، اس سب کو چھوڑ کر دوسرے گھر منتقل ہونا ہے اور ہمیشہ کے لئے وہیں کا ہو کر رہنا ہے، تو سوچو! ہمارے دل پر کیا گذرے گی؟

ہمارے لئے بہت بڑا سبق ہے

اللہ تعالیٰ نے شریعتِ مطہرہ کے ذریعہ سے نکاح کے واسطے جو طریقہ مقرر فرمایا

ہے اس میں صرف دو بول رکھے ہیں، ایک طرف سے کہا جاتا ہے کہ نکاح میں دیا، دوسری طرف سے اس کو منظور رکھا جاتا ہے کہ قبول کیا۔ چاہے پہلے لڑکی کی طرف سے کہا جائے، اور لڑکا جواب میں قبول کرے، یا پہلے لڑکا کہے اور جواب میں لڑکی قبول کرے۔ پہلا جو جملہ بولا جاتا ہے اس کو فقہاء کے یہاں ایجاب کہتے ہیں اور جواب میں جو جملہ بولا جاتا ہے اس کو قبول سے تعبیر کرتے ہیں۔ خیر! ان دو بولوں کی اس صنفِ نازک اور ایک کمزور و نادان لڑکی نے اتنی لاج رکھ لی کہ اپنا سب کچھ قربان کر کے وہ آپ کی ہو کر رہ گئی۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ اس میں ہم لوگوں کے لئے بہت بڑا درس اور سبق ہے کہ ایک کمزور مخلوق ان دو بولوں کا اتنا خیال، اتنا لحاظ اور اتنی رعایت کرتی ہے کہ اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے اور آپ کی بن جاتی ہے، اور ہم بھی دو بول کہتے ہیں ﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کو تسلیم کرتے ہیں؛ اس کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کے احکام اور نبی کریم ﷺ کے طریقوں کو اپنانے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے، اُن دو بولوں کی خاطر جو قربانی اُس لڑکی نے دی، کیا اِن دو بولوں کی خاطر ایسی قربانی ہم دیتے ہیں؟

کوئی بھی اس کا حمایتی نہیں

اور واقعہ یہ ہے کہ عورت کی حیثیت شوہر کے یہاں قیدی کی سی ہے، نبی کریم ﷺ نے بہت عمدہ تعبیر فرمائی ہے، آپ ﷺ سے زیادہ بلیغ اور کون ہو سکتا ہے۔ ایسی عمدہ تعبیر ہے کہ عورتوں کی اس حیثیت کو جو شوہر کے یہاں ہے، اس سے اچھے انداز میں پیش نہیں کیا جا سکتا ﴿فَاِنَّمَا هُنَّ عَوَانٍ عِنْدَكُمْ﴾ وہ تمہارے پاس قیدی ہیں۔ اور پھر کمال تو یہ ہے کہ اس کا کوئی سپورٹر (Supporter) بھی نہیں ہے یعنی اگر اس کے ساتھ شوہر کی طرف

سے، ساس کی طرف سے خسر کی طرف سے، نند کی طرف سے، دیور کی طرف سے، جیٹھ کی طرف سے، اور اگر گھر میں دوسرے افراد موجود ہیں جیسے دادی ساس، دادا خسر، نانی ساس، نانا خسر وغیرہ جتنا بڑا کنبہ ہوگا اسی مناسبت سے افراد بھی بڑھتے جائیں گے: ان میں سے کسی کی طرف سے کوئی زیادتی، کوئی طعن و تشنیع یا اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہو جائے تو اس کا کون ہے؟ کوئی بھی اس کا حمایتی نہیں ہے، حضورِ اکرم ﷺ یہ جملہ ارشاد فرما کر عورت کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید فرما رہے ہیں کہ جیسے قیدی کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جاتا ہے، اسی طرح آپ بھی اس کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کیجیے۔

نکاح سے صرف ملکِ متعہ حاصل ہوتی ہے

اب آگے ایک اہم سوال ہے کہ شوہر جب نکاح کر کے بیوی کو اپنے گھر میں لاتا ہے تو اس کو اس نکاح کے نتیجہ میں بیوی کے اوپر کتنا اختیار اور کتنی (Authority) حاصل ہوتی ہے؟ یہ بہت اہم سوال ہے۔ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿لَیْسَ تَمْلِکُوْنَ مِنْھُنَّ شَیْئًا غَیْرَ ذٰلِکَ﴾ نبی کریم ﷺ نے یہ بھی عجیب بات ارشاد فرمائی ہے کہ یہ تمہارے گھر میں رہے، باہر نہ جائے؛ بس! اس کے علاوہ اور کسی چیز کے تم مالک نہیں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ نکاح جس مقصد کے لئے کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ شوہر اپنی فطری ضرورت پوری کرے، توالد وتناسل، اولاد کی پیدائش کا سلسلہ جاری رہے، شریعت نے نکاح کو صرف اسی لئے مشروع کیا ہے۔ نکاح کا یہی ایک مقصد ''عورت سے استمتاع'' ہے، اس نکاح کے ذریعہ سے شوہر کو عورت سے صحبت، مجامعت اور وطی کر کے فائدہ اٹھانے کا اختیار شریعت نے دیا ہے۔ چنانچہ فقہاء اسی کو ایک خاص لفظ ''ملکِ متعہ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ ''متعہ'' فائدہ اٹھانے کی چیز کو کہا جاتا ہے۔ گویا ایک مخصوص قسم کا فائدہ صحبت، مجامعت اور وطی کر کے

ایک مرد عورت سے حاصل کرتا ہے، صرف اور صرف اسی ایک مقصد کو حاصل کرنے کے لئے شریعت نے نکاح کو مشروع کیا ہے۔ چنانچہ تمام کتب فقہ اٹھا کر آپ دیکھ لیجیے کہ نکاح کے نتیجہ میں شوہر کو عورت کے اوپر جو ملکیت و اختیار حاصل ہوتا ہے، تو وہ کون سی ملکیت ہے؟ یہی فائدہ اٹھانے کی ملکیت ملتی ہے۔

کبھی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے

پہلے زمانہ میں باندیاں بھی ہوا کرتی تھیں، کوئی اس کو خرید کر لاتا تو اس کو ''ملکِ رقبہ'' کہا جاتا تھا یعنی آقا اس کی ذات کا مالک ہوا کرتا تھا اور اس کے اختیارات تو بہت ہوتے تھے لیکن یہاں ایسا نہیں ہے۔ یہ تو ایک آزاد عورت ہے۔ جب نکاح کر کے اس کو اپنے یہاں لائے تو اس نکاح کے نتیجہ میں آپ کو اس پر شریعت نے صرف اور صرف اتنا ہی اختیار دیا کہ آپ اس سے فائدہ اٹھانے کے مالک بنے؛ اسی کو ''ملکِ متعہ'' کہتے ہیں۔ چونکہ یہ فائدہ اٹھانے کے لئے اس کی طبیعت چوبیس گھنٹے میں کسی بھی وقت آمادہ ہو سکتی ہے، اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں ہے، معلوم نہیں طبیعت میں کب انتشار پیدا ہو اور کب عورت کی طرف رجحان و میلان پیدا ہو اور یہ فائدہ اٹھانے کی کب ضرورت پیش آجائے؛ اس لئے عورت کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ چوبیس گھنٹے تم کو گھر میں ہی رہنا ہے۔

نفل روزہ کے لئے شوہر کی اجازت لازم ہے

اور جس مقصد کے لئے یہ نکاح کیا گیا ہے اس کی شریعت نے اتنی رعایت کی کہ شوہر کہیں سفر پر نہیں ہے اُس زمانہ میں عورت اگر نفل روزہ رکھنا چاہتی ہے تو حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ عورت شوہر کی اجازت کے بغیر نفل روزہ نہیں رکھ سکتی، اس کو پہلے سے

پرمشن (Permission) لینی پڑے گی، پہلے شوہر سے پوچھ لے کہ کل روزہ رکھنے کا میرا ارادہ ہے رکھوں؟ شوہر کہے کہ ٹھیک ہے، رکھ سکتی ہو؛ تو روزہ رکھے۔ شوہر کی اجازت کے بغیر اس کو روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔ اگر شوہر کو اطلاع کردی اور اس نے خاموشی اختیار کی اور اس کا وطیرہ اور انداز ایسا ہے کہ خاموشی بھی اجازت سمجھی جاتی ہے؛ تو اس کی خاموشی بھی اسی حکم میں شمار ہوگی۔ تو دیکھو! اگر شوہر نے کہا کہ مجھے صحبت کی ضرورت ہے اور وہ کہے کہ میرا تو روزہ ہے، تو رکاوٹ آجائے گی، اس لئے شریعت نے نفل روزہ کے لئے شوہر کی اجازت کو لازم قرار دیا ہے، کیونکہ روزہ کی وجہ سے شوہر اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔

چاہے روٹی جل جائے

اور عورت کو چوبیس گھنٹے گھر میں رہنے کا جو پابند بنایا ہے اس کی بھی وجہ دراصل یہی ہے کہ شوہر کا جب جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے۔ اور شوہر کا سب سے بڑا حق یہی ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر عورت گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی، اس لئے کہ اگر وہ باہر گئی اور ادھر شوہر کو ضرورت پیش آئی تو؟ اس لئے شوہر کی اجازت کے بغیر باہر نہیں جاسکتی۔

بلکہ شوہر کی اس ضرورت کا اتنا لحاظ کیا گیا کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ عورت روٹی پکا رہی ہے اور روٹی توے پر ڈال دی ہے اور شوہر کو ضرورت پیش آئی اور اس نے مطالبہ کیا تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس بات کی پرواہ مت کرو کہ روٹی جل جائے گی، پہلے شوہر کی ضرورت پوری کرو۔ (المعجم الکبیر، ۸۲۴۰)

غیر اسلامی معاشرہ اور رسموں کی تباہی

شریعت کی نگاہ میں عفت وعصمت اور پاکدامنی کا بہت زیادہ اہتمام ہے۔

ہمارے ماحول میں غیر اسلامی رسمیں گھس جانے اور غیر اسلامی معاشرتی آداب جو خود ہم نے گھڑ رکھے ہیں ان کی وجہ سے ہم لوگوں کو یہ باتیں قابلِ تعجب معلوم ہوتی ہیں جیسے ماں باپ گھر میں ہوں تو بیوی سے کیسے صحبت کی جاسکتی ہے۔ بہت سی جگہ پر تو- جہاں مشترک فیملی والا بڑا خاندان ہوتا ہے- بیچارہ شوہر کئی کئی دن تک ترس کر رہ جاتا ہے، اس کو ملاقات کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ اس آدمی کی جب ضرورت پوری نہیں ہوگی تو آخر اس کے لئے وہ کوئی نہ کوئی راستہ تو تلاش کرے گا ہی۔ شریعت نے نکاح کے بعد اپنے لئے کم سے کم ایک الگ کمرہ ہونے کا کہا ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ جب اس کے دل میں تقاضہ پیدا ہو تو وہ اپنی ضرورت پوری کرسکے اور بیوی کو بھی پابند بنایا کہ تم کو اسی لئے اس کے یہاں بھیجا ہے۔

اور اگر وہ عورت اپنی طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے، بیماری کی وجہ سے، یا(Health) کی وجہ سے اس کی متحمل نہیں ہے، اور آدمی کی طبیعت میں قوت زیادہ ہے تو اسی کی رعایت کرتے ہوئے شریعت نے مزید دو، تین، چار تک نکاح کرنے کی اجازت دی ہے؛ لیکن زنا کی کسی بھی حال میں اجازت نہیں دی، اس کو بالکل حرام قرار دیا ہے۔

سماج کی خطرناک صورتِ حال

آج ہمارے سماج ومعاشرہ میں لوگوں نے دوسرا نکاح کرنا عیب بنا رکھا ہے، حالانکہ وہی آدمی برائیوں میں، بدکاریوں میں، زناکاریوں میں مبتلا ہے، گھر والے سب جانتے ہیں، خاندان والوں کو معلوم ہے، بیٹے بڑے ہو چکے ہیں، ان کو بھی معلوم ہے کہ باپ بدراہی پر آچکا ہے، لیکن اگر بیٹوں سے بھی کہتے ہیں کہ والد صاحب کی دوسری شادی کرادو؛ تو وہ منع کریں گے۔ کیوں؟ اس لئے کہ نئی بیوی آئے گی تو املاک

کے اندر حصہ دینا پڑے گا۔ ہمارا ذہن کہاں جاتا ہے، اللہ کی پناہ۔ بات تو اصل اتنی ہی ہے اور کچھ نہیں۔ اس کے نتیجہ میں کہاں کہاں کیا کیا ہو رہا ہے۔ وہ عورت بھی نادان ہے، وہ خود تو اپنی کمزوری، اپنی بیماری اور اپنی عمر کے تقاضہ کی وجہ سے حق ادا کرنے سے قاصر ہے، اس کے باوجود اجازت نہیں دیتی، حالانکہ اس کی اجازت شریعت نے ضروری نہیں رکھی ہے۔ اصل مسئلہ تو یہی ہے، لیکن پھر بھی وہ رکاوٹیں ڈالنے کی کوششیں کرتی ہے، پھر اگر شوہر دوسری راہ تلاش کر لے اور پتہ چلے تو اس کو مان لے گی، یہ اس کو گوارہ ہے، اس پر خاموشی اختیار کر لے گی۔ ہم تو چونکہ دار الافتاء لے کر بیٹھے ہیں اس لئے ہمارے پاس تو ایسے بے شمار کیس آتے ہیں۔

بلکہ مَیں آپ کو بتاؤں کہ اب تو یہاں تک ہو گیا ہے کہ مثلاً خوش حال گھرانہ ہے، شوہر کو اللہ تعالیٰ نے مال وثروت دے رکھا ہے، اس کو خیال آتا ہے کہ مَیں دوسری بیوی کو نبھا سکوں گا، اب جیسے ہی بیوی کو یہ اندیشہ ہوتا ہے تو وہ کام کاج کے لئے نوجوان اور پُرکشش نوکرانی رکھتی ہے اور اس کو خوب پیسے دیتی ہے اور پھر صبح کے وقت اس سے کہتی ہے کہ جاؤ! بھائی کو اٹھا کر آؤ۔ بیوی جانتی ہے کہ یہ وہاں جائے گی تو کیا ہونے والا ہے، لیکن کچھ بھی نہیں ہمارے سماج میں ایسے قصے ہو رہے ہیں اور ہمارے پاس تو آتے ہیں۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟

صبح تک فرشتے لعنت کرتے ہیں

شریعت نے جو یہ کہا ہے کہ عورت شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکل سکتی؛ یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ اور شریعت نے شوہر کی اس ضرورت کو پورا کرنے کا اتنا زیادہ اہتمام کرایا کہ حدیثِ پاک میں یہاں تک آتا ہے کہ اگر شوہر نے عورت کو اپنی

ضرورت پوری کرنے کے لئے بلایا لیکن وہ نہیں آئی اور شوہر اس کی وجہ سے صبح تک ناراض رہا؛ تو ایسی عورت پر فرشتے صبح تک لعنت کرتے رہتے ہیں۔ (بخاری شریف، ۳۲۳۷)

کتنا سخت ارشاد ہے!!

اور بھی سن لیجیے۔ تین آدمی ایسے ہیں جن کی نماز قبولیت کے لئے ان کے سر سے اوپر نہیں جاتی، ان میں ایک وہ عورت بھی ہے جس کا شوہر اس سے ناراض ہو (مصنف بن ابی شیبہ، ۴۱۰۹) ایسی بے شمار احادیث ونصوص آخر کیوں بیان کئے گئے ہیں؟ آپ صرف اس کے ظاہری اسباب کو نہ دیکھئے، دراصل آدمی کی پاک دامنی اور عفت وعصمت کی حفاظت کے لئے شریعت نے ایک نظام بنایا ہے، اور شریعت یہ چاہتی ہے کہ اس نظام میں ذرہ برابر رخنہ اندازی نہیں ہونی چاہیے، اگر رخنہ پڑا تو پھر سب معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔

زنا کی سزا اتنی سخت کیوں؟

اسی لئے عفت وعصمت کی خلاف ورزی پر سخت سے سخت سزائیں مقرر کی ہیں مثلاً کوئی آدمی زنا کرلے، تو اگر شادی نہیں ہوئی ہے تو سو کوڑے مارے جائیں گے، اور اگر شادی شدہ ہے اور زنا کرے، تو پتھر مار مار کر ختم کر دیا جائے گا کہ شادی ہوگئی ہے اور اس کے بعد بھی ایسا کیا؟ یعنی تیرے لئے تو اس گناہ کا کوئی امکان ہی نہیں تھا، تیری ضرورت پوری کرنے کے لئے تو جگہ موجود تھی، اس کے باوجود تو نے ایسا کیوں کیا؟

”ملکِ متعہ“ کا مطلب

بہر حال! مَیں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ نکاح کے نتیجہ میں شوہر فقط اس سے فائدہ اٹھانے کا مالک ہوتا ہے۔ جہاں مسئلے بتلائے جاتے ہیں وہاں اسی کو فقہاء ”ملکِ متعہ“

سے تعبیر کرتے ہیں۔اب مصیبت تو یہ ہے کہ ہمارے پڑھنے والے طلبہ بھی لفظ ''متعہ'' کا حقیقی مطلب نہیں سمجھتے، پتہ نہیں کیا سے کیا سمجھتے ہیں۔حالانکہ ''متعہ'' کا مطلب تو صرف اتنا ہی ہے کہ فائدہ اٹھانے کی چیز۔اور فائدہ اٹھانے کا جو حق دیا گیا اسی کو ''ملکِ متعہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے،اور نکاح اسی لئے کیا جاتا ہے۔

نکاح کیوں کروایا جاتا ہے؟

اب ہمارے سماج میں اس کے علاوہ دوسرے مقاصد کیا ہیں وہ بھی دیکھئے۔مثلاً نکاح اس واسطے کرر ہے ہیں کہ گھر میں کوئی کام کرنے والی نہیں ہے،اس لئے بیٹے کا نکاح جلدی کرادو، نکاح کراتے وقت ہی یہ جذبہ کارفرما ہے۔خیر! وہ بھی ضمناً ہو،اور دونوں طرف سے تعاون ہو؛ تو کوئی گناہ بھی نہیں ہے،لیکن بعض ماں باپ اسی لئے نکاح کروا کر لاتے ہیں حالانکہ ان کو معلوم ہوتا ہے کہ بیٹا نامرد ہے، پہلے بھی ایک شادی ہو چکی تھی، عورت کے حق ادا کرنے کی اس میں طاقت ہی نہیں ہے،ڈاکٹروں سے معاینہ کروایا جاچکا ہے،تمام ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر رپورٹ دے دی ہے کہ وہ عورت کا حق ادا کرنے کے قابل نہیں ہے، پھر بھی یہ چیز لڑکی والوں سے چھپا کر نکاح کروادیتے ہیں،اس کے بعد کتنے بڑے بڑے فتنے پیدا ہوتے ہیں؛ یہ ہم اور آپ سب جانتے ہیں،جس کی تفصیل میں جانے کی اس وقت ضرورت نہیں ہے۔حالانکہ شریعت نے نکاح تو عفت و پاکدامنی کے لئے رکھا تھا،لیکن ایسا نکاح تو زنا کا دروازہ کھولتا ہے،اور ایسے واقعات ہورہے ہیں،اس لئے مَیں بہت واضح طور پر یہ بات پیش کررہا ہوں۔لہٰذا ماں باپ کو اس طرف بھی خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ سب کو صحیح سمجھ عطا فرمائے

اَلْوَصِيَّةُ بِالنِّسَآءِ

عورتوں کے بارے میں تاکید

مجلس (۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عورتوں کے متعلق نبی کریم ﷺ نے جو تاکید فرمائی ہے اسی کا بیان چل رہا ہے، اس سلسلہ میں کچھ باتیں گذر چکی ہیں آج اس سے آگے کچھ اور باتیں پیش کی جاتی ہیں۔

کھانا پکانا عورت کے ذمہ نہیں

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سنو! عورتوں کے سلسلہ میں میری طرف سے بھلائی اور حسنِ سلوک کی نصیحت قبول کرو، اس لئے کہ وہ تمہارے ماتحت قیدی کی حیثیت سے ہیں۔

پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿لَیْسَ تَمْلِکُوْنَ مِنْھُنَّ شَیْئًا غَیْرَ ذٰلِکَ﴾ تمہاری ماتحتی میں ہیں، اور ایک مرد ایک عورت سے جو فائدہ اٹھاتا ہے اسی کے لئے نکاح ہوا ہے، بس! اس کے علاوہ اور کوئی اختیار تم کو ان پر حاصل نہیں ہے۔

فقہاء اور شراحِ حدیث نے اس جملہ کی جو تشریح کی ہے، مردوں کے مجمع میں جب اس کو بیان کیا جاتا ہے تو مردوں کے تیور بدل جاتے ہیں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ تمہاری ماتحتی میں ہیں اور ایک مرد عورت سے جو فائدہ اٹھاتا ہے وہ تم اس سے اٹھا سکتے ہو اور اسی لئے اس کو گھر میں رہنے کا پابند کیا گیا ہے، بس! یہ اس کی ذمہ داری ہے، باقی اس کے علاوہ اس کے متعلق جو کچھ سمجھا جاتا ہے، ایسی کوئی ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوتی، یہاں تک کہ کھانا پکانے کی ذمہ داری بھی شرعاً عورت کی نہیں ہے۔

عورتیں دو طرح کی ہوتی ہیں

ویسے فقہاء نے لکھا ہے کہ دو قسم کی عورتیں ہیں، ایک تو وہ عورت ہے جو بیوی بن کر آپ کے گھر میں آئی اس سے پہلے اپنے گھر میں جہاں رہتی تھی وہاں بھی کھانا پکایا

نہیں کرتی تھی بلکہ اس کے ماں باپ کے یہاں اس کو پکاپکایا کھانا ملا کرتا تھا؛ تو اس صورت میں شوہر پر دیانۃً یعنی فیما بینہ و بین اللہ اور قضاءً یعنی فیما بینہ و بین الناس یہ لازم ہے کہ پکا پکایا کھانا لاکر مہیا کرے، اگر شوہر عدالت میں جائے گا تو وہاں سے بھی یہی حکم دیا جائے گا کہ اس عورت کو پکاپکایا تیار کھانا لاکر دیا کرو، اور عورت اس کا مطالبہ کرسکتی ہے۔

آپ لوگ کہیں گے کہ عورتوں تک آواز جارہی ہے اور وہ سن رہی ہیں، اب تو ہمارے لئے مسائل کھڑے ہوجائیں گے۔

ہمارے ایک دوست پوچھ رہے تھے کہ اتوار کا دن آتا ہے تو بیوی کہہ دیتی ہے کہ آج تو مَیں کھانا نہیں پکاؤں گی، باہر سے تیار کھانا منگوادو؛ اس کا یہ کہنا کیسا ہے؟ مَیں کیا کروں؟ مَیں نے کہا کہ وہ صرف ایک دن کہتی ہے یہی غنیمت ہے، شکرادا کرو، اگر آج کا بیان سن لے گی تو پتہ نہیں وہ کیا کہے گی۔

خیر! فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر وہ پکاپکایا کھانے کا مطالبہ کرے تو اس کے لئے وہ مہیا کیا جائے گا، آپ کا اور آپ کے بچوں کا کھانا پکانے کی بھی ذمہ داری اس کی نہیں ہے۔

تب صرف اپنا کھانا پکائے گی

اور دوسری عورت وہ ہے کہ جو اپنے ماں باپ کے یہاں تھی تو کھانا خود پکایا کرتی تھی تو اس صورت میں بھی قضاءً یعنی فیما بینہ و بین الناس پکانے کی ذمہ داری اس کی نہیں ہے، یعنی عدالت کے ذریعہ حکم صادر کرواکر تو یہ کام اس سے کروایا نہیں جاسکتا، ہاں! دیانۃً یعنی فیما بینہ و بین اللہ اور اخلاقی اعتبار سے وہ کھانا پکائے گی، لیکن وہ بھی صرف اپنا ہی، کہ آپ کچا سامان لاکر اس کو دے دو کہ اپنا کھانا پکا کر کھالو۔ یہاں بھی آپ کا اور بچوں کا کھانا پکانے کی ذمہ داری اس کی نہیں ہے۔

ساس خسر کی خدمت عورت پر فرض نہیں

لیکن ہمارے سماج میں تو گویا سارے حقوق کی بنیاد ہی یہ سمجھی جاتی ہے، جو ہم اپنے طور پر سمجھ رہے ہیں۔ اگر کھانے میں نمک بھی کم ہو گیا تو پیالہ اٹھا کر ماردیں گے گویا یہ اس کی طرف سے بہت بڑی کوتاہی ہے، حالانکہ اس نے کھانا پکا کر دیا یہی اس کا بڑا احسان ہے۔ اسی طرح دوسری خدمتیں ہیں، یہی حال شوہر کے ماں باپ یعنی ساس سسر کی خدمت کا ہے۔

ہمارے معاشرے و سماج میں تو مزاج یہ بنا ہوا ہے کہ شوہر کے ماں باپ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ اپنے شوہر کی خدمت کرے یا نہ کرے؛ ہماری خدمت تو اس کو کرنی ہی ہے، اس پر ہمارا حق اس کے شوہر سے بھی زیادہ ہے۔ حالانکہ کتابوں میں صاف لکھا ہے کہ وہ تو شوہر کے ماں باپ ہیں، ان کی خدمت کی ذمہ داری تو شوہر کی ہے، اگر وہ بیمار بھی ہیں تو شوہر کے لئے ضروری ہے کہ ان کی خدمت کرے، اگر یہ عورت اپنے شوہر کے ساتھ تعلق کی وجہ سے اخلاقاً شوہر کے ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرتی ہے اور ان کی خدمت کرتی ہے تو شوہر کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اس کا احسان ہے۔ ہمارے یہاں معاشرہ سماج و سوسائٹی میں ساس بہو کے اور نند بھاوج کے جو جھگڑے ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے بہت سارے گھر برباد ہو جاتے ہیں؛ وہ اسی وجہ سے ہوتے ہیں۔ حالانکہ کتابوں میں یہ مسئلہ صاف لکھا ہے کہ شوہر کے ماں باپ بیمار بھی ہوں تو ان کی خدمت کی ذمہ داری شوہر کی ہے، وہ اگر نہیں کرسکتا تو اس کے لئے ملازم کا انتظام کرے، اگر ماں کا معاملہ ہے تو نوکرانی اور خادمہ رکھ دے؛ لیکن شوہر اپنی بیوی پر جبر نہیں کرسکتا۔ ہاں! اگر وہ خوشی سے یہ سمجھ کر کہ شوہر کا کام ہے، اور اس کے ماں باپ کی بھی خدمت

کرنی چاہیے، اور گھر کا ماحول بھی درست رہے، اس لئے اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہوئے شوہر کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کرتی ہے تو دوسری بات ہے اور یہ اس کا بڑا احسان ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں بیوی یہ سب کام کرتی ہے پھر بھی کبھی اس کا احسان نہیں سمجھا جاتا، شوہر کے دل میں یا اس کے ماں باپ کے دل میں یا شوہر کے بھائی بہنوں کے دل میں بھولے سے بھی کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ یہ سب کام جو کر رہی ہے وہ اس کا احسان ہے بلکہ وہ لوگ تو یوں سمجھتے ہیں کہ یہ اس کا فریضہ ہے، اس میں اس نے کون سی دھاڑ ماردی؟ اور کون سا کمال کر دیا؟ حالانکہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے خلیفہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے لکھا ہے کہ وہ ایک قصہ بیان کیا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی نے ان کی دعوت کی، وہ حضرت سے بیعت تھے اور ان کی گھر والی بھی حضرت سے بیعت تھی، آپ وہاں کھانے کے لئے تشریف لے گئے، آپ کی عادت تھی کہ کھانے کے بعد گھر والوں کا شکریہ ادا کیا کرتے تھے کہ آپ نے کھانا پکایا، ماشاء اللہ بڑا لذیذ اور اچھا پکا تھا۔ جب کھانے سے فارغ ہو کر جانے لگے تو چونکہ گھر والی بھی بیعت تھی اس لئے پردہ کے پیچھے سے اس نے سلام کیا، حضرت نے سلام کا جواب دینے کے بعد شکریہ کے کلمات کہے کہ آپ نے کھانا بڑا عمدہ پکایا، بہت پسند آیا (اور ایسا کہنا چاہیے تاکہ ان کا حوصلہ بڑھے اور دلجوئی بھی ہو جائے) حضرت ڈاکٹر صاحب کے اس کہنے پر اندر سے رونے اور سسکیوں کی آواز آئی تو حضرت فرماتے ہیں کہ میں گھبرا گیا کہ پتہ نہیں کیا بات ہوئی، کیا میری طرف سے کوئی ایسی چیز پیش آئی۔ مَیں نے کہا کہ کیا

میری طرف سے کوئی تکلیف پیش آئی؟ اندر سے کہا کہ نہیں حضرت! یہ جو آپ کے ساتھ کھڑے ہیں نا، چالیس سال سے کھانا پکا کر ان کو کھلا رہی ہوں، ایک دن بھی انہوں نے یہ جملہ نہیں کہا کہ تم نے کھانا بہت اچھا پکایا، آج آپ کی تو ہم نے پہلی مرتبہ دعوت کی اور آپ یہ کہہ رہے ہیں؛ اس لئے میرا جی بھر آیا۔ اور حضرت فرماتے ہیں کہ جو آدمی اپنا حق سمجھے گا وہ کبھی شکریہ کی بات نہیں کرے گا، اور جو آدمی یہ سمجھے گا کہ اس کا احسان ہے؛ وہ البتہ ممنون ہوگا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔

دنیا میں جنت کی حوریں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ہندوستان و پاکستان اور ایشیائی ممالک کی عورتیں تو جنت کی حوریں ہیں، یہ ہماری خدمت کرتی ہیں اور شوہر جب تک گھر آ کر کھانا نہیں کھالیتا وہاں تک یہ بے چاری کھانا تک کھانے کے لئے تیار نہیں ہوتیں۔ جب تک شوہر کو کھلا نہیں دیتی وہاں تک حلق سے ایک لقمہ نہیں اتارتی۔ یوروپین ممالک کی اقوام میں میاں بیوی کے جو تعلقات ہیں اور وہاں آپس کے جو معاملات ہوتے ہیں، ان سے آپ واقفیت حاصل کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا۔ اور اب تو یہ چیزیں دھیرے دھیرے ہماری طرف بھی آتی جا رہی ہیں۔ اس لئے حضرت فرماتے ہیں کہ جب بیوی آپ کی خدمتیں کرتی ہے تو آپ کو اس کا احسان بھی ماننا چاہیے اور اس احسان کے مطابق ان کے ساتھ سلوک بھی کرنا چاہیے لیکن ہمارے معاشرہ میں ایسا نہیں ہوتا، اسی کے نتیجہ میں گھر برباد ہوتے ہیں۔ اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں ﴿لَيْسَ تَمْلِكُوْنَ مِنْهُنَّ شَيْئًا غَيْرَ ذٰلِكَ﴾ عورت پر تم کو اس کے علاوہ اور کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

یہ شوہر کا حق ہے

لیکن جہاں مردوں کے لئے یہ ہدایات ہیں؛ وہیں عورتوں کے لئے بھی یہ حکم ہے کہ وہ شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکل نہیں سکتیں۔ یعنی محلّہ میں کسی کے یہاں تھوڑی دیر کے لئے بھی جانا ہو، تب بھی اس کے لئے شوہر کی اجازت لینا ضروری ہے، شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلنا عورت کے لئے کسی حال میں بھی درست نہیں ہے، یہ شوہر کا حق ہے اس میں بھی کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ اِدھر ہوتی ہیں تو اُدھر بھی ہورہی ہیں۔ ہمارے سماج میں عورتیں شوہر سے اجازت لینے کو ضروری ہی نہیں سمجھتیں، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا سبق آموز عمل

بخاری شریف میں روایت موجود ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت والا واقعہ جب پیش آیا اور لوگوں میں اس کا چرچا ہو رہا تھا، ایک مہینہ تک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیمار تھیں اس وجہ سے ان کو اس بات کا پتہ ہی نہیں تھا کہ ان کے متعلق باہر ایسی باتیں ہورہی ہیں، ایک مرتبہ وہ قضائے حاجت کیلئے جارہی تھیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خالہ زاد بہن حضرت ام مسطح رضی اللہ عنہا ساتھ تھیں، راستہ میں ان کو ٹھوکر لگی تو انہوں نے اپنے بیٹے حضرت مسطح کے لئے کچھ بددعائیہ کلمات استعمال کئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو ٹوکا کہ ایسا مت کہو۔ اس پر انہوں نے کہا کہ تمہاری وجہ سے تو میں ان کو بددعا دے رہی ہوں۔ پوچھا کہ کیا بات ہوئی؟ انہوں نے کہا کہ تمہیں معلوم نہیں؟ اور پھر انہوں نے پورا قصہ سنایا کہ تمہارے متعلق لوگ ایسی باتیں کررہے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فوراً گھر واپس لوٹیں اور انہوں نے جو بات کہی تھی اس کے متعلق معلوم کرنا چاہتی تھی کہ کیا

واقعۃً لوگوں میں ایسی باتیں ہورہی ہیں یا نہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ گھر میں تشریف لائے تو مَیں نے اجازت چاہی کہ اگر آپ اجازت دیں تو مَیں اپنے ماں باپ کے گھر جاؤں (بخاری شریف،۳۹۱۰) حالانکہ جو لوگ مسجدِ نبوی گئے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ خوخہ ٔابوبکر مسجد کے اُس کنارے پر ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ مسجد کے اِس کنارے پر ہے، گویا نبی کریم ﷺ کے مکان سے حضرت ابوبکر کا مکان اتنا ہی دور تھا جتنا یہ جماعت خانہ اِدھر سے اُدھر ہے۔ بس اتنا ہی دور جانا تھا اور صرف یہی معلوم کرنا تھا کہ واقعۃً لوگوں میں ایسی باتیں ہورہی ہیں یا نہیں، اور نبی کریم ﷺ کے آنے سے پہلے ہی چند منٹ میں معلوم کرکے آسکتی تھیں، لیکن وہ نہیں گئیں، چونکہ شریعت کا یہی حکم ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر عورت گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی، اور یہ شوہر کا حق ہے لیکن اس میں عورتوں کی طرف سے بڑی کوتاہی ہوتی ہے۔

اگر بیوی کھلی نافرمانی کرے......

بہرحال! نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ تمہیں ان پر اس کے علاوہ اور کوئی اختیار حاصل نہیں ہے ﴿اِلَّآ أَن يَّأْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ البتہ اگر وہ کھلّم کھلاّ کسی فاحشہ کا ارتکاب کریں۔ ''فاحشہ کا ارتکاب'' سے کیا مراد ہے؟ بعضوں نے کہا کہ زنا کا ارتکاب کرے، یا شوہر کی نافرمانی میں مبتلا ہو ﴿فَاِنْ فَعَلْنَ فَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ﴾ اگر وہ ایسا کرتی ہیں کہ شوہر کی نافرمانی کرتی ہیں تو پھر اصلاح کے لئے ان سے بستر الگ کرلو۔ اس کی تفصیل پہلے بتا چکا ہوں ﴿وَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْباً غَيْرَ مُبَرِّحٍ﴾ اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو پھر ان کی ایسی پٹائی بھی کرسکتے ہو جو سخت نہ ہو۔ ﴿غَيْرَ مُبَرِّحٍ: اَلضَّرْبُ الْمُبَرِّحُ هُوَ الشَّاقُّ الشَّدِيْدُ﴾ امام نوویؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ضرب مبرح ایسی پٹائی کو کہتے ہیں جو بہت سخت ہو،

اور جس سے جسم پر نشان پڑ جائے، یعنی اگر پہلی تدبیر سے کام نہ چلے تو پھر غیر مبرح پٹائی کرو۔

﴿فَاِنْ أَطَعْنَکُمْ فَلاتَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلاً﴾ اگر تمہارے سمجھانے سے یا بستر الگ کر دینے سے یا ایک آدھ مرتبہ معمولی پٹائی کرنے سے وہ تمہاری بات ماننے لگیں اور نافرمانی سے باز آجائیں تو پھر آگے کوئی سخت اقدام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مرد کے حقوق عورتوں پر

﴿أَلااِنَّ لَکُمْ عَلیٰ نِسَآئِکُمْ حَقًّا﴾ سنو! تمہارا تمہاری عورتوں پر حق ہے ﴿وَلِنِسَآئِکُمْ عَلَیْکُمْ حَقًّا﴾ اور تمہاری عورتوں کا تم پر حق ہے۔

﴿فَحَقُّکُمْ عَلَیْهِنَّ أَن لَّایُوْطِئْنَ فُرُشَکُمْ مَنْ تَکْرَهُوْنَ﴾ تمہارا حق ان پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی ایسے آدمی کو آنے نہ دیں جس کے آنے کو تم پسند نہیں کرتے ﴿وَلایَأْذَنَّ فِیْ بُیُوْتِکُمْ لِمَنْ تَکْرَهُوْنَ﴾ اور تمہارے گھر میں بھی ایسے آدمی کو آنے نہ دیں جن کا آنا تمہیں گوارا نہیں ہے، چاہے وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ شوہر کی اجازت کے بغیر گھر میں کوئی نہ آئے، چاہے عورت کے ماں باپ، بھائی بہن ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر شوہر کو ان کا آنا ناپسند ہے تو ان کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہے، اگر وہ ملنے بھی آویں تو باہر کھڑے رہ کر مل سکتے ہیں شوہر کے کہے بغیر گھر کے اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہمارے سماج میں اس بات کو سمجھنے میں بھی بڑی کوتاہی ہوتی ہے۔

عورتوں کے حقوق مرد پر

﴿أَلاوَحَقُّهُنَّ عَلَیْکُمْ أَنْ تُحْسِنُوْا اِلَیْهِنَّ فِیْ کِسْوَتِهِنَّ وَطَعَامِهِنَّ﴾ سنو! اور ان کا حق تم پر یہ بھی ہے کہ ان کے ساتھ ان کے لباس اور ان کے کھانے پینے کے معاملہ میں یعنی ان کے نفقہ اور کسوہ میں اچھائی اور بھلائی کا سلوک کرو۔ ویسے تو شوہر ان کے لئے لباس

اور کھانے پینے کا انتظام کرتے ہیں لیکن حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ حدیثِ پاک میں صرف کھانے پینے کے انتظام کا حکم نہیں ہے بلکہ ﴿تُحْسِنُوْا﴾ کا حکم ہے کہ ان کے ساتھ کھانے پینے اور لباس کے معاملہ میں احسان، اچھائی اور عمدگی کا سلوک ہونا چاہیے۔ بعض لوگ بقدرِ ضرورت کھانے اور لباس کا انتظام کردیتے ہیں اس سے نبی کریم ﷺ کی اس ہدایت اور حکم کا حق ادا نہیں ہوتا، بلکہ کھانے پینے اور لباس کے علاوہ عورت کو جیب خرچ کے نام سے کچھ رقم الگ سے بھی دینی چاہیے، تاکہ وہ اپنی کوئی ضرورت آزادانہ طور پر پوری کرسکے، اس لئے کہ بعض ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کا زبان سے اظہار نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آدمی کی جیسی جیسی مالی پوزیشن بنائی ہو، اس کے مطابق ان کے ساتھ فراخی اور کشادگی کا معاملہ کیا جانا چاہیے۔ اور کھانے پینے کے معاملہ میں بھی جس کا جیسا جیسا زندگی کا معیار ہو اس کے مطابق سلوک ہونا چاہیے، مثلاً ایک غریب آدمی ہے تو اس کے کھانے پینے کا اور لباس کا انتظام کرے۔ متوسط آمدنی والا آدمی اپنے گھر والوں کے لئے اسی کے مناسب انتظام کرے اور اعلیٰ آمدنی والا خوشحال صاحبِ ثروت آدمی اس کی حیثیت کے مناسب گھر والوں کے لئے انتظام کرے، اسی کی شریعت ہدایت دیتی ہے۔

رہائش، آسائش، آرائش اور نمائش

اور رہائش کا انتظام بھی ضروری ہے جیسا کہ دوسری روایتوں سے ثابت ہوتا ہے، اور کتبِ فقہ میں اس کی تفصیلات موجود ہیں کہ نفقہ میں تین چیزیں آتی ہیں، کھلانا پلانا، کپڑا، اور رہائش۔ اور جیسا کہ پہلے بتلایا تھا کہ اس میں وسعت سے کام لے، بخل اور تنگی سے کام نہ لے، بلکہ ہر آدمی اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے مالی اعتبار سے جو حیثیت دے رکھی ہے، اس کا لحاظ کرتے ہوئے بیوی پر خرچ کرنا چاہیے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں بڑی عجیب وغریب بات ارشاد فرمائی ہے کہ ایک تو آدمی کی ضرورت ہوا کرتی ہے جیسے مکان رہنے کی ضرورت کے لئے ہے، تو ایک تو رہائش کا درجہ ہے، اس کے لئے تو آدمی ایک جھونپڑا ڈال دے تو اس کے ذریعہ بھی سردی گرمی سے بچاؤ ہو جائے گا اور رہنے کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔

لیکن اس سے آگے کا ایک درجہ آسائش کا ہے کہ ایسا انتظام کیا جائے کہ ذرا راحت اور آرام ملے جیسے پختہ کمرہ ہو اور اس میں جھونپڑے کے مقابلہ آدمی اپنے آپ کو زیادہ محفوظ سمجھے اور راحت زیادہ محسوس کرے، تو آسائش کی بھی شریعت اجازت دیتی ہے۔

اس کے بعد اس سے آگے آرائش اور زینت کا درجہ ہے یعنی ذرا اچھا لگے جیسے آدمی نے مکان پختہ بھی بنوالیا اور پلاسٹر بھی کروالیا اور اندر بجلی، پنکھا وغیرہ بھی موجود ہے، اس میں رہائش اور آسائش دونوں ہیں لیکن ابھی رنگ روغن نہیں کروایا، اگر رنگ روغن کروالے گا تو ذرا اچھا لگے گا؛ تو یہ آرائش ہے اور اس کی بھی اجازت ہے۔

لباس کے معاملہ میں بھی ان تینوں درجات کی شریعت اجازت دیتی ہے کہ ایسا لباس پہنا جائے جو اچھا ہو اور گھر والوں کو بھی پسند آوے، اگر کوئی آدمی لباس میں اس کا اہتمام کرتا ہے تو اس میں شرعی اعتبار سے کوئی قباحت نہیں ہے۔

کیا یہ بھی کبر ہے؟

حدیثِ پاک میں بھی آتا ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ﴿لَایَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ کِبْرٍ﴾ جس آدمی کے دل میں کبر کا ایک ذرہ بھی ہوگا وہ جنت میں نہیں جا سکے گا، اس پر ایک آدمی نے پوچھا ﴿یَارَسُوْلَ اللهِ اِیُحِبُّ الرَّجُلُ أَنْ یَّکُوْنَ ثَوْبُهٗ حَسَنًا وَنَعْلُهٗ حَسَناً﴾

اے اللہ کے رسول! ایک آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو اور اس کا جوتا اچھا ہو؛ تو کیا یہ بھی کبر ہے؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کبر اس کا نام نہیں ہے بلکہ ﴿اَلْکِبْرُ بَطْرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ﴾ کبر تو یہ ہے کہ آدمی حق وانصاف کی بات نہ مانے، اس کو ٹھکرادے اور لوگوں کو دل سے حقیر سمجھے (ترمذی شریف، ۱۹۹۹) باقی اگر اپنا اور اپنے گھر والوں کا اور دوستوں کا جی خوش کرنے کے لئے اچھا لباس پہنتا ہے؛ تو اس کا نام کبر نہیں ہے۔

نمائش ناجائز

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد چوتھا درجہ نمائش اور دکھلاوے کا آتا ہے کہ آدمی اچھا مکان اس لئے بناتا ہے اور عمدہ لباس اس لئے پہنتا ہے تاکہ لوگ دیکھ کر یہ سمجھیں کہ بڑا مالدار اور بڑی حیثیت والا ہے، لوگوں میں نام اور شہرت ہو، اگر یہ جذبات ہیں تو پھر شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ بہر حال! عورتوں کا بھی ان کے کھانے پینے، لباس اور ضرورتوں کے معاملہ میں اپنی حیثیت کے مطابق خیال رکھنا چاہیے اور ان کی ضرورت پوری کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

بیوی کا کیا حق ہے؟

۲۷۷. وَعَنْ مُعَاوِيَةَبْنِ حَيْدَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللهِ!مَاحَقُّ زَوْجَةِ أَحَدِنَا عَلَيْهِ؟ قَالَ:أَنْ تُطْعِمَهَااِذَاطَعِمْتَ، وَتَكْسُوَهَااِذَااكْتَسَيْتَ،وَلاَ تَضْرِبِ الْوَجْهَ،وَلاَ تُقَبِّحْ، وَلاتَهْجُرْاِلَّا فِيْ الْبَيْتِ.
(حديث حسن. رواه أبوداؤد)

حضرت معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کسی کی بیوی کا اس پر کیا حق ہے؟ نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جب تم کھاؤ تو اس کو بھی کھلاؤ، جب تم کپڑے پہنو تو اس کو بھی کپڑے پہناؤ اور اس کو چہرہ پر مت مارو، اور اس کو کوسنا مت دو، اور ان کو نہ چھوڑو مگر گھر ہی میں۔

افادات:-''جب تم کھاؤ تو اس کو بھی کھلاؤ، جب تم کپڑے پہنو تو اس کو بھی کپڑے پہناؤ'' کا مطلب یہ ہے کہ اس کا نفقہ یعنی کھلانے پلانے اور کسوہ یعنی لباس کا انتظام کیجیے، جس کو ہمارے یہاں گجراتی میں (ખાવાપીવા, ઓઢવા પહેરવા) کہتے ہیں۔

﴿وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ﴾ اور اگر کسی وجہ سے تادیب کے طور پر مارنے کی ضرورت پیش آئے تو چہرے پر نہ ماریو۔ ویسے جانور کے چہرے پر بھی مارنے کی حدیث میں ممانعت آئی ہے تو پھر ظاہر ہے کہ انسان کے چہرے کا کیا حکم ہونا چاہیے، اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ چہرہ محاسن کا مجموعہ ہے، اور حواس یعنی جن سے آدمی کام لیتا ہے جیسے آنکھ کان زبان وغیرہ یہ سب چہرے ہی میں واقع ہیں، اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ چہرہ پر مارنے کی وجہ سے ان میں سے کوئی ضائع اور برباد ہو جائے اور پھر تکلیف کا باعث ہو۔

اس میں بجائے فائدہ کے نقصان زیادہ ہے

﴿وَلَا تُقَبِّحْ﴾ اور اس کو کوسنا مت دو یعنی طعن و تشنیع مت کرو، اس سے حدیث پاک میں بڑی سختی سے منع کیا گیا ہے، کسی کو بھی طعن و تشنیع کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، بلکہ بعض روایتوں میں تو یہاں تک ہے کہ اگر کسی کو کوئی گناہ کا کام کرتے ہوئے دیکھا اور پھر اپنے کو اس سے بہتر سمجھتے ہوئے اس کو طعن کیا تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ خود جب تک اس گناہ میں مبتلا نہیں ہوگا تب تک اس کو موت نہیں آئے گی (ترمذی شریف، ۲۵۰۵) اس لئے طعن و تشنیع، کوسنے دینا اور برا بھلا کہنے کا معاملہ بڑا سخت ہے۔ عام طور پر گھروں میں ساس اپنی بہوؤں کے ساتھ یہی معاملہ کرتی رہتی ہیں، یا نندیں اپنی بھاوج کو ایسی باتیں سناتی رہتی ہیں، یہ بڑا خطرناک طریقہ ہے، اور نبی کریم ﷺ نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ باندیاں اور غلام جن کے آقا مالک ہوا کرتے ہیں ان

کے معاملہ میں بھی نبی کریم ﷺ نے اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ ان کو کسی بھی بات پر کوسنے نہ دئے جائیں (الادب المفرد،۱۷۲) اس لئے یہ طریقہ آج کے اس زمانہ میں تو اور زیادہ مضر ہے، اوراس میں بجائے فائدہ کے نقصان زیادہ ہے۔

تنبیہ وتادیب کا طریقہ

﴿وَلَا تَهۡجُرۡ اِلَّا فِي الۡبَيۡتِ﴾ اوران کو نہ چھوڑ و مگر گھر ہی میں۔ مطلب یہ ہے کہ اگران کی کسی حرکت پر تنبیہ وتادیب کے لئے اور کسی غلطی سے باز رکھنے کے لئے اگر سزا دینے کی ضرورت پیش آوے تو پہلے تو اس کو بھلے طریقہ سے سمجھایا جائے، اگراس سے وہ اطاعت وفرمانبرداری اختیار کرلے تو بہت اچھا ہے، ورنہ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس سے بستر الگ کرلیا جائے۔ اس دوسرے طریقہ کے سلسلہ میں اس روایت میں یہ بات بتلائی ہے کہ گھر ہی میں بستر الگ ہو یعنی آپ الگ کمرہ میں آرام کریں، یا اسی کمرہ میں رہیں لیکن الگ بستر پر سوئیں لیکن آپ گھر چھوڑ کر چلے جائیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اوراسی سے فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ بستر تو الگ کیا جائے گا لیکن سلام کلام کا سلسلہ بندنہیں کیا جائے گا۔ عام طور پر مکمل قطع تعلق کرلیا جاتا ہے کہ کسی سوال کا جواب نہیں دیتے یا سلام کا جواب نہیں دیا جاتا اورکوئی بات چیت نہیں کی جاتی؛ اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

شوہر چار مہینے سے زیادہ گھر سے باہر نہیں رہ سکتا

اوراسی حدیث کی وجہ سے فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ شوہر کو چاہیے کہ اپنی بیوی کو گھر میں چار مہینہ سے زیادہ کے لئے چھوڑ کر نہ جاوے، اگر چار مہینہ سے زیادہ کے لئے جانا ہے تو بیوی کی اجازت لینا اوراس کی رضامندی حاصل کرنا ضروری ہے، اگراس کی

اجازت ورضامندی حاصل کئے بغیر جائے گا؛ تو شرعاً ایسا کرنا درست نہیں ہے اور گنہ گار ہوگا۔ ہاں! اگر چار مہینے یا اس سے کم کا سفر چاہے دینی یا دنیوی ہو جیسے کاروبار کے لئے ہو، یا حج کے لئے ہو، یا جہاد کے لئے ہو، یا طلبِ علم کے لئے ہو، یا دعوت وتبلیغ کے لئے ہو، یا کسی اور کام کے لئے ہو؛ تو اس میں اجازت لینا ضروری نہیں ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے قلمرو اور اپنی حدودِ مملکت میں با قاعدہ اس بات کا اعلان کرایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادتِ شریفہ تھی کہ رعایا کے حالات معلوم کرنے کے لئے مدینہ منورہ میں رات کے وقت گشت کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ رات کو گشت کر رہے تھے، کسی مکان میں سے کچھ اشعار کی آواز آئی، آپ نے کان لگا کر دھیان سے سنا تو معلوم ہوا کہ کوئی عورت اپنے شوہر کے فراق وجدائی میں اشعار کہہ رہی ہے۔ بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس کا شوہر جہاد میں گیا ہوا ہے، آپ نے اپنی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ ایک عورت بغیر شوہر کے زیادہ سے زیادہ کتنا زمانہ رہ سکتی ہے؟ انہوں بتلایا کہ چار مہینے۔ تو آپ نے یہ حکم جاری کر دیا کہ کوئی بھی آدمی جہاد کے لئے جاوے تو چار مہینے سے زیادہ باہر نہیں رہ سکتا یعنی چار مہینے پورے کرنے سے پہلے اس کو گھر واپس آجانا چاہیے (کنز العمال،۴۵۹۲۴) اسی بناء پر فقہاء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر چار مہینے سے زیادہ کیلئے جانا چاہتا ہے تو بیوی کی اجازت ورضامندی لے کر جا سکتا ہے، اس کی اجازت ورضامندی کے بغیر اگر جائے گا تو شرعاً گنہگار ہوگا۔

سب سے کامل ایمان والا

۲۷۸. عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَاناً

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمام مؤمنین میں ایمان کے اعتبار

أَحْسَنُهُمْ خُلُقاً، وَخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَآئِهِمْ. سے سب سے زیادہ کامل وہ آدمی ہے جو اخلاق کے اعتبار سے سب سے بہتر ہو، تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لئے سب سے بہتر ہوں۔

ظاہرداری کا نام اخلاق نہیں ہے

اخلاق کا مطلب کیا ہے؟ کسی سے صرف ہنس کر پیش آنا جیسے آج کل مزاج بن گیا ہے، یہ مکمل اخلاق نہیں ہیں۔ حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ آج کل ہر چیز اُلٹی ہوگئی ہے، پہلے چراغ تلے اندھیرا ہوتا تھا اور آج کل بلب کے اوپر اندھیرا ہوتا ہے، اسی طرح لوگوں نے اخلاق کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ کوئی آدمی کسی سے ہنس کر پیش آوے اور یہ جملہ کہہ دیا کرے کہ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور بہت اچھا لگا، چاہے اس کے متعلق دل میں نفرت وعداوت اور بغض بھرا ہوا ہو، لیکن زبان سے صرف اتنا کہہ دینے کو اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے، حالانکہ اس کا نام اخلاق نہیں ہے۔

بلکہ آج کل تو یہ ایک فن ہوگیا ہے کہ لوگوں سے کس طرح بات کی جائے تاکہ اس کی وجہ سے ان کو اپنا گرویدہ وفدائی بنایا جاسکے، ایسے انداز سے لوگوں سے بات کرنا جس کی وجہ سے لوگ ہماری تعریف کریں کہ فلاں بڑے اچھے اخلاق سے پیش آنے والا ہے، اپنی بڑائی اور خوبی کے متعلق لوگوں کے دلوں میں اس طرح کی بات پیدا کرنا اور باقاعدہ اس کو فن کی حیثیت سے سیکھنا؛ یہ اخلاق نہیں ہے، بلکہ یہ تو صرف دکھلاوا اور ریاکاری ہے اور حبِ جاہ کے قبیل سے ہے۔ اور اب تو اس کے متعلق کتابیں بھی چھپتی ہیں کہ کس آدمی سے کس انداز سے بات کی جائے۔ شریعت کی اصطلاح میں اس کا نام اخلاق نہیں ہے۔

اخلاق کی حقیقت

بلکہ اخلاق تو دل کے اندر کی کیفیت ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں آدمی غیر اختیاری طور پر اپنے اعضاء وجوارح سے سامنے والے کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتا ہے، اوروہ کیفیت یہ ہے کہ اللہ کی ہر مخلوق کے متعلق دل میں یہ جذبہ ہو کہ یہ میرے اللہ، میرے خالق اور میرے مالک کی مخلوق ہے، مجھے اس کے ساتھ محبت رکھنی چاہیے، مجھے اس کے ساتھ خیر خواہی اور دل سوزی کا معاملہ کرنا چاہیے۔

جیسے اپنے بھائی کے متعلق دل میں یہ جذبہ ہوتا ہے کہ یہ میرا بھائی ہے، مَیں جن ماں باپ کی اولاد ہوں یہ بھی انہی ماں باپ کی اولاد ہے تو جیسے ایک آدمی اپنے سگے بھائی کی خیر خواہی کرتا ہے، اس کے ساتھ اسی رشتہ کی وجہ سے محبت کا سلوک کرتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کے ساتھ ہمیں ایک رشتہ ہے کہ ہمارا پیدا کرنے والا اور ہمارا رب جس کے انعامات ہم ہر گھڑی استعمال کرتے ہیں، اس کا حق یہ ہے کہ اس کی ہر مخلوق کے ساتھ محبت، حسنِ سلوک اور خیر خواہی ودل سوزی سے پیش آیا جائے، اسی کیفیت کے نتیجہ میں آدمی کے دل میں اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق کی بھلائی بھر دی جاتی ہے اور پھر اس سے بے اختیار ایسے افعال سرزد ہوتے ہیں جن سے سامنے والوں کو راحت پہنچتی ہے؛ اصل اخلاق یہ ہیں۔ صرف ظاہری طور پر زبان سے یہ کہہ دینا کہ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور بڑا اچھا لگا اس کا نام اخلاق نہیں ہے۔

اور درحقیقت تصوف وسلوک کے اندر انہی اخلاق کی درستگی پر محنت کی جاتی ہے، اور اہل اللہ کی صحبت میں رہ کر انہی کو سیکھا جاتا ہے، صرف کسی کتاب کے پڑھ لینے سے یہ چیزیں حاصل نہیں ہوا کرتیں۔ بہرحال! حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ

﴿اِیـمَاناً أَحْسَنُهُمْ خُلُقاً﴾ ایمان والوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان کے اعتبار سے وہ آدمی ہے جس کے اخلاق سب سے بہتر ہوں۔

یہ اخلاق تھوڑے ہی ہیں

﴿وَخِیَارُکُمْ خِیَارُکُمْ لِنِسَآئِھِمْ﴾ نبی کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لئے سب سے بہتر ہوں، ایک آدمی کے اخلاق اور حسنِ سلوک کا دنیا میں ڈنکا بج رہا ہے لیکن اس کے گھر والوں کو اس کی طرف سے شکایت ہے؛ تو یہ کون سے اخلاق ہوئے؟ گجراتی میں کہاوت ہے:-

Dth ltt Atufht Dtkxe attxu, WvttDgttgt ltu ytxtu

ساری دنیا میں سخاوت ہورہی ہے اور گھر میں بچے بھوکے مر رہے ہیں، اگر آپ کے اخلاق کی ساری دنیا تعریف کررہی ہے کہ بڑے اچھے، اور بیوی کو آپ کی طرف سے تکلیف پہنچ رہی ہے؛ تو یہ اخلاق تھوڑے ہی ہیں، اسی لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿وَخِیَارُکُمْ خِیَارُکُمْ لِنِسَآئِھِمْ﴾ تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لئے بہتر ہوں، اسی لئے دوسری روایت میں یہ بھی ہے ﴿وَأَنَاخَیَارُکُمْ لِنِسَآئِیْ﴾ اور مَیں اپنی بیویوں کے لئے سب سے بہتر ہوں۔ اور کسی آدمی کے متعلق بالکل صحیح رائے اس کے گھر والے ہی قائم کرسکتے ہیں، وہی بتلائیں گے کہ اخلاق کے اعتبار سے وہ کس درجہ میں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ گھر والوں کے ساتھ آدمی حسنِ سلوک سے پیش آوے۔

اللہ کی بندیوں کو مت مارو

۲۷۹. عن أیاس بن عبداللہ بن أبی ذباب رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: لَاتَضْرِبُوْا اِمَآءَ حضرت ایاس بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے صحابہ کو خطاب کرتے

اللهِ. فَجَآءَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ اِلیٰ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ: ذَئِرْنَ النِّسَآءُ عَلیٰ أَزْوَاجِهِنَّ، فَرَخَّصَ فِیْ ضَرْبِهِنَّ، فَأَطَافَ بِاٰلِ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم نِسَآءٌ كَثِيْرٌ يَشْكُوْنَ أَزْوَاجَهُنَّ، فَقَالَ رسولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَقَدْ أَطَافَ بِاٰلِ بَيْتِ مُحَمَّدٍ نِسَآءٌ كَثِيْرٌ يَشْكُوْنَ أَزْوَاجَهُنَّ، لَيْسَ أُولٰئِكَ بِخِيَارِكُمْ. (رواہ أبوداؤد)

ہوئے فرمایا کہ اللہ کی بندیوں کو مت مارو۔ایک مدت کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اورعرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! عورتیں اپنے شوہروں کے مقابلہ میں شیراورجری بن گئیں۔توحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھراجازت دی کہ ضرورت ہوتو مار سکتے ہو۔پھرتو یہ ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروالوں یعنی ازواجِ مطہرات کے پاس بہت ساری عورتوں نے چکرلگانا شروع کردیا تواس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محمد کے گھروالوں کے پاس بہت ساری عورتیں چکرلگارہی ہیں اوراپنے شوہروں کی شکایتیں کرتی ہیں، جولوگ اپنی بیوی کی پٹائی کرتے ہیں وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔

خبرِ واحد کاحکم صحابہ کے حق میں

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے براہِ راست یہ سن لیں کہ ان کومت مارو،توپھراس بات پرعمل کیسے نہ ہو۔دیکھئے! شریعت کے جودلائل ہیں ان میں ایک تو قرآنِ پاک ہے،اس کاحکم توقطعی ہواکرتا ہے۔اورجوحدیثیں تواتر کوپہنچی ہوئی ہیں ان کاحکم بھی قطعی ہے۔یہاں علماء موجود ہیں وہ جانتے ہیں کہ تواتر کس کوکہتے ہیں،لیکن خبرِ واحد کاحکم ظنی ہوتاہے،اس میں ظنیت اس وجہ سے آئی کہ حضور کا یہ ارشاد بہت سارے واسطوں سے ہم تک پہنچا،ہم نے براہِ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ بات نہیں سنی ہے، بلکہ صحابہ نے سنی ان سے تابعین نے سنی اوران سے تبع تابعین نے سنی،اورپھران سے ان کے شاگردوں نے سنی،اس طرح پانچ دس بیس واسطوں سے ہم تک پہنچی،اب بیچ میں جوواسطے آئے توہوسکتاہے کہ ان سے سننے میں کوئی غلط

فہمی ہوگئی ہو، حضور ﷺ نے کیا فرمایا ہو، اور انہوں نے کیا سنا ہو، یہ ایک امکان ہے ان واسطوں کی وجہ سے اس حدیث میں ظنیت آئی، لیکن حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کا کوئی ارشاد کسی واسطہ سے نہیں بلکہ براہِ راست سنتے تھے، ان کے لئے تو حضور ﷺ کا ہر ارشاد وہی درجہ رکھتا تھا جیسے قرآنِ پاک کی آیت ہو، اُس ارشاد سے جو حکم ثابت ہوتا تھا وہ لازمی اور قطعی ہوا کرتا تھا، اس حکم کی ذرہ برابر بھی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی، یہ تو ایمان اور کفر کا معاملہ ہوجاتا ہے۔

حضور ﷺ کے زمانہ میں ہونے کی تمنا

بعض بزرگوں نے لکھا ہے کہ بہت سی مرتبہ ہم لوگ تمنائیں کرتے ہیں کہ کاش! ہم اُس زمانہ میں ہوتے۔ حالانکہ اُس زمانہ کے تقاضے بڑے سخت تھے، وہاں تو ذراسی بات میں آدمی ایمان سے کفر میں پہنچ جاتا تھا۔ اُس زمانہ کے اندر جو مطالبے تھے معلوم نہیں ہم اپنی عافیت پسندی اور راحت پسندی کی وجہ سے ان تقاضوں پر پورے اترتے یا نہیں۔ اس لئے اس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمتیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی صحبت کے لئے جن حضرات کو منتخب کیا وہ اپنی ان قربانیوں اور ایثار و جان نثاریوں کی وجہ سے اس کے اہل تھے اور ہم تو صرف تمنائیں کرنے والے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جس کو جس زمانہ میں پیدا کیا وہی اس کے لئے بالکل مناسب ہے۔

بہرحال! حضراتِ صحابہ جب براہِ راست نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے ایک بات سن رہے ہیں تو اس میں ذرہ برابر بھی خلاف ورزی نہیں ہوسکتی تھی، وہ حضرات تو فوراً اس پر عمل کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ حضراتِ صحابہ کو خطاب فرما رہے تھے اور فرمایا ﴿اِجْلِسُوْا﴾ بیٹھ جاؤ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مسجد سے باہر تھے، ان

کے کان میں آواز پہنچی تو وہیں بیٹھ گئے، اس لئے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے سنا ﴿اِجْلِسُوْا﴾ تو انہوں نے یہ تاویل نہیں کی کہ اندر جا کر بیٹھنے کے لئے کہا ہے، اس لئے کہ ان کے یہاں تاویل کا کوئی دروازہ تھا ہی نہیں۔ جب نبی کریم ﷺ نے ان کو دیکھا تو کہا کہ اندر آجاؤ۔ (ابوداود،۱۰۹۱)

یہ عورتیں شیر بن گئیں

خیر! جب نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے حضرات صحابہ نے یہ سن لیا کہ اللہ کی بندیوں کو مت مارو، تو بس! بات ختم ہوگئی، تمام صحابہ نے یک لخت ان کو ہاتھ لگانا بھی چھوڑ دیا، اس کے بعد کوئی کچھ نہیں کہتا تھا۔ جب یہ سلسلہ ہوا تو ایک مدت کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ نے منع فرما دیا کہ عورتوں کو مارو مت، آپ کے اس ارشاد پر سب نے ان کو ہاتھ لگانا چھوڑ دیا تو اب یہ عورتیں اپنے شوہروں کے مقابلہ میں شیر اور جری بن گئیں، شوہروں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہیاں کرتی ہیں، ان کے ساتھ زیادتیاں کرنے لگیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آکر یہ حقیقتِ حال بیان کی تو حضور ﷺ نے پھر اجازت دی کہ ضرورت ہو تو مار سکتے ہو۔

عورتوں کو مارنا سنت نہیں

ویسے قرآنِ پاک نے بھی اجازت دی ہے ﴿وَاضْرِبُوْهُنَّ﴾ یہاں علماء نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بھی اجازت تو دی لیکن مارنے کو پسند نہیں فرمایا اور آپ نے خود کبھی کر کے بھی نہیں بتایا اس لئے عورتوں کو مارنا سنت نہیں ہے۔

نسائی شریف کی روایت ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے نہ اپنی کسی بیوی کی کبھی پٹائی کی اور نہ اپنے خادم کی، بلکہ آپ نے اپنے دستِ مبارک سے کسی کو نہیں مارا سوائے جہاد کے۔ (نسائی شریف، ۹۱۶۴) ہاں! جہاں اللہ تعالیٰ کے حکموں کو توڑا جاتا تو وہاں آپ نے غصہ کا اظہار فرمایا، ورنہ کبھی آپ نے کسی کو ہاتھ نہیں لگایا، حضور ﷺ کا طریقہ یہی ہے ویسے بوقتِ ضرورت اگرچہ اجازت دی گئی ہے لیکن نبی کریم ﷺ نے اس کو پسند نہیں فرمایا ہے

وہ اچھے لوگ نہیں ہیں

خیر! جب اجازت مل گئی تو پھر کیا تھا، پھر تو یہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے گھر والوں یعنی ازواجِ مطہرات کے پاس بہت ساری عورتوں نے چکر لگانا شروع کر دیا، چونکہ عورتیں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اپنی باتیں ازواجِ مطہرات یعنی امہات المؤمنین کے واسطہ سے ہی پیش کیا کرتی تھیں اس لئے وہاں آ کر شکایتیں کرنے لگیں کہ ہمارے شوہر ہماری پٹائی کرتے ہیں۔ جب یہ معاملہ ہونے لگا تو اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ محمد کے گھر والوں کے پاس بہت ساری عورتیں چکر لگا رہی ہیں اور اپنے شوہروں کی شکایتیں کرتی ہیں، جو لوگ اپنی بیوی کی پٹائی کرتے ہیں وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اس پر تنبیہ فرمائی۔ اور جیسا کہ پہلے تفصیل سے مَیں بتلا چکا ہوں کہ بوقتِ ضرورت مارنے کی اجازت ہے لیکن سخت مار نہیں بلکہ ہلکی مار ہو، اور ہلکی مار وہ ہے کہ جس کے ذریعہ جسم پر کوئی نشان نہ پڑے۔

دنیا لذت اندوزی کی چیز ہے

۲۸۰. عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ ﷺ قَالَ: اَلدُّنْيَا مَتَاعٌ	حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دنیا؛ فائدہ اٹھانے،

وَخَيْرُ مَتَاعِهَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ. (رواہ مسلم) لذت اندوزی اور ضرورت پوری کرنے کی چیز ہے، اور دنیا کی تمام چیزوں میں سے فائدہ اٹھانے، لذت اندوزی اور ضرورت پوری کرنے کے لحاظ سے بہترین چیز نیک بیوی ہے۔

افادات:- یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا اور اس کی چیزوں کو اسی لئے پیدا کیا کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھاویں اور اپنی ضرورتیں پوری کریں اور لذت حاصل کریں، گویا دنیا کام میں لانے کی چیز ہے۔ ''مَتَاعٌ'' عربی زبان کا لفظ ہے اور وہ ایسی چیز کو کہتے ہیں کہ جو زیادہ قیمتی نہ ہو لیکن اس کے بغیر کام بھی نہ چلتا ہو۔

تین لفظوں کی تحقیق

ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک واقعہ بیان کرتے تھے۔ صاحب بن عباد کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے قرآنِ پاک کے تین لفظوں کی تحقیق مطلوب تھی، ایک تو لفظ ''رَقِيْمٌ'' جو سورۂ کہف میں آیا ہے۔ دوسرا لفظ ''تَبَارَكَ'' جو سورۂ فرقان اور سورۂ ملک میں ہے اور تیسرا لفظ ''مَتَاعٌ''۔ اور ان کی عادت تھی کہ وہ دیہاتوں اور اعراب کے علاقوں میں پہنچ جاتے اور ان کی زبان سنتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں ایک جگہ پہنچا تو دیکھا کہ گھر والے نہیں ہیں اور ایک بچہ بیٹھا ہوا ہے، اتنے میں ایک کتا آیا اور وہ کپڑا جو چولہے پر ہنڈیا وغیرہ پکڑنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اس کو اپنے منہ میں اٹھا کر چلا گیا اور قریب ہی پہاڑ کی چوٹی تھی اس پر جا کر پاؤں پھیلا کر اچھی طرح سے براجمان ہو کر بیٹھ گیا، اس کے بعد جب گھر والے آئے تو اس بچے نے سارا منظر جو دیکھا تھا وہ اس طرح بیان کیا ﴿جَاءَ الرَّقِيْمُ وَأَخَذَ الْمَتَاعَ وَتَبَارَكَ الْجَبَلَ﴾ رقیم یعنی کتا آیا اور متاع یعنی وہی کپڑا (صافی، جو قیمتی نہیں ہوا کرتا لیکن اس کے بغیر کام بھی نہیں چلتا) اُٹھایا اور پہاڑ کی

چوٹی پر چڑھ کر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ (تفسیر حقی ۷/۳۲۲)

نیک بیوی کی چار نشانیاں

خیر! معلوم ہوا کہ جو چیز زیادہ قیمتی نہ ہو اور اس کے بغیر کام بھی نہ چلے اس کو متاع کہتے ہیں، اور دنیا کی بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، دنیا ہے تو بے قیمت چیز، لیکن فائدہ اٹھانے کی چیز ہے اور اس کے بغیر کام بھی نہیں چلتا۔ تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ﴿اَلدُّنْیَامَتَاعٌ وَخَیْرُ مَتَاعِ الدُّنْیَاالْمَرْأَۃُ الصَّالِحَۃُ(صحیح مسلم، حدیث نمبر ۳۷۱۶)﴾ دنیا: فائدہ اٹھانے، لذت اندوزی اور ضرورت پوری کرنے کی چیز ہے، اور دنیا کی تمام چیزوں میں سے فائدہ اٹھانے، لذت اندوزی اور ضرورت پوری کرنے کے لحاظ سے بہترین چیز نیک بیوی ہے۔

نیک بیوی کو نبی کریم ﷺ نے ﴿خَیْرُ الْمَتَاع﴾ یعنی دنیا کی چیزوں میں سے فائدہ اٹھانے کی سب سے بہترین چیز ارشاد فرمایا۔ چنانچہ اسی نیک بیوی کی تشریح خود نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے اندر ابوداود وغیرہ میں موجود ہے ﴿اِذَا نَظَرَ اِلَیْھَا سَرَّتْہُ﴾ شوہر جب اس کو دیکھے تو اس کا جی خوش ہو جائے اور مسرت حاصل ہو ﴿وَاِذَا أَمَرَھَا أَطَاعَتْہُ﴾ اور شوہر اس کو کسی بات کا حکم دے تو وہ اس حکم کو بجالاوے، فرمانبرداری کرے (سنن ابوداود، ۱۶۶۶) اور ابن ماجہ کی روایت میں یہ بھی ہے ﴿وَاِذَا غَابَ عَنْھَا حَفِظَتْہُ فِیْ نَفْسِھَا وَمَالِہٖ﴾ اور جب شوہر گھر سے غیر حاضر ہو تو اپنی ذات اور شوہر کے مال کی حفاظت کرے یعنی اپنی ذات کے معاملہ میں کوئی خیانت نہ کرے، کسی کے ساتھ برائی میں ملوث نہ ہو، اور شوہر کے مال کی بھی پوری امانتداری کے ساتھ حفاظت کرے (سنن ابن ماجہ، ۱۸۵۷) اگر کسی عورت میں یہ صفات ہیں تو اس کو نبی کریم ﷺ نے بہترین عورت ارشاد فرمایا ہے اور ایسی عورت کے ساتھ نکاح کرنے کی نبی کریم ﷺ نے ترغیب دی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ان تمام ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق وسعادت عطا فرمائے۔

حَقُّ الزَّوْجِ عَلَی الْمَرْأَةِ

شوہر کے حقوق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد:—

أعوذباللّٰہمن الشیطان الرجیم بسم اللّٰہالرحمن الرحیم

فَالصَّالِحَاتُ قٰنِتَاتٌ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے معاشرت کے متعلق احادیث کو بیان کرنا شروع کیا ہے، پہلے ایک عنوان گذر چکا تھا جس میں شوہر پر بیوی کے کیا کیا حقوق ہیں ان کو بتلایا تھا، آج دوسرا عنوان قائم کیا ہے جس میں بیوی پر شوہر کا کیا حق ہے اس کو بتلائیں گے۔

اسلام کا خاص انداز

مَیں پہلے بھی یہ بتلا چکا ہوں کہ اسلام کی تعلیمات میں اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ جس پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے اسی کو سامنے رکھتے ہوئے خطاب کیا جاتا ہے کہ تم پر فلاں کے یہ حقوق ہیں جن کی ادائیگی کا تمہیں اہتمام کرنا ہے، گویا جس پر حق واجب ہے اس کو مخاطب بنا کر اور اسی کو حکم دے کر بتلایا جاتا ہے کہ تمہارے اوپر فلاں فلاں کے یہ حقوق ہیں جن کی ادائیگی کا تم اہتمام کرو۔ جن کے حقوق ہیں ان کو یہ نہیں کہا جاتا کہ فلاں پر تمہارے حقوق ہیں، بلکہ جن پر حقوق عائد ہوتے ہیں جنہیں ادائیگی کرنی ہے ان کو مخاطب بنا کر یوں کہا جاتا ہے کہ تمہارے اوپر فلاں فلاں کے یہ حقوق ہیں، تمہیں ان کی ادائیگی کا اہتمام کرنا ہے اور ان کی طرف توجہ کرنا ہے، اگر ان

حقوق کوادا نہیں کروگے تو تمہیں یہ سزادی جائے گی۔

مثلاً باپ کو یوں کہا جائے گا کہ بیٹے کا تمہارے اوپر یہ حق ہے، اگر تم اس حق کوادا نہیں کرتے تو تمہیں اللہ تعالیٰ کے یہاں سزادی جائے گی۔اور بیٹے کو یہ کہا جائے گا کہ تمہارے اوپر باپ کا یہ حق ہے، تمہیں اس کوادا کرنا ہے، اگر تم نے اس کی ادائیگی میں کوتاہی کی تو تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزادی جائے گی۔

اسی طرح شوہر کو خطاب کر کے کہا جائے گا کہ تم پر بیوی کے یہ حقوق ہیں، تمہیں ان کی ادائیگی کا اہتمام کرنا ہے۔بیوی کو مخاطب بنا کر یوں کہا جائے گا کہ تم پر شوہر کے یہ حقوق ہیں، تمہیں ان کی ادائیگی کا اہتمام کرنا ہے۔یہی شریعت کا ایک خاص مزاج ہے کہ ہر وہ معاملہ جس کا تعلق دو فریق سے ہو، دو الگ الگ شخصیتوں سے ہو، یا دو الگ الگ جماعتوں سے ہو، وہاں شریعت جس جماعت پر حق ہوا کرتا ہے اسی کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہتی ہے کہ تمہیں یہ کرنا ہے۔شریعت دوسری جماعت کو یہ کہے گی کہ تم پر پہلی جماعت کا یہ حق ہے، اس کو ادا کرو۔ دوسری کو یہ نہیں کہے گی کہ پہلی جماعت پر تمہارا یہ حق ہے؛ اس کو وصول کرو۔ یا پہلی کو یہ نہیں کہا جائے گا کہ دوسری جماعت پر تمہارا یہ حق ہے؛ وصول کرو۔

اربابِ اموال اور عمال

مثلاً نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں اربابِ اموال ہوا کرتے تھے اور ان کے اموال میں زکوٰۃ واجب ہوا کرتی تھی، اور اس زمانہ میں عرب میں عام طور پر مال مویشیوں کی شکل میں ہوا کرتا تھا، کسی کے پاس بھیڑ بکریاں ہوتیں، کسی کے پاس گائیں ہوتیں اور کسی کے پاس اونٹ ہوتے تھے، تو ان کے لئے بھی شریعت نے نصاب مقرر کیا ہے

جیسے سونے چاندی کے لئے ساڑھے سات تولہ سونا یا چھ سو بارہ اعشاریہ تین پانچ گرام چاندی نصاب ہے، اس پر زکوٰۃ واجب ہوجائے گی، اور اس کا چالیسواں حصہ ادا کرنا فرض ہے۔ اسی طرح جانوروں کا بھی نصاب مقرر ہے مثلاً کسی کے پاس پانچ اونٹ ہیں تو ایک بکری، دس اونٹ ہیں تو دو بکریاں، پندرہ ہیں تو تین بکریاں زکوٰۃ کے طور پر واجب ہوتی ہیں، اسی طرح آگے تفصیل ہے۔ اور اگر کسی کے پاس چالیس بکریاں ہیں تو ایک بکری واجب ہوتی ہے، پھر آگے تفصیلی حساب بتلایا گیا ہے۔ تو مویشیوں میں بھی ایک نصاب ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں آپ ﷺ کی طرف سے زکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے باقاعدہ آدمی مقرر کئے جاتے تھے جن کو ''مُصَدِّق'' یعنی ''زکوٰۃ وصول کرنے والے'' کہا جاتا تھا۔ خلفاءِ راشدین کے زمانہ میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور بعد کے زمانہ میں جو حاکمِ وقت ہوتا تھا وہ ہر علاقہ کے لئے آدمی مقرر کیا کرتا تھا۔ یہ تو ''مُصَدِّق'' یعنی ''زکوٰۃ وصول کرنے والے'' ہوئے۔ اور دوسری طرف وہ اربابِ اموال تھے جن کے پاس یہ لوگ زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے جاتے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ کوئی آدمی جب کسی کے پاس جا کر مالی مطالبہ کرے گا، چاہے وہ شریعت کا فرض اور واجب کیا ہوا ہی ہو، تب بھی جب آدمی کے پاس سے مال جاتا ہے، تو وہاں سے نکلنے کے لئے کچھ پس وپیش تو کرتا ہی ہے، ایسے لوگ بہت ہی کم ہوں گے جو پوری خوش دلی کے ساتھ واجب کردہ مقدار اضافہ کے ساتھ ادا کرنے کا اہتمام کریں۔

بہرحال! جب ''مُصَدِّق'' حضرات زکوٰۃ کی وصول یابی کے لئے جاتے تھے تو اربابِ اموال کے ساتھ کچھ نہ کچھ کشمکش کی شکل پیدا ہو ہی جاتی تھی، یہ لوگ کہتے کہ تمہیں اتنا دینا ہے اور وہ لوگ کہتے کہ نہیں بلکہ صرف اتنا ہی واجب ہوتا ہے، جیسے آج

کل ٹیکسوں کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ وصول کرنے والے کہتے ہیں اتنا دینا ہے، اور دینے والے کہتے ہیں کہ نہیں! بلکہ اس سے کم اتنا ہی ہوتا ہے، اس طرح دونوں کے حساب میں فرق ہو ہی جاتا ہے۔

وصول یابی کے لئے جانے والوں کو ہدایات

تو نبی کریم ﷺ نے ''مُصَدِّق'' حضرات کو ہدایتیں دیتے ہوئے یہ فرمایا ﴿اِیَّاکُمْ وَکَرَائِمَ أَمْوَالِھِمْ﴾ ان کے جو بہترین مال ہیں ان کو زکوٰۃ کے طور پر وصول نہ کیا جائے یعنی جو جانور تم زکوٰۃ کے طور پر وصول کرو؛ وہ نہ بالکل اعلیٰ درجہ کا ہو، اور نہ بالکل گھٹیا درجہ کا ہو، بلکہ درمیانی قسم کا جانور وصول کیا جائے گا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو جو وصیت فرمائی تھی اسی میں یہ بھی تھا ﴿اِتَّقِ دَعْوَۃَ الْمَظْلُوْمِ﴾ مظلوم کی بددعا سے بچیو، اس لئے کہ ان پر جتنی مقدار واجب ہے اس سے زیادہ اگر وصول کروگے تو یہ تمہاری طرف سے ایک طرح کا ظلم اور زیادتی ہوگی، اور اس صورت میں وہ اگر بددعا کرے گا تو تمہارا نقصان ہے ﴿فَاِنَّہٗ لَیْسَ بَیْنَھَا وَبَیْنَ اللہِ حِجَابٌ﴾ اس لئے کہ مظلوم کی بددعا اور اللہ تعالیٰ کے درمیان میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، وہ سیدھی پہنچتی ہے۔ (شعب الایمان، ۸۸)

اسی طرح زکوٰۃ وصول کرنے والوں سے یہ بھی کہا گیا کہ ان کے گھروں پر جا کر وصول کرو، ان کو اپنے یہاں نہ بلاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے کی ایک شکل تو یہ ہے کہ ایک جگہ آفس قائم کردی، ٹینٹ لگادیا اور اعلان کردیا کہ سب اپنے جانور لے کر یہاں آؤ، مَیں دیکھ کر حساب کردوں گا۔ اب جانور والوں کو اپنے جانور یہاں پیش کرنا بڑا مشکل کام ہے، اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایسا مت کرو بلکہ ان کے وہاں جا کر وصول کرو۔

اور یہ بھی فرمایا﴿اَلْمُعْتَدِیْ فِی الصَّدَقَةِ کَمَانِعِهَا﴾حاکم کی طرف سے مقرر کیا ہوا آدمی یعنی ''مُصَدِّق'' زکوٰۃ کی وصول یابی میں اگر حد سے آگے بڑھتا ہے تو وہ گناہ کے اعتبار سے ایسا ہی ہے جیسا کہ وہ آدمی جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا (ابوداؤد شریف، ۱۵۸۵) گویا ان حضرات کو تو یہ ہدایتیں دیں۔

اربابِ اموال کو ہدایات

اور دوسری طرف اربابِ اموال کو یہ ہدایت دی کہ جب ہمارے بھیجے ہوئے آدمی تمہارے پاس زکوٰۃ وصول کرنے آویں تو تمہارے پاس سے خوش اور راضی ہو کر جانے چاہئیں، اگر وہ خوش ہو کر نہیں گئے تو تمہاری زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ (ابوداود شریف، ۱۵۸۸)

دیہات کے کچھ لوگوں نے آکر نبی کریم ﷺ سے یہ شکایت کی کہ یارسول اللہ! زکوٰۃ کی وصول یابی کے لئے جو لوگ آتے ہیں وہ ہمارے اوپر جتنی مقدار واجب ہوتی ہے اس سے زیادہ وصول کرتے ہیں، تو کیا ہم اپنا کچھ مال چھپالیں؟ اور ہمیں معلوم ہے کہ اس کے بعد بھی وہ لوگ جو لیں گے وہ اتنا ہی ہو جائے گا جتنا ہم پر واجب ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں! تمہیں چھپانے کی اجازت نہیں ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگرچہ وہ ہم پر ظلم کریں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگرچہ وہ تم پر ظلم کریں تب بھی تم کو چھپانے کی اجازت نہیں ہے۔ (ابوداود شریف، ۱۵۸۶)

بہرحال! اربابِ اموال کو یہ تاکید فرمائی کہ ان کی رعایت کرو اور ''مُصَدِّق'' حضرات کو یہ ہدایت دی کہ ان کی رعایت کرو اور ان کا حق ادا کرو۔ اسی طرح ہر معاملہ میں شریعت کا یہی طرز ہے۔ ماں باپ اور اولاد کا معاملہ ہے تو اولاد کو یہ تاکید کی ہے کہ والدین کا حق ادا کرو، اور ماں باپ کو کہا کہ ان کا خیال رکھو۔ شوہر کو بتلایا کہ بیوی کے تم

پر یہ حقوق ہیں اور بیوی کو بتایا کہ شوہر کے تم پر یہ حقوق ہیں۔

پھر تو دنیا میں کبھی کوئی جھگڑا ہی نہ ہو

اب اگر جس پر جو ذمہ داری شریعت نے عائد کی ہے وہ اس کو ادا کرے گا، تو تمام کے حقوق ادا ہو جائیں گے اور کسی کو مطالبہ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ جس پر حق ہے اس سے یوں تو کہا کہ تم ادا کرو، لیکن جس کا حق ہے اس سے یہ نہیں کہا کہ تم اپنا حق مانگو، بلکہ بعض روایتوں میں تو صراحت ہے کہ تمہارا حق اگر کسی پر ہے تو تم اس سے مطالبہ مت کرو، تم پر اس کا جو حق ہے اس کو ادا کرو۔ ہر شخص اگر اس ہدایت پر عمل کرنے لگے پھر تو دنیا میں کبھی کوئی جھگڑا ہی نہ ہو۔

تو حقیقت یہ ہے کہ شریعت نے ایک طریقہ بتلایا ہے کہ دوسرے کا حق ادا کرو۔ لیکن آج کل دنیا میں ایک طریقہ جاری ہے، وہ کیا ہے؟ اپنے حق کا مطالبہ کرو۔ جب ہر ایک اپنا حق مانگے گا اور دوسرا اس کو ادا کرے گا تو اس کا نتیجہ اگر چہ یہی نکلے گا کہ حقوق ادا ہوں گے لیکن اِس میں نزاع اور جھگڑا پیدا ہوتا ہے، اور اُس میں جھگڑے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ جب کوئی مطالبہ نہیں کرتا اور صاحبِ حق خود ادا کرتا ہے تو امن وامان اور سکون قائم ہوتا ہے، کسی کو کسی سے کوئی اختلاف نہیں رہتا۔ بات وہی ہے لیکن شریعت نے طریقہ بدل دیا ہے۔

کیا ایسی کوئی انجمن قائم ہوئی؟

آج کل دنیا میں جتنے بھی جھگڑے ہیں آقا اور مالک کے درمیان، باپ اور بیٹے کے درمیان، میاں اور بیوی کے درمیان؛ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہر ایک اپنا حق

مانگتا ہے کہ میرا حق لاؤ۔اورحق کے مطالبوں کے لئے یونینیں قائم کی جاتی ہیں، مثلاً انجمنِ تحفظِ حقوقِ نسواں کہ عورتوں کے حقوق وصول کرو،لیکن عورتوں پر جوحقوق ہیں ان کی ادائیگی کے لئے کہ ان کو تاکید کی جائے اور سمجھایا جائے؛ کیا ایسی کوئی انجمن قائم ہوئی؟ آج تک دنیا میں کبھی کوئی یونین اس لئے قائم نہیں کی گئی کہ ہم پر جو ذمہ داریاں ہیں ان کو ادا کیا جائے۔حق مانگنے کیلئے تو انجمن قائم ہوتی ہے،لیکن حق دینے کے لئے نہیں۔حالانکہ شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ تم پر جو حقوق ہیں وہ ادا کرو،اس کا اگر اہتمام کیا جائے گا تو پھر کبھی کوئی نزاع وجھگڑا پیدا نہیں ہوگا۔

مرد عورتوں کے اوپر نگران ہیں

اس لئے جہاں شوہروں کے حقوق بتلائے گئے ہیں وہاں عام طور پرعورتوں کو خطاب کیا گیا ہے۔باری تعالیٰ کا ارشاد پیش کیا ہے ﴿اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ مرد عورتوں کے اوپر نگران ہیں،ان کا انتظام سنبھالنے والے،ان کی دیکھ ریکھ رکھنے والے اور حالت درست کرنے والے ہیں ﴿بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمارکھی ہے ﴿وَبِمَا أَنْفَقُوْا مِنْ أَمْوَالِهِمْ﴾ اوراس لئے بھی کہ مردوں نے اپنے مال عورتوں کے اوپر مہر اورنفقہ کے طور پر خرچ کئے ہیں۔

﴿فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ پس نیک عورتیں جو اللہ کی مطیع وفرمانبردار ہیں،اور اللہ تعالیٰ نے جن حقوق کی حفاظت کی تاکید فرمائی ہے اس کا اہتمام کرنے والی ہیں۔

مرد کو حاکم کیوں بنایا گیا؟

اس آیت کو لاکر مردوں کا عورتوں پر جو حق ہے وہ بتلایا گیا ہے۔ سب سے پہلا حق یہ ہے کہ مرد کو امیر کی اور عورت کو مامور کی حیثیت دی گئی ہے۔ آج کل تو یہ مسئلہ بھی موضوعِ بحث بنا ہوا ہے کہ مرد کو حاکم کیوں بنایا گیا؟ یہاں ﴿قَوَّامٌ﴾ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ﴿قَامَ یَقُوْمُ﴾ کا معنٰی ہے کسی کام کو ٹھیک طریقہ سے انجام دینا ﴿قَامَ عَلٰی الْأَمْرِ﴾ اس وقت بولا جاتا ہے جب کہ اس کام کو ٹھیک اور درست طریقہ سے انجام دیا گیا ہو۔ گویا عورتوں کے معاملات کو درست کرنے والے اور انتظام کو ٹھیک طریقہ سے سنبھالنے والے مرد ہیں، ان کو منتظم مقرر کیا گیا ہے۔ انتظامی امور مردوں کے حوالہ کئے گئے ہیں، اس اعتبار سے ان کو امیر بنایا گیا ہے۔ یہاں ﴿قَوَّامٌ﴾ کہا گیا ہے، مالک نہیں یعنی یہ نہیں کہا کہ مرد عورتوں کے مالک ہیں، اگر شوہر کو بیوی پر ملکیت دی ہے تو وہ فقط جنسی فائدہ اٹھانے کی ہے، اس سے آگے اس کی ذات کا اور اس کے مال کا مالک نہیں بنایا ہے، عورت کا ذاتی مال ہو تو شوہر کو اس میں تصرف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ خیر! یہاں لفظ ''قَوَّامٌ'' استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ امیر ہے۔

اور اس کی وجہ بھی بتلائی گئی ہے ﴿بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ﴾ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، یعنی خِلقی اور فطری اعتبار سے مرد کو عورت کے اوپر فضیلت حاصل ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو قوتِ عمل مرد کو عطا فرمائی ہے وہ عورت کے اندر موجود نہیں ہے۔ اسی لئے بہت سے ایسے امور جن کے لئے زیادہ قوت کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ مرد کے حوالہ کئے گئے ہیں، اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے دوسری مزید فضیلتیں بھی مرد کو عطا فرمائی ہیں۔ بلکہ میڈیکل

سائنس کی تحقیقات کے اعتبار سے بھی مرد کے دماغ کا وزن عورت کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے۔اور قویٰ کے اعتبار سے دوسری بہت ساری صلاحیتوں میں بھی فرق ہے۔ جسمانی اعتبار سے بھی خود میڈیکل سائنس نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ مرد کو عورت کے مقابلہ میں فوقیت حاصل ہے۔خیر! اللہ تعالیٰ نے بعض اوصاف کے اندر مرد کو عورت کے اوپر فوقیت عطا فرمائی ہے،اور یہ ایک فطری، کھلی اور بدیہی چیز ہے،اس کے لئے زیادہ دلائل قائم کرنے کوئی ضرورت نہیں ہے۔

کیا عورت اس سے دست بردار ہوجائے گی؟

آج ہمارے اس زمانہ میں عورتوں کی آزادی کا خوب شور مچایا جارہا ہے اور حقوقِ نسواں کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے،حالانکہ اِس زمانہ میں بھی یوروپ اور امریکہ کا حال دیکھئے، جو لوگ اپنی انکھوں سے وہاں کا حال دیکھ کر آئے ہیں،ان سے پوچھئے۔ اور اس بات پر بھی غور کیجئے کہ اگر آپ نے عورت کو آزادی دے کر کسی دفتر میں پہنچا بھی دیا اور جس طرح مرد دفتر میں بیٹھ کر کام کرتا ہے، یہ بھی کرنے لگے گی،تو عورت کو فطری اور خِلقی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جن ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے پیدا کیا گیا ہے، کیا دفتر میں پہنچنے کے بعد وہ ان سے دست بردار ہوجائے گی؟ مثلاً بچے جننے کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے عورت کے اندر ہی رکھی ہے،مرد کے اندر نہیں رکھی،اگر مرد کو گھر میں بٹھا دیا اور عورت کو دفتر میں پہنچا دیا تو اب ایسا تو نہیں ہوگا کہ عورت میں سے بچے جننے والی صفت ختم ہوجائے گی،اس سے فطری عمل میں کوئی تبدیلی آنے والی نہیں ہے،دفتر میں جانے کے بعد بھی اس کو تو بچے جننے ہی ہیں،اور ماں ہونے کی حیثیت سے بچے کو جو کچھ دینا ہے وہ تو وہی دے سکتی ہے؛ مرد نہیں دے سکتا۔اسی لئے امریکہ میں بے شمار بچے

ایسے ہیں جو ماں باپ کی شفقت ومحبت سے محروم رہنے کی وجہ سے نفسیاتی طور پران کا جو نشوونما اور ترقی ہونی چاہیے وہ نہیں ہوتی، اسی لئے وہاں پاگل پن اور نفسیاتی بیماریوں کے قصے ایشین ممالک کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں، حالانکہ ظاہری اعتبار سے راحت وآرام اور سکون کے اسباب جتنے اُن علاقوں میں مہیا ہیں، اتنے اِن علاقوں میں نہیں ہیں، اس کے باوجود نفسیاتی مریضوں کی تعداد وہاں زیادہ ہے۔

اور پھر یہاں تک لکھا ہے کہ عورت بیچاری صبح گھر سے نکلتی ہے، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ٹریفک کا مقابلہ کر کے دفتر پہنچتی ہے، شام کو دفتر سے چھوٹ کر پھر ٹریفک میں اپنا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ضائع کر کے گھر پہنچتی ہے، اور گھر آنے کے بعد بچوں کا جو مسئلہ ہے وہ تو حل ہونے والا نہیں ہے، ان کی طرف تو اس کو جو توجہ دینی ہے وہ تو دینی ہی ہے۔ عورت کے باہر نکلنے اور مرد کے شانہ بہ شانہ چلنے سے اس کے فطری عمل میں کوئی تبدیلی آنے والی نہیں ہے اور آزادی کا نعرہ لگا دینے کی وجہ سے عورتوں کو آزادی ملنے والی نہیں ہے۔

آزادیٔ نسواں؛ صرف لیبل

اور اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مرد جو قانون بناتا ہے اس میں اپنی بالادستی تو قائم ہی رکھتا ہے، چاہے زبان سے کچھ بھی کہتا رہے، پھر اگر یوروپ اور امریکہ ہو؛ امارت تو مرد کی ہی رہتی ہے اور سمجھدار لوگوں کا کہنا تو ہے کہ دراصل بات یہ ہے کہ مرد اپنی شہوت پوری کرنے کے لئے عورت کو نمائش گاہ میں لانا چاہتا تھا اور بغیر کسی وجہ کے لا نہیں سکتا تھا، اس لئے آزادیٔ نسواں کا صرف لیبل دے کر عورت کو باہر نکالا گیا ہے اور اس طرح مرد اپنی خواہشات پوری کر رہا ہے۔

خواتین پریشان ہیں

ایک بات یاد آئی گذشتہ ہفتہ ہی اخبار میں اچٹتی نظر پڑ گئی تو اس میں ایک رپورٹ پیش کی گئی تھی کہ دفتروں میں کام کرنے والی عورتوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جن کو اپنے اوپر کام کرنے والوں کی طرف سے پریشانیاں اور تکلیفیں پیش آتی رہتی ہیں، کہنے کا حاصل یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود کوئی سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

مرد کو عورت پر نگران مقرر کرنے کی ایک وجہ

خیر! مرد کو عورت پر نگران اور منتظم مقرر کیا گیا ہے، اس کی ایک وجہ تو وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر مردوں کو جو صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، وہ عورتوں کو نہیں دیں۔ اللہ تعالیٰ خالق اور پیدا کرنے والے ہیں ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ جو پیدا کرنے والا ہے کیا وہ ہر ایک کے حالات سے زیادہ واقف نہیں ہے؟ جیسے آپ کوئی چیز بنائیں تو اس میں کیا کمی ہے اور کیا کمال ہے؛ وہ آپ ہی جان سکتے ہیں۔ بنانے والا اس کے عیب وکمال کو جتنا جان سکتا ہے کوئی دوسرا اتنا نہیں جان سکتا اور جب اللہ تعالیٰ ہی نے فرمادیا ہے ﴿بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ تو پھر کسی اور کو اعتراض کا کیا حق ہے۔

دوسری وجہ

اور دوسری وجہ یہ ہے ﴿وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ﴾ اور اپنا مال انہوں نے خرچ کیا یعنی نکاح میں لاتے وقت شوہر مہر دیتا ہے، اور بعد میں عورت کا نفقہ مرد پر واجب ہوتا ہے۔ شریعت نے تو عورت کو کمانے کے لئے کہا ہی نہیں ہے۔ مَیں پہلے بھی

بتلا چکا ہوں کہ ایک ہی شخصیت ایسی ہے جس کے پاس اپنا مال موجود ہوتے ہوئے بھی اس کا نفقہ دوسرے پر واجب ہے اور وہ بیوی ہے۔ بیوی کے پاس اپنے ذاتی کروڑ ہا کروڑ روپے موجود ہوں اور وہ نافرمان نہیں ہے اور شوہر کے گھر سے چلی نہیں گئی ہے، تو اس کا خرچہ شوہر کے اوپر واجب ہے اس کے علاوہ کوئی بھی ایسا نہیں ہے، چاہے وہ ماں ہو باپ ہو، اولاد ہو، ایک دو سال کا چھوٹا بچہ بھی اگر ایسا ہے کہ اس کی ملکیت میں مال موجود ہے تو اس کا نفقہ کسی دوسرے پر واجب نہیں ہے۔ ماں باپ کا نفقہ اولاد پر اس وقت واجب ہوتا ہے جب کہ ان کے پاس مال موجود نہ ہو اگر مال موجود ہے تو ان کا نفقہ اولاد پر نہیں ہے، بیٹے کے پاس اگر اتنے پیسے موجود ہیں جن میں اس کے کپڑے آسکتے ہیں تو باپ کے اوپر اس کے کپڑوں کے لئے خرچ کرنے کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ہاں! صرف بیوی کی شخصیت ایسی ہے کہ شریعت نے اس کے خرچہ کی ذمہ داری شوہر پر رکھی ہے ﴿وَبِمَآ أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ﴾ سے یہی بتلایا گیا ہے کہ شوہر ان پر اپنا روپیہ خرچ کرتے ہیں۔

کسی ایک کو امیر ضرور بنایا جاتا ہے

اب اسی چیز کو ایک غلط طریقہ سے پیش کیا گیا کہ مردوں کو حاکم بنا دیا گیا اور عورتوں کو غلام بنا دیا گیا، حالانکہ جو حقوق شریعت نے متعین کئے ہیں ان میں عورت کو صرف ایک ہی چیز کا پابند بنایا ہے کہ وہ شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکل سکتی، باقی دوسرے جتنے بھی کام کاج ہیں وہ شرعی حقوق کے طور پر لازم نہیں کئے ہیں۔

بہر حال! شریعت نے مرد کو عورت پر امیر اور منتظم بنایا ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے دو یا تین آدمی سفر کر رہے ہوں تو ان کو چاہیے کہ اپنے میں سے ایک کو امیر بناویں

تا کہ سفر کے معاملات بخوبی انجام پاتے رہیں۔اسی طرح یہ زندگی بھی ایک سفر ہے، میاں بیوی دونوں مل کر اس سفر کو قطع کر رہے ہیں اس لئے ضروری تھا کہ اس سفر کے لئے بھی کسی کو امیر مقرر کیا جاتا،لیکن یہ کام ان دونوں پر نہیں چھوڑا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہی فیصلہ کر دیا اور شوہر کو زندگی کے اس سفر میں امیر بنا دیا،اور اس کی وجہ بھی بتلا دی گئی کہ عمومی طور پر جو قوتِ عمل اور صلاحیتیں جنسی اعتبار سے مرد کے اندر موجود ہیں، وہ عورت کے اندر نہیں ہیں۔اگر انفرادی طور پر کہیں کوئی عورت کسی مرد سے بڑھی ہوئی ہو تو وہ اس اصول سے مستثنیٰ ہے۔دنیا کے کسی بھی اصول کو اٹھا کر دیکھ لیجئے اس میں مستثنیات ہوتے ہی ہیں۔بہر حال! یہاں تو امیر بنانے کی بات چل رہی تھی،اور سارے اختیارات اسی نسبت سے شوہر کو حوالہ کئے گئے ہیں۔اب اس پر بھی اگر لوگوں کو اشکال ہے تو کیا کیا جائے۔اس لئے کہ دو میں سے ایک بات ہو سکتی ہے کہ تمام اختیارات یا تو شوہر کے حوالہ کئے جاتے یا عورت کے حوالہ کئے جاتے،اگر عورت کے حوالہ کئے جاتے؛ تو آج کوئی آدمی اگر اِس پر اشکال کرتا ہے؛ تو وہ اُس پر بھی اشکال کر سکتا تھا۔

امیر کی حیثیت اور مقام

بہر حال! شوہر کو امیر،نگران اور انتظام کو درست کرنے والے کی حیثیت دی گئی ہے،اور شریعت نے تو امیر کی حیثیت بھی بتلا دی﴿سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ﴾ (کنز العمال،۱۷۵۱۸) جس کو امیر بنایا جائے وہ یہ نہ سمجھے کہ مجھے حکم چلانا ہے بلکہ اس کی طرف سے اس بات کا اہتمام ہو کہ اپنے رفقاء کو آرام پہنچانے کی کوشش کرے،ان کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دینے کا اہتمام کرے؛ یہ ہے امارت کی حیثیت۔ تو یہاں پر بھی مرد کو امورِ خانہ داری کے واسطے منتظم مقرر کیا گیا ہے،اس کی ایک وجہ تو اس

میں صلاحیت تھی، اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ اس کو اس بات کا مکلّف کیا گیا کہ وہ عورت کو زیادہ سے زیادہ راحت و آرام پہنچانے کا اہتمام کرے۔

مرد کی امارت جنت سے چلی ہے

اسی لئے قرآنِ پاک میں ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جنت میں بسایا تو اس بات کی تاکید فرمائی کہ اس درخت کے قریب نہ جائیو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کو کھالو اور شیطان تم سے غلطی کروالے اور نتیجہ یہ ہو ﴿فَتَشْقٰی﴾ کہ تم مشقت اور تکلیف میں پڑ جاؤ۔ اس کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ وہاں حضرت آدم اور حضرت حوا دونوں ہیں لیکن مشقت میں پڑنے کا خطاب فقط حضرت آدم کو کیا گیا کہ تم تکلیف میں پڑ جاؤ گے، کیونکہ عام طور پر گھر کو چلانے کے معاملہ میں جو تکالیف آتی ہیں وہ مرد پر ہی عائد ہوتی ہیں، اور مرد کو ہی ان تکالیف کو اٹھانا پڑتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ شروع ہی سے امارت مرد کے حوالہ کی گئی ہے

ایسی عورت پر فرشتے لعنت کرتے ہیں

۲۸۱. عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم: اِذَا دَعَا الرَّجُلُ اِمْرَأَتَهُ اِلیٰ فِرَاشِهٖ فَلَمْ تَأْتِهٖ، فَبَاتَ غَضْبَانَ عَلَيْهَا، لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ حَتّٰى تُصْبِحَ.

وفی روایة لهما: اِذَا بَاتَتِ الْمَرْأَةُ هَاجِرَةً فِرَاشَ زَوْجِهَا، لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ حَتّٰى تُصْبِحَ.

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب مرد نے اپنی بیوی کو اپنے بستر کی طرف دعوت دی، وہ نہیں گئی۔ شوہر رات بھر اس سے ناراض رہا، اس عورت پر فرشتے لعنت (اللہ کی رحمت سے دور ہونے کی بددعا) کرتے ہیں یہاں تک کہ صبح ہو جائے۔ ایک روایت میں ہے: جو عورت اپنے شوہر کے بستر سے الگ رات گذارے گی، فرشتے اس پر صبح تک لعنت کرتے رہیں گے۔

وفـی روایة:قَـالَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ:وَالَّذِیْ نَـفْسِـیْ بِیَـدِہٖ مَامِنْ رَجُلٍ یَدْعُوامْرَأَتَہُ اِلیٰ فِرَاشِـہٖ فَتَـأْبـیٰ عَلَیْـہِ اِلَّا کَـانَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ سَاخِطًا عَلَیْھَا حَتّٰی یَرْضیٰ عَنْھَا.

ایک اور روایت میں ہے: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو اپنے بستر کی طرف دعوت دیتا ہے اور عورت انکار کرتی ہے، تو جو ذات آسمان میں ہے (اللہ تعالیٰ) اس پر ناراض ہوجاتا ہے یہاں تک کہ شوہر راضی ہوجائے۔

افادات:- ایک تو یہ ہے کہ بیوی صحبت کے قابل نہیں ہے، یا تو حالتِ حیض میں ہونے کی وجہ سے، یا ایسی بیمار ہے کہ وہ اس مشقت کو برداشت نہیں کرسکتی، کسی ماہر حکیم نے اس کو منع کر رکھا ہے؛ تو دوسری بات ہے۔ لیکن کوئی عذر نہ ہو اور انکار کرے اور اس کے منع کرنے پر شوہر اس سے ناراض ہو کر رات گذارے؛ تو ایسی عورت پر فرشتے لعنت کرتے ہیں

فرشتوں کی لعنت کی وجہ

گویا عورت کو نکاح کر کے لانے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ مرد اپنی عصمت وعفت کی حفاظت کرے، اور جب عورت کو اس مقصد کے لئے بلایا جارہا ہے اور عورت انکار کرے گی تو جس مقصد کے لئے نکاح کیا گیا تھا وہ مقصد حاصل نہیں ہورہا ہے، اور جب عورت برضا و رغبت مرد کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اپنے آپ کو پیش نہیں کرے گی تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مرد کی نگاہیں دوسری طرف جائیں گی اور مَیں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ جو آدمی گھر میں بھوکا رہتا ہے وہ باہر کھانا تلاش کرتا ہے۔ تو اگر عورت کو بلانے کے باوجود مرد کی ضرورت پوری نہیں ہوتی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مرد زنا میں مبتلا ہوگا، حالانکہ شریعت نے تو مرد کی عفت کے لئے اتنا زیادہ اہتمام کیا ہے کہ اگر

وہ ایک عورت سے اپنی ضرورت پوری نہ کر سکے تو دوسری بیوی کرنے کی بھی شریعت نے اجازت دی ہے لیکن زنا اور زنا کے مقدمات یعنی جو چیزیں زنا اور حرام کاری تک پہنچانے والی ہیں ان تمام کو شریعت نے صاف صاف طور پر حرام قرار دے دیا ہے۔ نگاہوں کو نیچی رکھنے کا حکم دیا، شرمگاہوں کی حفاظت کا حکم دیا، البتہ نکاح کی اجازت دی اور اگر ایک سے ضرورت پوری نہیں ہوتی تو دو تین اور چار تک کی اجازت دی، اور یہ ایک فطری چیز ہے۔

آگے دوسری روایت کا حوالہ دیتے ہیں کہ جو عورت اپنے شوہر کے بستر سے الگ رہتے ہوئے رات گذارے گی، مطلب یہ ہے کہ اس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اپنے آپ کو پیش نہیں کرے گی تو فرشتے اس پر صبح تک لعنت کرتے رہتے ہیں۔

یہاں تک کہ شوہر راضی ہو جائے

ایک اور روایت میں ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو اپنے بستر کی طرف اپنی ضرورت کے لئے دعوت دیتا ہے اور عورت انکار کرتی ہے، تو جو ذات آسمانوں میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہو جاتا ہے یہاں تک کہ شوہر راضی ہو جائے، جب تک شوہر راضی نہیں ہوتا وہاں تک اللہ تعالیٰ بھی ناراض رہتے ہیں۔

شوہر کی اجازت ضروری ہے

۲۸۲. عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ: لَايَحِلُّ لِامْرَأَةٍ أَنْ تَصُوْمَ وَزَوْجُهَا شَاهِدٌ اِلَّا بِاِذْنِهِ، وَلَا تَأْذَنَ فِیْ بَيْتِهِ اِلَّا بِاِذْنِهِ.

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے: حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی عورت کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ شوہر کی موجودگی میں روزہ رکھے مگر اس کی اجازت سے۔ اور شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے گھر میں کسی کو آنے کی اجازت نہ دے۔

افادات:- یعنی شوہر سفر میں نہیں ہے؛ تو اس کی اجازت کے بغیر روزہ نہ رکھے۔ اور اگر شوہر سفر میں ہے تو بات صاف ہے کہ وہ گھر پر ہے ہی نہیں کہ اس کی اجازت کا کوئی سوال پیدا ہو، اس لئے اگر وہ روزہ رکھتی ہے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ شوہر کے گھر پر موجود ہوتے ہوئے عورت اگر نفل روزہ رکھنا چاہتی ہے تو جب تک وہ شوہر سے پیشگی اجازت نہ لے لے، وہاں تک روزہ رکھنے سے بھی شریعت نے منع فرمایا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے کہ اگر اس کو دن میں ضرورت پیش آجائے اور اس کا روزہ ہے تو وہ اس کی ضرورت پوری کرنے کے قابل نہیں رہے گی، اس لئے منع کیا۔

اور شوہر کی اجازت کے بغیر شوہر کے گھر میں کسی کو آنے کی اجازت نہ دے، چاہے وہ کوئی بھی ہو، عورت کا اپنا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً عورت کا سگا بھائی ہے لیکن شوہر نے کہہ رکھا ہے کہ تیرے بھائی کو میرے گھر میں مت گھسائیو، تو اس صورت میں عورت کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کو شوہر کے گھر میں آنے کی اجازت دے۔ ہاں! اگر وہ ملنے کے لئے آیا ہے تو عورت خود اس سے ملنے کے لئے گھر کے دروازے پر آسکتی ہے، وہ گھر سے باہر رہے اور یہ اندر سے اس سے بات چیت کرلے۔

ہر ایک اپنے ماتحت کا ذمہ دار ہے

۲۸۳. وعن ابن عُمَرَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ، وَالْأَمِيْرُ رَاعٍ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰى أَهْلِ بَيْتِهٖ، وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهٖ، فَكُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر شخص نگران و ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اپنے ماتحتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ چنانچہ بادشاہِ وقت اور حاکم اپنی رعیت کا نگران و ذمہ دار ہے، مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، اور عورت اپنے شوہر کے

گھر اور اس کی اولاد کی نگران وذمہ دار ہے، لہٰذا تم میں سے ہر ایک نگران اور ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کے ماتحتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

افادات:- یہاں اسی بات کو بتلانے کے لئے اس روایت کو لائے ہیں کہ عورت کی اپنے گھر میں رہتے ہوئے دو ذمہ داریاں ہیں، ایک تو گھر کی اور شوہر کے مال اور چیزوں کی حفاظت کرنا یعنی وہ گھر کا نظم ونسق اس طرح سنبھالے کہ شوہر کا مال ضائع نہ ہو۔ اور دوسری ذمہ داری شوہر کی اولاد کی نگرانی اور پرورش کرنی ہے۔

لہٰذا تم میں سے ہر ایک نگران اور ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کے ماتحتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا، یعنی اگر وہ اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے تو قیامت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا مؤاخذہ ہوگا۔

اپنے اعضاء کا بھی ذمہ دار ہے

بلکہ علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ کسی کے ماتحت کوئی نہیں ہے، اس نے شادی بھی نہیں کی ہے اور اکیلا ہی رہتا ہے؛ تو وہ اپنے اعضاء کا ذمہ دار ہے یعنی اس کو اللہ تعالیٰ نے آنکھوں پر، زبان پر، کان پر، ہاتھ پر، پاؤں پر، شرمگاہ پر، اور دوسرے اعضاء پر اختیار دیا ہے کہ وہ اپنے ان اعضاء کو جس طرح چاہے استعمال کرے، تو گویا وہ ان کا نگران وذمہ دار ہے اس لئے ان کو اسی طریقہ پر استعمال کرنا ہے جس طرح استعمال کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اگر اس کے خلاف استعمال کرے گا تو کل کو قیامت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں پکڑ ہوگی۔

روٹی جلتی ہے تو جل جانے دے

۲۸۴. وَعَنْ أَبِیْ عَلِیٍّ طَلْقِ بْنِ عَلِیٍّ رضی اللہ عنہ أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ: اِذَا دَعَا الرَّجُلُ زَوْجَتَهُ

حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب مرد اپنی بیوی کو اپنی ضرورت کے واسطے بلاوے، تو عورت کو چاہئے

لِحَاجَتِهٖ فَلْتَأْتِهٖ وَاِنْ كَانَتْ عَلَى التَّنُّوْرِ.   کہ وہ فوراً جاوے، چاہے وہ چولہے پر بیٹھی ہو۔

افادات: -یعنی چولہے پر بیٹھی ہے اور توے پر روٹی ڈال دی ہے، اوراس حالت میں بھی اگر شوہر اس کو بلائے تو نبی کریم ﷺ کی تاکید یہ ہے کہ وہ چلی جاوے، روٹی جلتی ہے تو جل جانے دے، اس کی پرواہ نہ کرے۔ گویا اس کو اتنی اہمیت دی گئی ہے۔

مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ شریعت یہ چاہتی ہے کہ مرد کا دھیان ذرا دیر کے لئے بھی دوسری طرف جانے نہ پائے، ایک لمحہ کے لئے بھی وہ دوسری کوئی چیز نہ سوچے، اگر عورت کو بلایا اور اس نے انکار کیا تو اب اس کا دماغ دوسرے چکر میں پڑے گا، حالانکہ شریعت یہ چاہتی ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی مرد کے دل ودماغ میں اپنی بیوی کے سوا دوسری کوئی عورت آنی ہی نہیں چاہیے، اوراس کی شکل یہی تھی کہ عورت کو اس بات کی تاکید کی جاتی کہ مرد اپنی ضرورت کے لئے اس کو جب بھی بلائے، اس وقت وہ چاہے جس حالت میں بھی ہو؛ فوراً پہنچ جائے، اس صورت میں پھر مرد کا دھیان دوسری طرف نہیں جائے گا۔ اور اگر عورت ایسا نہیں کرتی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی توجہ دوسری طرف جائے گی اور وہ اپنے لئے دوسری شکلیں سوچے گا، اور یہی چیز آگے جا کر مرد اور عورت دونوں کی بربادی کا ذریعہ بنے گی بہت سی عورتیں اس معاملہ میں کوتاہی کرتی ہیں اور جب مرد آؤٹ لائن پر چلا جاتا ہے تو پھر روتی پھرتی ہیں، حالانکہ اس کو آؤٹ لائن پر جانے کے لئے اس طرح کی شکلیں اسی نے پیدا کی تھیں، اس لئے ان باتوں پر خاص دھیان دینے کی ضرورت ہے اور ایسی چیزوں سے بچنے کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔

وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے

۲۸۵. عن أبي هريرةؓ عن النبيّ ﷺ قَالَ لَوْ كُنْتُ آمِراً أَحَداً أَنْ يَّسْجُدَ لِأَحَدٍ لَأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا.
(رواه الترمذي وقال: حديث حسن صحيح)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر مَیں کسی کو حکم کرتا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرے تو مَیں عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

افادات:-ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک صحابی فرماتے ہیں کہ وہ ایران گئے تھے، یہ اس زمانہ کا قصہ ہے جبکہ ابھی ایران فتح نہیں ہوا تھا، وہاں انہوں نے دیکھا کہ حاکم کے سامنے لوگ سجدہ کرتے ہیں، انہوں نے آکر نبی کریم ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا کہ وہ لوگ اپنے حاکم کو سجدہ کرتے ہیں، اس لئے یارسول اللہ! آپ تو زیادہ حق رکھتے ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں۔ اس وقت حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرنے کی اجازت نہیں ہے، اگر مَیں اللہ کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔ گویا ان کا اتنا زیادہ حق ہے۔

جنت کا پروانہ

۲۸۶. وعن أُمِّ سَلَمَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: أَيُّمَا امْرَأَةٍ مَاتَتْ، وَزَوْجُهَا عَنْهَا رَاضٍ، دَخَلَتِ الْجَنَّةَ.
(رواه الترمذي وقال: حديث حسن)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو عورت اس حالت میں مرے کہ اس کا شوہر اس سے خوش ہے تو وہ جنت میں جائے گی۔

افادات:-اس روایت میں عورتوں کے لئے کتنی بڑی بشارت ہے کہ شوہر کا خوش ہونا ہی اس کے لئے جنت کا پروانہ ہے۔

حورِعین کا خطاب

۲۸۷ . وعن معاذِبنِ جبَلٍ ﷺ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: لاتُؤذِی امرَأَۃٌ زَوجَھَافِی الدُّنیَا اِلّاقَالَتْ زَوجَتُہٗ مِنَ الحُورِالعِینِ لاتُؤذِیہِ قَاتَلَکِ اللّٰہُ! فَاِنَّمَاھُوَعِندَکَ دَخِیلٌ، یُوشَکُ أَنْ یُّفَارِقَکِ اِلَینَا.

(رواہ الترمذی وقال:حدیث حسن)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ جب دنیامیں کوئی عورت اپنے شوہرکوتکلیف پہنچاتی ہے؛تواس مردکی وہ بیوی جو جنت کے اندرحوروں میں سے حورِعین (بڑی آنکھوں والی خوبصورت عورت)اس کو وہاں ملنے والی ہے وہ حوراس کی بیوی کوخطاب کرتے ہوئے کہتی ہے: اللہ تعالیٰ تجھے مارے،اس کوتکلیف مت پہنچا،اس لئے کہ وہ تو تیرے پاس مہمان ہے،عنقریب تجھے چھوڑکروہ ہمارے پاس آنے والا ہے۔

افادات:- چونکہ عورتوں کوسوکن کی بات بہت تیز لگا کرتی ہےاوران کی باتوں سے دل جلا کرتا ہے،تو یہ حوربھی جواس کی ہونے والی بیوی ہےاس کا جملہ نبی کریم ﷺ نے اس لئے نقل فرمایا کہ تیرے اس کرنے پروہاں یہ کہا جاتا ہے،اس لئے تیری غیرت کا تقاضہ یہ تھا کہ تو اس کی نوبت ہی نہ آنے دے کہ اس کو یہ کہنے کا موقع ملے، بلکہ اس کوراحت پہنچانے کا اہتمام کر۔

اورمردکوبھی ایک طرح کی تسلی ہے کہ اگرعورت کی طرف سے ایذائیں پہنچتی ہیں توصبروتحمل سے کام لو،عنقریب جب دنیا سے جاؤگےتو وہاں تم کوایسی عورت ملنے والی ہے کہ جوتمہیں دنیامیں پہنچنے والی تکلیف پربھی اپنے لئے تکلیف محسوس کرتی ہے،توجب تم وہاں پہنچوگےتوتمہیں وہ کتنی راحت پہنچائے گی۔

مردوں کے لئے سب سے زیادہ سخت فتنہ

۲۸۸ . وعن اُسَامَۃَبنِ زَیدٍ ﷺعَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَاتَرَکتُ بَعدِیْ فِتنَۃً ھِیَ أَضَرُّ

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ میں نے اپنے بعدمردوں کیلئے کوئی

عَلیٰ الرِّجَالِ مِنَ النِّسَآءِ . (متفق علیه) زیادہ سخت فتنہ عورتوں کے مقابلہ میں نہیں چھوڑا۔

افادات: - یعنی ہر اعتبار سے، اپنی کشش ونمائش کے اعتبار سے بھی مردوں کیلئے سب سے بڑے فتنہ کی چیز عورتیں ہیں۔اور ویسے بھی جب عورتیں بیوی ہونے کی حیثیت سے ایسے امور میں-جن میں ان کو دخل نہیں دینا چاہیے- دخل دیتی ہیں اور مرد اگر ان کی مان کر چلتا ہے، تو اس کے نتیجہ میں معاشرت کی لائن سے بہت سی خرابیاں پیش آتی ہیں، اس لئے مردوں کو اس باب میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، اور اس سلسلہ میں شریعت نے جو ہدایتیں دی ہیں ان کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ یہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ عورت کا حق ضائع کردیا جائے، اور یہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اس کو اتنا سر پر بٹھادے کہ اس کی بات مانتے ہوئے دوسروں کے حقوق کو ضائع کرتا رہے، بلکہ آدمی کو درمیانی اور معتدل راہ اختیار کرنی چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

آپس کے حقوق کی ادائیگی کا ہمیں اہتمام نصیب فرمائے۔

اور آپس کی حق تلفیوں سے ہماری حفاظت فرمائے۔

اَلنَّفَقَةُ عَلَى الْعِيَالِ

اہل وعیال پر خرچ کرنا

مجلس (۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ، وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰـهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراًكَثِيْراً. أمابعد:—

فأعوذباللہمن الشيطان الرجيم. بسم اللهالرحمن الرحيم.

وَعَلىٰ الْمَوْلُوْدِلَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ. (البقرة:۲۳۳)

وقال تعالى:—لِيُنْفِقْ ذُوْسَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَعَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّااٰتَاهُ اللّٰهُ لَايُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساًاِلَّامَااٰتٰهَا.(الطلاق:۷)وقال تعالى:—وَمَاأَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَيُخْلِفُهٗ. (سبآء:۳۹)

اہل وعیال کی کفالت

پچھلے باب میں بیوی کے اوپر شوہر کے کیا حقوق ہیں ان کو بیان کیا تھااوراس باب میں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ آدمی اپنے گھر والوں اوراہل وعیال پر جوخرچ کرتا ہے، ان کا نفقہ برداشت کرتا ہے؛تو اس پر اس کو کیا ملتا ہے،اسی سلسلہ میں کچھ آیات وروایات پیش کرتے ہیں

پہلی آیت لائے ہیں﴿وَعَلىٰ الْمَوْلُوْدِلَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ باپ کے اوپر بچوں کی ماؤں کا کھانا پینا اور کپڑا دستور کے مطابق لازم ہے یعنی یوں کہئے کہ بیوی اپنے شوہر کے پاس اپنے آپ کو فارغ کرکے اسی کے کام کے واسطے گھری رہتی ہے تو اب شوہر پر اس کی تمام ذمہ داری اپنی حیثیت کے مطابق لازم ہے۔اور دنیا کا بھی دستور ہے کہ جو آدمی کسی کے کام کے لئے اپنے آپ کو فارغ کئے ہوئے ہو اور اسی کے

کام کے لئے مصروف ومشغول ہوتو اس کا خرچہ اسی کے ذمہ ہوا کرتا ہے، اگر ہم اور آپ اپنے کسی کام کے واسطے کسی کو بمبئی لے جائیں یا اپنے گھر بلائیں اور کھانے کا وقت آوے تو ایسا نہیں ہوتا کہ اس سے کہہ دیں کہ جاؤ اپنے گھر جا کر کھالو، یا اپنے پیسوں سے کھالو، بلکہ جب اپنے کام کے لئے لے گئے تو کھلانے پلانے کی ذمہ داری بھی ہم پر ہی ہے۔

بیوی کے جیتے مرتے ساری ذمہ داری شوہر پر ہے

عورتوں کو مردوں کی ضرورت پورا کرنے کے واسطے اللہ تعالیٰ نے حلال کر کے ان کے نکاح میں دیا اور عورتیں مردوں کی اسی ضرورت کے پیشِ نظر اپنے آپ کو مردوں کے پاس اپنے تمام گھر والوں کو قربان کر کے آگئی تو اب اس کے نفقہ اور اس کے خرچہ کی ساری ذمہ داری شوہروں کے اوپر ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے بھی مَیں مسئلہ بتلا چکا ہوں کہ شریعت میں جو دوسروں کا نفقہ کسی کے اوپر واجب ہوتا ہے اس میں اصول تو یہ ہے کہ جس کے پاس اپنا مال موجود ہو، اس کا نفقہ اور خرچہ کسی دوسرے کے اوپر واجب نہیں ہوتا، یہاں تک کہ باپ کے پاس اپنا مال موجود ہے تو اس صورت میں باپ کا نفقہ وخرچہ اولاد کے اوپر نہیں ہے، وہ اپنے مال میں سے اپنا خرچ برداشت کرے گا۔ اولاد کے پاس اپنا مال موجود ہے، چاہے وہ نابالغ ہی کیوں نہ ہوں، ان کا نفقہ اور خرچہ ان کے مال میں واجب ہوتا ہے، باپ کے ذمہ نہیں ہے۔ کوئی بھی آدمی جس کے پاس اپنا مال موجود ہو، اس کا نفقہ اور خرچہ اسی کے مال میں سے نکالا جائے گا، البتہ ایک شخصیت ایسی ہے اور وہ ہے بیوی؛ کہ اس کا نفقہ شوہر کے اوپر ہے، چاہے بیوی کا اپنا مال کتنا ہی کیوں نہ ہو۔ بیوی کے پاس کروڑ ہا روپیہ موجود ہے، اس کے باوجود اس کا نفقہ شوہر کے اوپر ہے، چاہے شوہر صرف کھاتا پیتا ہے اور اس کے پاس ضرورت کے مطابق ہی رقم ہے، تب بھی

بیوی کا خرچہ شوہر کے اوپر ہوگا، بیوی کا نفقہ اس کے اپنے مال میں نہیں ہے۔

یہاں تک کہ جب آدمی کا انتقال ہو جائے تو مسئلہ یہ ہے کہ اپنے انتقال کے وقت آدمی نے جو کچھ مال وجائیداد وغیرہ چھوڑی ہے اس میں جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں سب سے پہلے اس کے ترکہ میں سے اس کی تجہیز وتکفین وتدفین کے مصارف نکالے جائیں گے، کسی سے مانگا نہیں جائے گا۔ ہاں! اگر اس نے کچھ بھی مال نہیں چھوڑا ہے تو پھر دوسرے لوگ اس کا انتظام کریں گے، چاہے مرنے والا بڑا ہو یا چھوٹا بچہ ہو، مرد ہو یا کوئی عورت ہو، لیکن اگر وہ عورت کسی کی بیوی ہے اور شوہر موجود ہے تو اس نے چاہے کروڑہا روپیہ اپنی ملکیت میں چھوڑا ہو؛ تب بھی اس کا کفن دفن شوہر کے ذمہ ہے، چونکہ زندگی میں اس کے کپڑے کا خرچہ شوہر کے اوپر واجب تھا، موت کے بعد کا لباس یعنی کفن کی ذمہ داری بھی شوہر کے اوپر ہی ہے، ہاں! اگر شوہر کے پاس کچھ بھی مال نہیں ہے تو پھر عورت کے مال میں سے کفن دفن کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

تو ایک تو اس کے کھلانے پلانے کی ذمہ داری، دوسرا اس کی رہائش کا انتظام اور تیسرا اس کے لباس کا انتظام اور جو ضروری چیزیں ہیں مثلاً بالوں کے واسطے ضروری تیل، یا غسل کے واسطے پانی اور صابن وغیرہ کا انتظام؛ یہ سارا خرچہ شوہر کے اوپر ہے، باقی عیش وعشرت کے لئے زائد چیزوں کی ذمہ داری شوہر کے اوپر نہیں ہے۔

خرچہ دینے میں کس کی حیثیت کا اعتبار ہوگا؟

﴿رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ”دستور کے مطابق“ یعنی مالی اعتبار سے عورت بھی اسی جیسے خاندان اور گھرانے سے تعلق رکھتی ہے جو پوزیشن اللہ تبارک وتعالیٰ نے شوہر کو عطا فرما رکھی ہے؛ تو اس کے مطابق اس کا خرچہ ہوگا، اگر وہ غریب ہیں تو عام

طور پر غریب لوگ جس قسم کے مکان میں رہتے ہیں، اور غریب لوگ جس قسم کا لباس استعمال کرتے ہیں، اور غریب لوگ جس قسم کا کھانا استعمال کرتے ہیں؛ اسی قسم کا کھانا، مکان ور ہائش کا انتظام، اور کپڑے شوہر کے اوپر واجب ہوں گے۔

اور اگر دونوں ایسے ہیں کہ ان کا تعلق مالدار طبقہ سے ہے تو اس صورت میں اونچے طبقہ والے آدمی جس قسم کے مکان میں رہتے ہیں، جس قسم کا لباس استعمال کرتے ہیں اور جس قسم کا کھانا پینا ان کا ہوتا ہے، اسی قسم کا خرچہ شوہر کے اوپر واجب ہوگا۔

اور اگر شوہر مالدار ہے اور بیوی غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہے، یا شوہر غریب ہے اور بیوی مالدار گھرانے سے تعلق رکھتی ہے تو اس صورت میں فقہاء کے یہاں کچھ تفصیل ہے، حنفیہ کے یہاں مفتٰی بہٖ قول یہ ہے کہ دونوں کی پوزیشن ملحوظ رکھتے ہوئے بیچ کا راستہ نکالا جائے گا۔

عورتوں کی کمائی کھانا

عورتوں کے لئے کمانے کو شریعت نے ضروری قرار نہیں دیا، اس کو تو گھر ہی میں رہنا ہے۔ ہاں! اگر اپنے گھر میں رہ کر کچھ کاروبار کرتی ہے، اور اس سے کچھ پیسہ حاصل ہوتا ہے تو وہ اس کا اپنا ہے، شوہر کا اس پر کوئی حق نہیں ہے، اگر وہ اپنی مرضی سے شوہر کو دینا چاہے تو الگ بات ہے، اور شوہر کو بھی اس پر نگاہ نہیں رکھنی چاہیے۔ ایک مرد ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے جو مقام اور وقار اس کو عطا فرمایا ہے اس کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ بیوی کی کمائی کے اوپر شوہر کی نظر نہ ہو، بلکہ وہ سامنے چل کر دیتی ہو؛ تب بھی اپنے بلند حوصلہ کی وجہ سے یوں کہے کہ تم اپنا مال اپنے پاس رکھو، مَیں خود ہی کما کر لاتا ہوں اور تمہارے خرچ کا انتظام کرتا ہوں۔

جیب خرچ بھی دو

﴿لِيُنفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا اٰتَاهُ اللّٰهُ﴾ حیثیت والا اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے۔ پہلے بتلایا تھا کہ ضروری اور واجب خرچہ کے علاوہ جیب خرچ کے لئے کچھ رقم بیوی کو دینی چاہیے، تا کہ ایسی ضرورتیں جن کو وہ کسی کے سامنے ظاہر نہ کرسکتی ہو ان میں وہ اس رقم کو استعمال کر سکے، اور جس کی روزی نپی تلی اور تنگ ہے کہ اس کے پاس مالی وسعت نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ نے جو دیا ہے وہ اس کے مطابق خرچ کرے۔ اسی آیت کی وجہ سے علماء کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ گھر کا خرچہ دینے میں شوہر کی مالی حیثیت کا اعتبار کیا جائے گا ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَا اٰتٰهَا﴾ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اتنا ہی پابند بناتے ہیں جتنا اس کو دیا گیا۔ اسی آیت میں آگے یہ ہے کہ بعض لوگ خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں اور یوں سوچتے ہیں کہ کم ہو جائے گا تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا﴾ عنقریب اللہ تعالیٰ تنگی کے بعد سہولت پیدا کر دیتے ہیں۔

جو خرچ کرو گے؛ اس کا بدلہ پاؤ گے

﴿وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ﴾ (بیوی بچوں پر خرچ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اللہ کے اس حکم کو پورا کرنے کے واسطے) تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے؛ اس کا بدلہ پاؤ گے۔

ایک بات یاد رہے کہ ویسے بھی آدمی اپنی طبعی محبت کی وجہ سے اولاد اور بیوی پر خرچ کرتا ہی ہے، لیکن اگر وہ یہ نیت کر لے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ مَیں اپنی بیوی بچوں کا نفقہ برداشت کروں اور ان کی ضرورتوں کا انتظام کروں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے اسی حکم کو پورا کرنے کی نیت سے وہ محنت کرتا اور کماتا ہے، اور کمانے کے واسطے جو

مشقت پیش آتی ہے اس کو برداشت کرتا ہے اور پھر خرچ کرتا ہے تو اس صورت میں چونکہ اس کی نیت اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کی ہے، تو یہ سب اجر وثواب میں داخل ہے اور گویا بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔

گھر والوں کے لئے تھکنا

احیاء العلوم میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت نقل کی ہے ﴿مَنْ سَعیٰ عَلیٰ عِیَالِہٖ مِنْ حِلِّہٖ فَھُوَ کَالْمُجَاھِدِفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (اخرجہ الطبرانی فی الاوسط۔اُحیاءعلوم الدین۔۲/۸۹)﴾ جو آدمی حلال طریقہ سے اپنی اولاد کا خرچہ برداشت کرنے کے لئے محنت کرتا ہے، تو وہ ایسا ہے جیسے اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والا، یعنی اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کو جہاد پر جو اجر وثواب ملتا ہے، یہ آدمی اپنے گھر والوں کی، اپنے بچوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے حلال طریقہ سے کمانے کے لئے جو کوشش کرے گا اور جو محنت کرے گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر بھی اس کو وہی اجر وثواب عطا فرمائیں گے۔ یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے گویا اس کو یہ کام طبعی تقاضوں کی وجہ سے بوجھ سمجھ کر نہیں کرنا چاہیے۔

بعض لوگ محبت ہوتی ہے تو طبعی تقاضہ کی وجہ سے، اور اگر محبت نہیں ہوتی ہے تو بیگار سمجھ کر کرتے ہیں اور یوں سوچتے ہیں کہ یہ تو جھک مار کے کرنا ہی ہے، ایسی نیت نہیں ہونی چاہیے، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم پورا کرنے کی نیت سے کرے تو وہ بھی عبادت میں شمار ہوگا اور اس میں اس کو ثواب ملے گا۔

عورت کو حق ہے کہ وہ انکار کردے

ایک بات یاد رہے کہ آج کل لوگ اپنے اہل وعیال کا نفقہ پورا کرنے کے لئے

کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن اس میں شریعت نے ایک بڑی شرط جو لگائی ہے وہ حلال کی ہے حلال کا اہتمام بہت ضروری ہے۔ فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی شوہر حرام کمائی کے ذریعہ سے عورت کا نفقہ ادا کرنا چاہتا ہے تو عورت کو یہ حق ہے کہ وہ انکار کردے کہ مَیں تمہاری اس کمائی کا پیسہ لینا نہیں چاہتی، مجھے تو حلال لاکر دو، اور اس سلسلہ میں عورت قاضی کے یہاں دعویٰ دائر کرسکتی ہے، اس لئے حلال کمائی کا اہتمام بہت ضروری ہے۔

ہمارے اور اسلاف کے درمیان بڑا فرق

ہمارے معاشرہ میں عام طور پر جو برائیاں پھیلی ہوئی ہیں اور جو خرابیاں آچکی ہیں ان خرابیوں کے مختلف اسباب ہیں، ان اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنی کمائی کے ذرائع میں حلال طریقہ کا اہتمام کرنا چھوڑ دیا، اور حلال کی جو اہمیت ہمارے اسلاف کے یہاں تھی وہ ہمارے دلوں میں نہیں رہی۔ حرام سے بچنے کا جو اہتمام اور حرام کا جو ڈر ان کے دل و دماغ میں بیٹھا ہوا تھا اور حرام سے بچنے کے لئے وہ جتنا اہتمام کرتے تھے، اور حرام کیا بلکہ حرام کے شبہ سے بھی بچنے کا جو اہتمام کرتے تھے وہ ہمارے یہاں نہیں ہے، ’’حکایاتِ صحابہ‘‘ جو فضائل کی کتابوں میں پہلی کتاب ہے، آپ تعلیم میں سنتے رہتے ہیں، اس میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے زہد اور تقویٰ کا مستقل ایک باب قائم کیا ہے، اس باب میں کئی واقعات پیش کئے ہیں۔

وہ مشتبہ کھجور

خود نبی کریم ﷺ اس کا کتنا اہتمام فرماتے تھے، ایک مرتبہ جن زوجۂ مطہرہ کے یہاں آپ کی رات کی باری تھی، انہوں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کو نیند نہیں آرہی ہے،

کروٹیں بدل رہے ہیں، تو ان زوجۂ مطہرہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا بات ہے آج آپ کو نیند نہیں آرہی ہے؟ حضوا کرم ﷺ نے فرمایا کہ دراصل ایک کھجور گھر کے اندر پڑی ہوئی تھی، مَیں نے اُٹھا کر اس لئے کھالی کہ وہ ضائع نہ ہوجائے، لیکن اب مجھے یہ خیال آیا کہ اگر وہ صدقہ کی ہوئی تو؟ (مسند أحمد۔۶۸۲۰) اور چونکہ نبی کریم ﷺ کے لئے صدقہ حلال نہیں ہے، محض اس خیال کی وجہ سے آپ کو رات بھر نیند نہیں آئی۔

اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدر کرنی چاہیے

دیکھو! جو لقمہ اور دانہ دستر خوان پر گر جاتا ہے اس کے بارے میں ہمیں یہی حکم دیا گیا ہے کہ اس دانہ کو اٹھا کر صاف کر کے کھالو، اگر پڑا رہنے دو گے تو وہ شیطان کے لئے ہوجائے گا، اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، اور دانے جس نے دیئے؛ یہ دانہ بھی اسی نے دیا ہے۔ حضرت مولانا ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی عمدہ مثال سے اس چیز کو سمجھاتے تھے کہ دیکھو! وزیر اعظم یا بادشاہ نے آپ کو کوئی چیز کھانے کے لئے دی، اور آپ اسی کے سامنے وہ چیز کھا رہے ہیں، اب اگر اس میں سے کوئی چیز گر گئی تو آپ فوراً اس کو اُٹھا کر صاف کر کے کھالیں گے، اس لئے کہ آپ یہ سوچیں گے کہ اگر مَیں اس کو ایسے ہی چھوڑ دوں گا تو وہ کیا سمجھیں گے کہ میری دی ہوئی چیز کی اس کے یہاں کوئی قدر نہیں ہے۔ جب ہم دنیا کے بڑے لوگوں کی دی ہوئی چیز کے ساتھ ان کا اکرام مدِ نظر رکھتے ہوئے اتنا زیادہ اہتمام کرتے ہیں تو پھر یہ جتنا بھی اور جو کچھ بھی دیا ہوا ہے وہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہی دیا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہمیں ہر وقت دیکھتا ہے، ہم اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں، تو پھر ہمیں اس دانے کو اٹھا کر صاف کر کے کھالینا چاہیے، اس میں ہمیں کسی قسم کی عار اور شرم محسوس نہیں ہونی چاہیے اس معاملہ میں ہم بہت زیادہ کوتاہی کرتے ہیں۔

اکابر کا اہتمام

ہمارے اکابر کے یہاں اس کا بڑا اہتمام ہوا کرتا تھا، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کے دستر خوان پر جب کھانا ہوتا تھا تو جب کھانا کھا کر سب فارغ ہو جاتے تھے اور کوئی دانہ یا روٹی کا کوئی ٹکڑا کسی کے سامنے گرا ہوا ہوتا تھا تو حضرت مولانا اس کو اُٹھا کر صاف کر کے کھالیا کرتے تھے، حضرت کے اس اہتمام کی وجہ سے کسی کا لقمہ اگر گر جاتا تھا تو وہ اس کو گرا ہوا رہنے نہیں دیتا تھا۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بھی دیکھا، اس بات کا خاص اہتمام تھا کہ کوئی چیز ضائع نہیں ہونی چاہیے، یہاں تک کہ کسی پھل کے ذائقہ میں ذرا معمولی سی تبدیلی آ گئی ہوتی تو حضرت شیخ اس خیال سے کہ وہ ضائع نہ ہونے پائے یہ فرماتے تھے کہ کون ہے جو اس کو کھالے گا؟ اس لئے کہ بعض طبائع اس کو گوارا کر لیتی ہیں اور بعض طبائع کو گوارا نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ کوئی آدمی گلاس میں پانی لے کر آدھا پیتا تو باقی آدھا گلاس پانی پھینک دینا حضرت شیخ کو بالکل گوارہ نہیں تھا، اگر دیکھ لیتے تو فرماتے کہ پانی تم نے پھینک دیا، ایسا کیوں کیا؟

ایک ایک قطرہ کتنا قیمتی ہے

واقعہ ہے کہ پانی جیسی نعمت مفت میں اس طرح وافر مقدار میں ملی ہوئی ہے اس لئے ہمیں اس کی قدر نہیں ہے۔ ابھی قریبی زمانہ میں کچھ کے اندر جو سمندری طوفان آیا تھا، اس کے بعد کے حالات ہم نے سنے کہ کسی اخبار کا کوئی نامہ نگار وہاں پہنچ گیا اور ایک بوتل پانی کی اس کے پاس تھی، تو پانی کی اس بوتل کو دیکھ کر بیسیوں آدمی اس کے چاروں

طرف جمع ہو گئے۔ جہاں پانی نہیں ہوتا وہاں ایک ایک قطرے کی قدر ہوتی ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں مفت میں اور وافر مقدار میں دیدیا ہے اس لئے ہمیں اس کی قدر نہیں ہے، جن کے پاس نہیں ہے ان سے پوچھو کہ کتنی قیمتی چیز ہے۔ بہر حال! اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت اپنی جگہ پر بہت ہی قیمتی ہے، اس لئے ہمیں اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ وہ ضائع نہ ہونے پائے۔

لوحِ دل پر نقش کرنے کی بات

اس سلسلہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا واقعہ حکایاتِ صحابہ ہی کے اندر لکھا ہوا ہے اس زمانہ میں لوگوں کے پاس بہت سے غلام ہوتے تھے، تو آقا ان سے کہہ دیا کرتے تھے کہ تم اپنے طور پر اپنا کاروبار کرو اور شام کو اتنی مقدار مجھے دے دینا، باقی جو بچے وہ تمہارا رہے گا، پھر پورے دن کی محنت کے بعد جو رقم آتی تھی وہ غلام مقررہ رقم ان کو پہنچا دیا کرتا تھا؛ اس کو خراج کہتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک غلام تھا جس کو انہوں نے خراج پر اُٹھا رکھا تھا، ایک روز وہ کچھ کھانے کی چیز لے کر آیا، یہاں حضرت کا فاقہ تھا اور کھانے کی چیز لاکر حضرت کے سامنے رکھی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی ایک لقمہ لے کر کھالیا، حالانکہ ان کی عادت یہ تھی کہ روزانہ اس سے تفصیل پوچھتے تھے کہ یہ کہاں سے اور کس طرح لایا۔ اتفاق کی بات کہ اس روز فاقہ کی وجہ سے طبیعت میں بھوک کا تقاضہ تھا اور آج تک پوچھتے رہے اس لئے شاید ضرورت محسوس نہ کی ہو، یا طبیعت کے تقاضہ کی وجہ سے پوچھا نہیں اور ایک لقمہ اٹھا کر کھالیا۔ لیکن آج تو غلام بھی کوئی نئی چیز لایا تھا اس لئے اسی نے پوچھا کہ حضرت! آپ تو روزانہ پوچھتے تھے کہ کہاں سے لایا، آج آپ نے نہیں پوچھا؟ فرمایا

کہ بھائی! اب بتادے کہاں سے لایا؟ اس نے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ مسلمان ہو نے سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں مَیں ایک قبیلہ میں گیا تھا، وہاں مَیں نے کہانت کی تھی (کہانت کا مطلب غیب کی خبر بتانا، جس کو جوتش کہتے ہیں) حالانکہ اس زمانہ میں کہانت کرنے والے جو کہانت کیا کرتے تھے مجھے وہ بھی صحیح معلوم نہیں تھی، ایسے ہی اٹکل سے مَیں نے ایک بات کہہ دی تھی، اور اس کا مَیں ماہر بھی نہیں تھا، اس وقت انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اس کے معاوضہ میں ہم تمہیں کچھ دیدیں گے، اتفاق کی بات کہ آج میرا وہاں سے گذر ہوا تو ان کے یہاں کوئی تقریب تھی، اس لئے کھانا پکا تھا، انہوں اسی کے معاوضہ میں مجھے یہ کھانا دیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تو تو مجھے ہلاک ہی کر دیتا۔ اب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گلے میں اُنگلی ڈال رہے ہیں تا کہ وہ لقمہ نکلے لیکن ایک لقمہ اور وہ بھی دو ایک وقت کے فاقہ کے بعد پیٹ میں گیا تھا، وہ اس طرح اُنگلی ڈالنے سے کہاں نکل سکتا تھا۔ انہوں نے بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں نکلا، اب وہ پریشان ہیں کہ کیا کریں۔ لوگوں نے بتایا کہ ایسا کیجئے کہ پانی منگوا کر خوب پئیں اور پھر قے کریں، ہوسکتا ہے کہ پانی کے ساتھ نکل جائے۔ لہٰذا بڑا پیالہ پانی منگوایا اور پانی پیتے رہے اور اُنگلی ڈال کر قے کرتے رہے؛ یہاں تک کہ بڑی مشقت اور تکلیف سے وہ لقمہ نکلا۔ کسی نے کہا کہ حضرت! آپ نے خواہ مخواہ ہی اتنی زحمت برداشت کی، ایک لقمہ کے واسطہ اتنی تکلیف کا ہے کو اٹھائی؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ جان ہی دیدیں گے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب میں جو بات ارشاد فرمائی وہ ہم لوگوں کے لئے اپنے لوحِ دل پر نقش کرنے کے قابل ہے کہ مَیں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آدمی کے جسم کا جو حصہ حرام مال سے بنا ہو، وہ جہنم کی آگ کا زیادہ حقدار ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سننے کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ اس لقمہ کو مَیں اپنے

پیٹ میں رہنے دیتا، اگر وہ میری جان کے ساتھ نکلتا تب بھی مَیں اس کو نکال کر کے رہتا یعنی اس کو نکالنے میں میری جان چلی جاتی تو مَیں جان دیدیتا۔ (شعب الایمان۔۵۷۶۰)

نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہم اور آپ بھی سنتے ہیں ﴿لا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ (تفسیر حقی،۱۴/ ۲۵۵)﴾ وہ گوشت جو حرام مال سے تیار ہوا ہو؛ جنت میں نہیں جائے گا ﴿کُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ فَالنَّارُ أَوْلیٰ بِهِ (الکشف والبیان۔۴/ ۶۶)﴾ اور ہر وہ گوشت جو حرام مال سے بنا ہو، جہنم کی آگ اس کی زیادہ حقدار ہے ﴿کُلُّ جَسَدٍ غُذِیَ بِالْحَرَامِ فَالنَّارُ أَوْلیٰ بِهَا﴾ ہر وہ جسم جو حرام سے تیار ہوا ہو؛ جہنم کی آگ اس کی زیادہ حقدار ہے۔ غور کیجئے کہ حرام کے معاملہ میں کتنی زیادہ سخت وعیدیں حضور ﷺ نے ارشاد فرمائی ہیں۔

حرام لقمہ کا نقصان

حرام لقمہ جس کو ہم معمولی سمجھتے ہیں اس نے ہماری تمام عبادتوں کی تاثیر ختم کردی ہے، ہمارا حال ایسا ہی ہوگیا ہے کہ ایک آدمی ہزاروں لاکھوں کی دوائی کھاتا ہے لیکن ایک بد پرہیزی ایسی کرتا ہے کہ لاکھوں روپیہ کی ساری دوا بےکار ہوجاتی ہے، تو اب سوچو کہ اس دوا سے کیا فائدہ ہوا۔ ہم اتنی ساری عبادتیں کرتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، اور بہت کچھ کرتے ہیں؛ لیکن اگر حرام غذا اندر چلی گئی تو ہماری ساری عبادتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

اس کی کوئی نماز قبول نہیں

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ کسی آدمی نے کوئی کپڑا دس درہم (دس روپے) میں خریدا، جس میں

ایک روپیہ حرام کا ہے، تو جب تک وہ کپڑا اس کے جسم پر ہے اس کی کوئی نماز قبول نہیں ہوگی۔اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی دونوں اُنگلیاں کانوں میں ڈال کر فرمایا کہ اگر مَیں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے نہ سنا ہو؛ تو میرے کان بہرے ہو جائیں۔ (مسند احمد-۵۷۳۲)

ایک سوال

ایک صاحب پوچھنے لگے کہ اس میں حرام تھوڑا ہے، اور حلال زیادہ ہے؛ تو یہ معاملہ درست ہو جانا چاہیے۔ان سے پوچھا کہ ایسا کیوں؟ تو کہنے لگے کہ وہ ایک مسئلہ آتا ہے نا۔کیا مسئلہ آتا ہے؟ پہلے مَیں آپ کو وہ مسئلہ پوری تفصیل سے بتادوں تاکہ پوری بات صاف ہو جائے۔

ایک آدمی کی پوری کمائی حلال کی ہے، اگر وہ ہماری دعوت کرے یا ہمیں کوئی ہدیہ دے تو ہمارے لئے وہ دعوت کھانا حلال وجائز ہے اور ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔اور اگر ایک آدمی کی پوری کمائی حرام کی ہے اور وہ ہماری دعوت کرتا ہے یا ہمیں کوئی ہدیہ دیتا ہے؛ تو ہمارے لئے نہ تو وہ دعوت کھانا حلال وجائز ہے اور نہ وہ ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔یہ دونوں مسئلے تو اپنی جگہ پر بالکل صاف صاف ہیں۔

ایک آدمی ایسا ہے جس کی کمائی میں حلال بھی ہے اور حرام بھی ہے، مثلاً اس کی تجارت بھی ہے جس سے حلال روزی کماتا ہے لیکن کبھی کبھی سٹہ بھی کھیل لیتا ہے اور اس سے بھی کچھ آمدنی ہو جاتی ہے؛ اس کی دعوت کھانا جائز ہے کہ نہیں؟

اس کے متعلق بھی مسئلہ صاف لکھا ہے کہ وہ جس مال سے دعوت کر رہا ہے، اگر یقینی طور پر ہمیں معلوم ہو جائے کہ وہ مال حرام ہے، چاہے اس کی سٹہ والی آمدنی فقط دس

پرسنٹ (۱۰٪) ہی ہو، اور حلال آمدنی نوے پرسنٹ (۹۰٪) ہو؛ لیکن یہ ہم جانتے ہیں کہ اس نے ہماری دعوت سٹے والی آمدنی سے کی ہے، تو ہمارے لئے کھانا حلال اور جائز نہیں ہے، بالکل حرام ہے۔

اور اگر ہمیں یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ ہماری دعوت اس نے جس مال سے کی ہے وہ حلال ہے، جیسے آپ نے اس کو منع کر دیا کہ مَیں تیری دعوت نہیں کھاتا، اس لئے کہ تیری آمدنی حرام ہے۔ تو اس نے کہا کہ مولوی صاحب! جس پیسہ سے مَیں آپ کی دعوت کر رہا ہوں وہ حلال کمائی کا ہے، مَیں نے تجارت کی تھی اس سے کمایا تھا اور اسی سے آپ کی دعوت کرتا ہوں اور آپ کو بھی اس بات کا یقین ہے، یا آپ کے سامنے اس نے کسی حلال کمائی والے سے قرض لیا اور ان پیسوں سے کوئی چیز خرید کر آپ کو ہدیہ میں دی، اور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اس نے جو دعوت کی یا جو ہدیہ دیا وہ حلال ہی میں سے دیا ہے؛ تو لینا جائز ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اگر یقینی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ حرام میں سے ہے؛ تو لینا اور کھانا جائز نہیں ہے۔ اور اگر یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ حلال میں سے ہے؛ تو لینا اور کھانا جائز ہے، چاہے اس کی حلال آمدنی تھوڑی ہو اور حرام زیادہ ہو۔ یا حلال زیادہ ہو اور حرام کم ہو۔

تب ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں

لیکن اگر وہ ہماری دعوت کر رہا ہے یا ہمیں ہدیہ دے رہا ہے، اور اس کی آمدنی کچھ حلال کی ہے اور کچھ حرام کی ہے، اور ہمیں معلوم نہیں کہ ہماری دعوت جس مال سے کر رہا ہے وہ حلال ہے یا حرام۔ یا اس سے پوچھا تو اس کو بھی یاد نہیں ہے کہ یہ کس مال میں سے ہے؛ تو اس وقت علماء نے بتایا ہے کہ اگر اس کی آمدنی کا زیادہ حصہ حلال کا ہے

تو آپ کے لئے کھانا جائز ہے اور ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔ اور اس کی آمدنی کا بڑا حصہ پچاس سے زیادہ پرسنٹیج (٪) اگر حرام کا ہے، تو آپ کے لئے نہ وہ کھانا حلال ہے اور نہ ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔ کیونکہ ہمیں یقینی طور پر معلوم نہیں ہے۔

جواب

لیکن بھائی! قاعدہ کی بات یہ ہے کہ جب آپ کمار ہے ہیں تو آپ کو تو یقینی طور پر معلوم ہے کہ آپ کے پاس جو کمائی آرہی ہے، وہ حرام ہے، چاہے وہ ایک پرسینٹ (٪) ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے آپ جو معاملہ کر رہے ہیں اس میں جب ایک پرسینٹ (٪) بھی حرام آگیا بلکہ آدھا پرسینٹ (٪) بھی حرام آگیا تو وہ معاملہ پورا ہی حرام ہو گیا، اب آپ کے لئے وہ حلال نہیں رہا۔ تھوڑے سے حرام کی ملاوٹ سے پورا معاملہ حرام اور ممنوع ہو جاتا ہے۔

دیکھو! منطق کا ایک قاعدہ ہے کہ نتیجہ ہمیشہ ارذل کے تابع ہوتا ہے، یعنی دو چیزیں جمع ہو جائیں، ایک گھٹیا ہو اور دوسری بڑھیا ہو؛ تو نتیجہ گھٹیا کے تابع ہوگا، جیسے آپ دو دوست سفر کر رہے ہیں، آپ نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیا اور آپ کے دوست نے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا لیکن دونوں سفر ساتھ کرنا چاہتے ہیں، تو سیکنڈ کلاس والا آپ کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا، لیکن آپ سیکنڈ کلاس والے کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں۔ اسی طرح مثلاً دودھ سے بھرے ہوئے ایک پیالہ میں ایک قطرہ پیشاب کا گر گیا، تو پورا پیالہ خراب اور ناپاک ہو جائے گا۔

ایک اور مثال دوں کہ چار پانچ آدمیوں کی پوری پارٹی تفریح کے لئے پیدل نکلی، ان میں سے ایک کی رفتار گھنٹہ کی دس کلو میٹر کی ہے، دوسرے کی رفتار ایک گھنٹہ کی پانچ کلو میٹر کی ہے، تیسرے کی رفتار دو کلو میٹر کی ہے، اور سب دوست ساتھ ہی رہنا چاہتے

ہیں، تو سب کو دو کلومیٹر والے کی رفتار سے چلنا پڑے گا۔ ان ساری مثالوں سے ایک بات سمجھانا چاہتا ہوں کہ نتیجہ گھٹیا کے تابع ہوتا ہے، اور یہی قاعدہ ہے۔

اور جو لوگ مسئلہ جانتے ہیں ان سے مسئلہ پوچھو، آپ خود ہی قیاس کر کے حلال وحرام کے فیصلے کرنے لگیں؛ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے یہ ہمارے ائمہ اور ہمارے اکابر واسلاف طے کر چکے ہیں، اب ہمیں تو کتابوں میں سے دیکھ کر صرف عمل کرنا ہے، شریعت نے ہمارے ہاتھ میں فیصلہ نہیں دیا ہے۔

تو مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس حدیث میں سیدھا حکم موجود ہے، کسی کپڑے میں نو روپے حلال کے تھے، اور ایک روپیہ حرام کا تھا؛ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جب تک وہ کپڑا اس کے جسم کے اوپر رہے گا، اس کی کوئی نماز قبول نہیں ہوگی۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مشتبہ سے احتیاط

یہی تو بات تھی جس کی وجہ سے ہمارے اسلاف اس چیز کو بھی چھوڑ دیا کرتے تھے جس میں حرام کا شبہ ہو۔ شبہ کا مطلب ہے ڈاؤٹ (Doubt)۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ کوفہ میں لوٹ کے مال کی کچھ بکریاں آئی ہیں، اور لٹیروں نے ان کو کوفہ میں بیچی ہیں گویا کہ کوفہ کی جو بکریاں تھی ان میں لوٹ کی بھی دو چار بکریاں شامل ہوگئی ہیں۔ اب وہ کونسی ہے یہ پتہ نہیں ہے۔ تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے تحقیق فرمائی کہ بکری کی عمر کتنی ہوتی ہے؟ بتایا گیا کہ زیادہ سے زیادہ سات سال۔ تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سات سال تک بکری کا گوشت اس ڈاؤٹ اور خیال کی وجہ سے نہیں کھایا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ گوشت اس بکری کا ہو جو لوٹ کے مال میں آئی تھی، حالانکہ کوفہ میں ہزاروں سینکڑوں بکریاں ہوں گی اور ان میں دو چار ہی مل گئی تھیں۔

اس سے ایک قدم آگے دیکھو۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روز دیکھا کہ ایک فوجی کھانا کھا رہا ہے، کھانے میں گوشت تھا، اس نے بچا ہوا گوشت دریا میں ڈال دیا۔ ظاہر ہے کہ وہ گوشت مچھلیاں ہی کھائیں گی۔ اور ہم سب جانتے ہیں کہ فوجیوں کا معاملہ بے احتیاطی والا ہوتا ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ مچھلی کی عمر کتنی ہوتی ہے؟ عمر بتائی گئی تو اتنے سالوں تک مچھلی نہیں کھائی، کہ کہیں وہ مچھلی نہ ہو جس نے اس فوجی کا پھینکا ہوا گوشت کھایا ہو۔ کیا نعوذ باللہ وہ لوگ دیوانے اور بیوقوف تھے؟ بالکل نہیں۔ پھر آخر اتنا زیادہ اہتمام کیوں کرتے تھے؟

حرام آلود غذا زہر سے زیادہ خطرناک ہے

آج اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ ہمارے کھانے میں تھوڑا سا زہر مل گیا ہے، اگرچہ وہ اتنا ہے کہ جس سے ہم مر نہیں جائیں گے، صرف بیمار ہو جائیں گے؛ تب بھی ہم اس کھانے کو ہاتھ لگانے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، اور وہ کھانا اپنے بیوی بچوں کو کھلانے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہوں گے، کیونکہ اس سے جسم کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ لیکن جس کھانے کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ اس میں حرام کی ملاوٹ ہے، یا مشتبہ ہے، اس کو ہم خود بھی کھائیں اور اپنی اولاد کو بھی کھلاویں؛ تو اس سے روح کو کتنا نقصان ہوگا؟ یہ سوچنے کی بات ہے، حالانکہ روح کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔

حلال اور حرام کا طبعی اثر

نیک اور برے اعمال کی توفیق بھی حلال وحرام ہی پر موقوف ہے۔ نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو اسی چیز کا حکم دیا جس کا حکم رسولوں کو دیا

﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحاً﴾ اے رسولو! حلال کھاؤ اور نیک اعمال کرو، گویا حلال غذا کا طبعی اثر، آٹو میٹک نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کو نیک عمل کی توفیق ہوگی۔

اس کی دعا کیسے قبول ہوگی؟

اور باری تعالیٰ نے فرمایا﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ ہم نے تم کو جو دیا ہے اس میں سے حلال کھاؤ۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک آدمی ہے جو اللہ کے راستہ میں جہاد میں، طلبِ علم میں، تبلیغ میں، یا کسی اور نیک کام میں حج وعمرہ میں جاتا ہے، اور سفر کی وجہ سے اس کے کپڑے میلے کچیلے، بال پراگندہ ہوجاتے ہیں، پھر وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر ﴿يَا رَبِّ، يَا رَبِّ﴾ دعا کرتا ہے، اب اللہ کے راستہ میں ہے اور اتنی مشقتیں اٹھا رہا ہے پراگندہ حال اور پراگندہ بال ہے اور پھر وہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے، تو چاہیے تو یہ تھا کہ وہ دعا ضرور قبول ہوجاتی، لیکن حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کا کھانا حرام، اس کا پینا حرام، اس کا جسم حرام غذا سے پل کر تیار ہوا﴿فَأَنّٰى يُسْتَجَابُ لَهُ﴾ اس کی دعا کیسے قبول ہوگی۔ (مسلم شریف۔۲۳۹۳)

نیک عمل کی توفیق نہ ملنے کا ایک بڑا سبب

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی آدمی حلال کھاتا ہے تو اس کے اعضاء اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں؛ وہ آدمی چاہے یا نہ چاہے۔ اور اگر کوئی آدمی حرام کھاتا ہے تو اس کے اعضاء اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہیں؛ وہ آدمی چاہے یا نہ چاہے۔ (احیاء العلوم۔۲/۱۰۳)

بہت سی مرتبہ ہم لوگ دینی مجلسوں میں بیٹھتے ہیں، اللہ والوں کے یہاں جاتے

ہیں اور نیک کام کرنا بھی چاہتے ہیں، روتے ہیں اور اس کے لئے کوشش بھی کرتے ہیں، لیکن ہم سے وہ نیک اعمال نہیں ہو پاتے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہم سے نیک اعمال نہ ہونے کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ غذا میں حرام اجزاء کی ملاوٹ ہوتی ہے۔

دیوبند کا گھسیارا

اور حلال روزی کا ایک فطری اثر ہے۔ حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ دیوبند میں عبداللہ شاہ نامی ایک صالح آدمی تھے، ان کا ذریعۂ معاش یہ تھا کہ وہ جنگل میں جا کر گھاس کاٹ کر لا کر بیچا کرتے تھے، اور اسی سے بال بچوں پر خرچ کرتے تھے اور ان کی عادت یہ بھی تھی کہ گھاس کا جو گٹھر لاتے تھے، اس کو چھ آنے میں بیچ دیتے تھے، نہ کم نہ زیادہ۔ اور ان کا حساب یہ تھا کہ دو آنے اپنے لئے، دو آنے اپنے بال بچوں کے لئے اور دو آنے بچا کر رکھتے تھے۔ ان کی اس نیک نیتی کی وجہ سے لوگوں کو بھی یہ اہتمام رہتا تھا کہ اگر اپنے جانوروں کے لئے گھاس خریدنا ہوتا تو ان کے پاس سے ہی خریدتے تھے۔ لوگ پہلے ہی سے ان کے منتظر رہتے تھے کہ جب یہ بازار میں آویں تو دوڑ کر ان کے گٹھر پر ہاتھ رکھ دیں جس نے پہلے ہاتھ رکھ دیا اسی کو وہ بیچ دیا کرتے تھے۔ اور دو آنے بچا بچا کر جب کچھ رقم جمع ہو جاتی تو دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کی دعوت کرتے تھے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کی دعوت کھانے کے بعد دل میں اتنی نورانیت پیدا ہوتی تھی کہ چھ مہینہ تک اس کا یہ اثر ہوتا تھا کہ نیک کام کرنے کو دل چاہا کرتا تھا اور گناہ سے نفرت رہتی تھی۔

ایک مشتبہ لقمہ کا ایک ولی پر اثر

اور حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ کسی نے ان کی

دعوت کی، ایک لقمہ اٹھایا اور ابھی حلق سے نیچے اترا تھا کہ دل کو محسوس ہوا کہ یہ مشتبہ لقمہ ہے، ڈاؤٹ اور شک والا ہے، بس! فوراً ہاتھ روک لیا، اس کے بعد نہیں کھایا۔ لیکن حضرت فرماتے ہیں کہ جو ایک لقمہ چلا گیا تھا اس کا اثر دو مہینے تک یہ ہوا کہ دل میں خیال اور وسوسے آتے رہتے تھے کہ یہ گناہ کرلوں اور وہ گناہ کرلوں۔

بہرحال! اہل وعیال کے جو نفقات ہم پر واجب ہیں اس کے لئے ہمیں کوشش کرنی ہے، اور اس کے لئے کی جانے والی کوشش پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہی ثواب ملتا ہے جو جہاد کرنے والے کو میدانِ جہاد میں ملتا ہے، لیکن یہ اہتمام بہت ہی ضروری ہے کہ اس کوشش میں حلال کا اہتمام کیا جائے، اور حرام سے بچنے کا اہتمام ضروری اور لازم ہے، اس کی طرف سے بہت زیادہ غفلت پیدا ہو رہی ہے۔

فطری اصول

اور دیکھو بھائی! یہ تو نیچرل یعنی فطری اصول ہیں جو بدل نہیں سکتے، جیسے ہم اور آپ زہر کھالیں، تو چاہے زہر جان بوجھ کر کھایا ہو یا بھول کر کھایا ہو، جب زہر اندر جائے گا تو وہ اپنا اثر ضرور دکھلائے گا۔ آپ کہیں کہ مَیں نے بھول سے کھالیا تھا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ زہر ہے، تو اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہو یا نہ ہو، آپ نے جان بوجھ کر کھایا ہو یا بھول سے کھایا ہو، زہر تو زہر ہے، وہ اپنا اثر دکھلاتا ہی ہے، یہ اس کا فطری اثر ہے۔

اسی طرح حرام اور حلال مال کا بھی فطری اثر ہے، ہم چاہے بھول سے کھاویں چاہے جان بوجھ کر کھاویں، اثرات تو ضرور ظاہر ہوں گے۔ اللہ والوں پر بھی اس کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں، ان پر یہ ہوتا ہے کہ کبھی اللہ کی طرف سے بیمار ہو جاتے ہیں

جس سے اس کا کفارہ ہو جاتا ہے۔

اللہ والوں پر بھی اثر ہوتا ہے

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ کسی نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت کی، حضرت شیخ کو بھی دعوت دی تھی۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ کے پیر تھے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دعوت قبول کر لی اور حضرت شیخ کو معلوم تھا کہ اس کی کمائی مشتبہ ہے اس لئے حضرت شیخ نے دعوت قبول نہیں کی۔ اب اس نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شکایت کی کہ آپ نے میری دعوت قبول کی اور اس نے (حضرت شیخ) قبول نہیں کی۔ خیر! حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شریک بھی ہوئے لیکن وہاں سے آنے کے بعد انگلی ڈال کر قے کر کے سارا کھانا نکال دیا، اور اس کی وجہ سے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کئی روز تک بیمار رہے۔ اللہ والوں پر یہی اثر ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس طرح کفارہ کرا دیتے ہیں۔

تقویٰ کا نبھانا

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ کوئی ایسا آدمی ان کی دعوت کرتا تو چونکہ حضرت کی طبیعت میں دلجوئی بہت تھی، حضرت کسی کا دل توڑا نہیں کرتے تھے، اس لئے قبول فرما لیا کرتے تھے۔ یہ بھی تقویٰ کا تقاضہ ہے، اور اس تقویٰ کا نبھانا بھی ایک سمجھ داری کی بات ہے۔ بعض لوگوں کو تو تقویٰ کا ہیضہ ہو جاتا ہے، جب کوئی آدمی دعوت کرتا ہے کہ جس کی کمائی میں کوئی شبہ نہیں ہے اس کو بھی پوچھتے ہیں کہ کس

طرح کمایا اور کہاں سے لایا۔ بھائی! جو آدمی کھلم کھلا ایسا ہو وہاں تو الگ بات ہے، لیکن جس کی کمائی کے متعلق لوگ ایسی کوئی بات نہیں کرتے تو پھر ہمیں اس میں زیادہ کھود کرید میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بھی ایک مسئلہ ہے۔

تقویٰ کا ہیضہ

ایک صاحب گنگوہ میں مہمان گئے اور مسجد میں ٹھہرے، اب جو کھانا لے کر جاتا تو وہ پوچھتے کہ اس کی کمائی کیسی ہے؟ کوئی کسان ہے تو اس سے پوچھتے کہ اچھا تو نے غلہ اپنے یہاں کھلایا، کسی پڑوسی کی کھیت میں سے تو نہیں گذارا؟ ایسا تو نہیں ہوا، ویسا تو نہیں ہوا۔ جا! مَیں تیرا کھانا نہیں کھاتا، اس طرح وہ کسی کا کھانا بھی نہیں کھا رہے ہیں۔ اور آپ کی مسجد میں کوئی ساتھی آئے اور آپ کھانا لے جائیں اور وہ نہ کھائے، بھوکا رہے، تو آپ اس کو اپنے لئے عیب سمجھیں گے کہ ایک مسافر آدمی ہماری مسجد میں آیا اور وہ بھوکا سویا، اس سے سب کو تکلیف ہوتی ہے، اور ہر شخص یہ سوچتا ہے کہ کسی طرح اس کو کھلاویں۔ اب جو بھی آدمی جائے تو اندر سے کچھ نہ کچھ مکھی نکال کر اس کو وہ صاحب رد کردیں۔ لوگ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گئے کہ حضرت! ایسا ایسا معاملہ ہے، ان کا کیا جائے؟ تو حضرت نے فرمایا کہ ان سے کہو کہ لوگوں کو کاہے کو پریشان کرتے پھرتے ہو، یہاں گولر کا ایک درخت ہے، اس میں سے گولر لے کر کھالیا کریں؛ اس میں کوئی شک وشبہ والا معاملہ نہیں ہے۔

بہرحال! مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ تقویٰ کو نبھانا اور اس کے تقاضہ کو پورا کرنا بھی ایک سمجھداری کی بات ہوتی ہے۔ ایسے واقعات سن کر بعض لوگوں کو جب تقاضہ ہوتا ہے تو وہ ایسا غلو کرتے ہیں کہ ساری دنیا پریشان ہوجاتی ہے، خود تو پریشان ہوتے ہی ہیں

اور گھر والے، رشتہ دار، پڑوسی اور سب لوگ پریشان ہو جاتے ہیں۔

خیر! حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی جب کوئی دعوت کرتا تھا اور حضرت کو اگر معلوم ہو جاتا کہ اس کی کمائی مشتبہ ہے تو حضرت دست آور گولی لے لیتے تھے اور فرماتے تھے کہ بھائی! مجھے تو دست آرہے ہیں؛ لہٰذا مَیں معذور ہوں۔ دیکھو! اللہ والوں کی یہ شان ہوتی ہے کہ ایک مسلمان کا دل بھی نہ ٹوٹے اور تقویٰ کا تقاضہ بھی پورا ہو جائے۔

ماتحتوں کی نافرمانی کا ایک سبب

بہر حال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ شریعت نے بیوی بچوں کا جو نفقہ واجب کیا ہے اس کی ادائیگی میں ہم اور آپ کوشش کرتے ہیں، لیکن بھائی! اگر ہم ایسی غذا لا کر کھلاویں گے تو اس کے نتیجہ میں گھروں میں اللہ کی بھی اور آپ کی بھی نافرمانیاں ہی ہوں گی۔ اولاد نافرمان ہوگی، بیوی نافرمان ہوگی۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ بیوی نماز نہیں پڑھتی، مَیں تو بہت سمجھاتا ہوں، لیکن ٹی وی دیکھتی رہتی ہے، کسی طرح مانتی ہی نہیں، اولاد بھی نہیں مانتی۔ یہ جو نافرمانیاں ہوتی ہیں ان کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اگر کسی کے یہاں ایسا ہو رہا ہو تو آپ اس کے متعلق ایسا سوچنے لگیں۔ یہ بھی ہماری ایک بڑی مصیبت ہو گئی ہے، یہ نظریہ بھی بہت ہی غلط ہے، حالانکہ اسلام اس کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔ آپ اپنے لئے تو ضرور یہ سوچیں کہ کہیں کوئی ایسی بات تو نہیں ہو رہی ہے، لیکن دوسرے کے متعلق کبھی ایسا مت سوچیں۔ ہمارا معاملہ اُلٹ گیا ہے، دوسروں کے لئے سوچتے ہیں، لیکن اپنے لئے کبھی بھولے سے بھی نہیں سوچتے ہمارے بزرگوں میں معاملہ برعکس تھا کہ ایسی بات اپنے گھر میں ہو رہی ہے تو وہ سوچتے تھے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ مَیں مشتبہ غذا لا کر ان کو کھلا رہا ہوں۔ اس لئے

اگرکسی دوسرے کے یہاں ایسا ہورہا ہوتو وہاں یہ چیز فٹ کرنے کی کوشش مت کرنا۔ خیر! عرض کرنے کا حاصل یہ ہے کہ حلال کا اہتمام کیا جائے، یہ بہت ضروری ہے۔

پانچ لاکھ روپے صدقہ کردیے

ہمارے اسلاف کے واقعات ہم پڑھیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تجارت میں ایک پارٹنر تھا، اور امام صاحب کی عادت یہ تھی کہ تجارت کرتے تھے لیکن خود سودا نہیں کرتے تھے، دوسروں کو مال دیدیتے تھے اور نفع میں اس کو شریک کر لیتے تھے۔ حفص بن عبدالرحمٰن آپ کے شریک تھے، آپ نے ان کے پاس کپڑوں کے کئی تھان بھجوائے کہ اس کو فروخت کر دینا اور جو نفع ہوگا اس میں شرکت ہوگی۔ ایک کپڑے میں عیب تھا، آپ نے کہلوایا کہ جو خریدار آوے اس کو یہ عیب بتا دینا، پھر بیچنا۔ ان کے یہاں ہول سیل میں سودا ہوتا تھا۔ خیر! ایک آدمی بیس ہزار درہم میں پورا مال خرید کر لے گیا۔ آج کل کے حساب سے باسٹھ کلو چاندی جو تقریباً پانچ لاکھ روپے کی ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے پوچھا کہ وہ عیب بتا دیا تھا؟ انہوں نے کہا کہ مَیں وہ عیب بتانا تو بھول ہی گیا۔ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا بلکہ حقیقتاً وہ بھول گئے تھے۔ پوچھا کہ کس کے ہاتھ بیچا ہے؟ انہوں نے کہا کہ وہ بھی معلوم نہیں، اگر معلوم ہوتا تب بھی معاملہ صاف کرا لیتے۔ تو امام صاحب نے پورے بیس ہزار درہم (نفع بھی اور پونجی بھی) صدقہ کر دیے اور آئندہ کے لئے ان کے ساتھ پارٹنر شپ (PartnerShip) بھی ختم کر دی لہٰذا شریعت نے جو نفقہ کا حکم دیا ہے، اس کو حاصل کرنے کے معاملہ میں حلال کا اہتمام بہت ہی ضروری ہے۔

اَلنَّفَقَةُ عَلیٰ الْعَیَالِ

اہل وعیال پر خرچ کرنا

مجلس (۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اہل وعیال کے اوپر خرچ کرنے کے سلسلہ میں بیان چل رہا ہے۔

جو کچھ بھی خرچ کروگے؛ اس کا بدلہ پاؤگے

﴿وَمَاأَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْئٍ فَهُوَيُخْلِفُهُ﴾ تم جو کچھ بھی خرچ کروگے اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ دنیامیں بھی اور آخرت میں بھی عطافرمائے گا۔ اہل وعیال کے اوپر جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے اس کا بھی یہی حکم ہے۔ بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ آدمی اگر مسجد بنانے میں، مدرسہ بنانے میں، اللہ کے راستہ میں، کسی غریب کو کھانا کھلانے میں، یا کسی اور کام میں خرچ کرے؛ تب ہی اس کو ثواب ملتا ہے، لیکن اگر وہ اپنے گھر والوں کے اوپر کچھ خرچ کرتا ہے تو اس میں ثواب نہیں ملے گا۔ اس آیت کو ذکر کر کے بتلا دیا گیا کہ جس کام میں بھی جو کچھ بھی آپ خرچ کریں گے، بشرطیکہ وہ کام ایسا ہو جہاں خرچ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ دنیا اور آخرت میں ضرور عطا فرمائیں گے۔

کون سا خرچ افضل ہے؟

۲۸۹۔عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: دِیْنَارٌ أَنْفَقْتَهُ فِیْ سَبِیْلِ اللهِ، وَدِیْنَارٌ أَنْفَقْتَهُ فِیْ رَقَبَةٍ، وَدِیْنَارٌ تَصَدَّقْتَ بِهٖ عَلٰی مِسْكِیْنٍ، وَدِیْنَارٌ أَنْفَقْتَهُ عَلٰی أَهْلِكَ أَعْظَمُهَا أَجْراً الَّذِیْ أَنْفَقْتَهُ عَلٰی أَهْلِكَ. (رواه مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک دینار وہ ہے جو تم اللہ کے راستہ میں خرچ کرو، ایک دینار وہ ہے جو کسی غلام کے آزاد کرنے میں خرچ کرو، ایک دینار وہ ہے جو آپ کسی غریب پر صدقہ کریں اور ایک دینار وہ ہے جو آپ اپنے گھر والوں پر خرچ کریں، ان چاروں میں سب سے زیادہ ثواب کے اعتبار سے بڑھا ہوا وہ ہے جو آپ نے اپنے گھر والوں پر خرچ کیا۔

افادات:- اللہ تعالیٰ کا راستہ عام ہے، چاہے جہاد میں خرچ کرو، طلبِ علم میں خرچ کرو، تبلیغ میں خرچ کرو، حج میں خرچ کرو، عمرہ میں خرچ کرو؛ یہ سب اس میں داخل ہے۔ اسی طرح پہلے زمانہ میں غلام ہوا کرتے تھے، غلام کو آزاد کرنے پر بھی بہت ثواب اور اجر کا وعدہ کیا گیا ہے اور اس کی بڑی ترغیب دی گئی ہے۔ کسی غلام کو آزاد کرنا گویا اس کو ایک نئی زندگی عطا کرنا ہے۔

یہاں چار قسم کے خرچوں کا تذکرہ کیا گیا (۱) ایک روپیہ وہ ہے جو آپ اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں (۲) ایک روپیہ وہ ہے جو کسی غلام کو آزاد کرانے میں خرچ کرتے ہیں (۳) ایک روپیہ وہ ہے جو کسی غریب پر صدقہ کرنے میں خرچ کرتے ہیں (۴) اور ایک روپیہ وہ ہے جو اپنے گھر والوں کا جو نان نفقہ واجب ہے اس میں خرچ کرتے ہیں۔

حضور ﷺ چاروں کا تذکرہ کرنے کے بعد آگے فیصلہ کے طور پر فرماتے ہیں کہ ان چاروں میں سب سے زیادہ ثواب کے اعتبار سے بڑھا ہوا وہ روپیہ ہے جو آپ نے اپنے گھر والوں پر خرچ کیا یعنی اس میں آپ کو سب سے زیادہ ثواب ملے گا۔ اللہ کے راستہ میں خرچ کیا جانے والا، غلام کو آزاد کرانے میں خرچ کیا جانے والا، کسی غریب پر صدقہ کے طور پر خرچ کیا جانے والا اور اپنے گھر والوں پر خرچ کیا جانے والا؛ ان میں سب سے زیادہ ثواب اس روپیہ میں اور اس رقم میں ملتا ہے جو آپ نے اپنے گھر والوں پر خرچ کی ہے۔

اور اس کی وجہ علماء بتاتے ہیں کہ گھر والوں کا نفقہ آپ پر فرض ہے، اور جو بھی کسی مسکین اور غریب کو صدقہ کے طور پر دیں گے یا کسی غلام کو آزاد کرانے میں آپ خرچ کریں گے، یا اللہ کے راستہ میں خرچ کریں گے؛ یہ سب نفل ہے، اور سب ہی جانتے ہیں کہ فرض کا ثواب نفل سے زیادہ ہوتا ہے، اسی لئے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ

گھر والوں پر خرچ کیا جانے والا روپیہ زیادہ اجر رکھتا ہے۔

نیت درست کرلیں

اور یہ بہت اہم چیز ہے، جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے سماج میں کون ہے جو اپنے گھر والوں، اپنے بال بچوں، اپنی بیوی وغیرہ کے نفقہ کے لئے کمانے کے واسطے محنت ومشقت نہ اٹھاتا ہو، سب ہی محنت ومشقت اٹھاتے ہیں اور ان کے لئے زحمت اُٹھا کر ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، لیکن یہ سب بوجھ، مفت کی بیگاری اور مجبوری سمجھتے ہیں، حالانکہ ایسا نہ سمجھا جائے بلکہ آدمی یوں سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا نفقہ میرے اوپر فرض اور واجب کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے اوپر لازم کئے گئے فرض اور واجب کو ادا کرنے کے لئے مَیں محنت کر رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کر رہا ہوں؛ تو ان شاء اللہ جو کچھ بھی آپ محنت کریں گے وہ سب ثواب اور اجر میں شمار ہوگا۔

نیت بدل جانے سے حکم بدل جاتا ہے

پچھلی مجلس میں بتلا چکا ہوں کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں ایک روایت نقل کی ہے کہ جو اپنے گھر والوں کو حلال روزی لاکر دینے کے واسطے محنت کرتا ہے وہ ایسا ہے جیسا کہ اللہ کے راستہ میں جہاد کر رہا ہے۔ اس لئے نیت کے بدل جانے سے عمل کا حکم بدل جاتا ہے۔ دراصل کسی چیز کا عبادت بننا اور کسی چیز پر ثواب کا حاصل ہونا اور نہ ہونا؛ اس کا مدار ہی نیت پر ہے۔ مثال کے طور پر فرض کر لیجئے کہ اگلے روز ذرا پیٹ خراب ہوگیا تھا، کہیں زیادہ کھانا کھالیا تھا، تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ایک دو روز

کھانا چھوڑ دو، اس لئے چھوڑ دیا اور کچھ نہیں کھایا اور اس طرح صبح سے شام تک بھوکا رہا، لیکن روزہ کی نیت نہیں تھی بلکہ نیت صرف یہ تھی کہ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی، یہ آدمی بھی صبح سے شام تک کھانا نہیں کھا رہا ہے۔ اور ایک وہ آدمی جو اللہ تبارک وتعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے روزہ کی نیت سے صبح سے شام تک بھوکا پیاسا رہے، تو اس کو روزہ کا ثواب ملے گا، اور پہلے والا بھی بھوکا پیاسا رہا لیکن اس کو روزہ کا ثواب نہیں ملے گا۔

فرق نیت سے ہوتا ہے

عبادت اور عادت میں فرق نیت ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہم لوگ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو نیت کر کے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھتے ہیں، اور ایک آدمی بس کے انتظار میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہے، یہ بھی اسی طرح کھڑا ہے جیسے ایک نمازی آدمی نماز میں باقاعدہ کھڑا رہتا ہے۔ یا جیسے ایک استاذ نے طالبِ علم کو سزا کے طور پر کھڑا کر دیا، یا رکوع کی طرح جھکا کر کھڑا کر دیا، تو وہ بھی بظاہر رکوع میں ہے؛ لیکن وہ عبادت نہیں کہلائے گی۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ عادت اور عبادت میں فرق نیت کی وجہ سے ہوتا ہے، آدمی اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کرنے کا ارادہ کر لے تو اسے عبادت کہیں گے، اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانا یہی عبادت واطاعت ہے۔ روزہ وغیرہ کی جو شکل وصورت بتلائی گئی ہے وہ بھی درحقیقت عبادت نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کر رہے ہیں، یہ نیت ہو تب ہی عبادت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانا ہی عبادت ہے

اسی لئے اگر ہم ایسے وقت میں نماز پڑھیں جس میں نماز پڑھنے کی شریعت نے

اجازت نہیں دی، مثلاً سورج طلوع ہورہا ہے، اس وقت باقاعدہ کوئی آدمی وضو کرکے نماز کی نیت سے نماز پڑھے، جیسا نماز میں تلاوت، قیام، رکوع، سجدہ کرتے ہیں وہ سب کچھ کرے، تو اس پر ثواب نہیں ملے گا بلکہ وہ گنہگار ہوگا، اس لئے کہ اس وقت نماز سے منع کیا گیا ہے، سورج کے طلوع ہوتے وقت نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے، تو اس پر ثواب تو کیا ملتا، اُلٹا گنہگار ہوگا۔

تو دیکھو! یہاں صورت نماز کی ہے، لیکن اس پر کوئی ثواب نہیں ملا۔ معلوم ہوا کہ اس میں عبادت کی شان اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے کی وجہ سے آتی ہے، کیونکہ یہ ایسے وقت میں نماز پڑھ رہا ہے جب اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، اس لئے ایک ہی صورت ہونے کے باوجود وہ نماز نہیں کہلائے گی، اور اس پر کوئی ثواب نہیں ملے گا، بلکہ اُلٹا گنہگار ہوگا۔

اسی طرح روزہ کا معاملہ بھی ہے، سال بھر کے اندر کچھ دن ایسے بھی ہیں کہ جن میں روزہ رکھنے سے منع کیا گیا ہے، جیسے عیدالفطر، عیدالاضحیٰ یعنی بقرعید کا دن، اور اس کے بعد تین دن، گیارہ، بارہ، تیرہ ذی الحجہ؛ جن کو ایامِ تشریق کہتے ہیں، اس طرح کل پانچ دن ایسے ہیں جن میں شریعت نے روزہ رکھنے سے منع کیا ہے، اب کوئی آدمی باقاعدہ نیت کرکے روزہ رکھے، تو ایسے روزوں پر ثواب تو کیا ملتا، اُلٹا وہ گنہگار ہوگا۔

معلوم ہوا کہ روزہ کی یہ صورت عبادت نہیں ہے بلکہ عبادت تو اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ بعض اوقات میں نماز پڑھنے سے منع کردیا گیا، اور بعض ایام کے اندر روزہ رکھنے سے منع کردیا گیا، وہ دراصل یہی بتلانے کے لئے ہے کہ نماز اور روزہ کی جو شکل وصورت شریعت نے بتائی ہے، وہ بذاتِ خود کوئی عبادت نہیں ہے، بلکہ اصل عبادت تو اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانا ہے، جس موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم دیا گیا ہو اس کو اللہ ہی کا حکم بجالانے کے ارادے اور نیت سے انجام دیں؛ تو وہ عبادت ہے۔

یہ بھی عبادت ہے

بال بچوں کا خرچہ ونفقہ،ان کی ضرورتیں پوری کرنا آپ پرضروری قرار دیا گیا ہے، ان کے لئے آپ اگر حلال طریقہ سے کمائیں گےاور شریعت کی حدود میں رہ کرآپ جو کچھ بھی کریں گے یعنی اس کمانے میں دوسرے کسی گناہ کا ارتکاب نہ ہو، جیسے نماز کا وقت آرہا ہے،تو نماز پڑھ رہے ہیں، رمضان ہے تو روزے رکھ رہے ہیں۔ایسا نہیں کہ نوکری ایسی کرلی کہ نماز چھوٹ رہی ہے۔تجارت ایسی کررہے ہیں کہ نماز کا وقت آرہا ہے تو نماز نہیں پڑھ رہے ہیں؛ پھرتو یہ گڑبڑ والا معاملہ ہوجائے گا۔شریعت کے حدود میں رہ کر ساری چیزوں کی رعایت کرتے ہوئے آپ کمارہے ہیں؛ تو یہ کمانا بھی عبادت ہے۔

فرض کا ثواب نفل سے زیادہ ہے

بہرحال !مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ یہاں نبی کریم ﷺ نے اسی غلط فہمی کو دور کیا ہے کہ چار قسم کے خرچے بتائے (١) ایک روپیہ وہ جو اللہ کے راستہ میں خرچ کیا جائے (٢) ایک روپیہ وہ جو کسی غلام کے آزاد کرنے میں خرچ کیا جائے (٣) ایک روپیہ وہ جو کسی غریب پرصدقہ کیا جائے (٤) اور ایک روپیہ وہ جو آپ اپنے بال بچوں پران کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے خرچ کریں۔نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ چوتھے نمبر والے میں سب سے زیادہ ثواب ہے،اس لئے کہ وہ خرچ آپ پر فرض ہے اور فرض کا ثواب نفل کے مقابلہ میں زیادہ ہوا کرتا ہے۔

حدود کی رعایت ضروری ہے

٢٩٠.وعن أبی عبدالله ويقال له أبی حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ جو نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام

عبدالرحمن ثَوْبَانَ بْنِ بُجْدُدٍ مَوْلٰی رسولِ اللہ ﷺ قال رسولُ اللہ ﷺ: أَفْضَلُ دِيْنَارٍ يُنْفِقُهُ الرَّجُلُ دِيْنَارٌ يُنْفِقُ عَلٰى عِيَالِهٖ، وَدِيْنَارٌ يُنْفِقُهُ عَلٰى دَابَّتِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَدِيْنَارٌ يُنْفِقُهُ عَلٰى أَصْحَابِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ. (رواہ مسلم)

ہیں، فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے اشاد فرمایا: سب سے بہتر دینار جس کو آدمی خرچ کرتا ہے، وہ ہے جس کو آدمی اپنے بال بچوں پر خرچ کرے۔ اور (پھر) وہ دینار جو اللہ کے راستہ میں اپنی سواری پر خرچ کرے، اور (پھر) وہ دینار جو اپنے رفقاء پر اللہ کے راستہ میں خرچ کرے۔

افادات:- بال بچوں پر خرچ کرنے میں سب سے زیادہ ثواب ہے لیکن وہ بھی حدود میں رہ کر ہو تب ہی۔ کوئی آدمی یہ سمجھے کہ بال بچوں کو سنیما دکھانے کے لئے پیسے خرچ کریں؛ تو یہ صحیح نہیں ہوگا، اس لئے کہ فضول خرچی کی شریعت اجازت نہیں دیتی، ہر چیز میں شریعت نے حدود بتلائے ہیں ان کی رعایت ضروری ہے۔

﴿وَدِيْنَارٌ يُنْفِقُهُ عَلٰى دَابَّتِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ﴾ اور اللہ کے راستہ میں اپنی سواری پر جو پیسہ خرچ کرتا ہے جیسے جہاد کے لئے، حج کے لئے، تبلیغ کے لئے، طلبِ علم کے لئے نکلا اور اس میں جو سواری - گھوڑا، اونٹ، اپنی گاڑی، موٹر وغیرہ - استعمال کر رہا ہے، اور اس پر جو پیسہ خرچ کر رہا ہے؛ اس پر بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ثواب ہے۔

﴿وَدِيْنَارٌ يُنْفِقُهُ عَلٰى أَصْحَابِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ﴾ اور اپنے رفقاء کے اوپر اللہ کے راستہ میں جو خرچ کرتا ہے۔ جو لوگ اللہ کے راستہ میں اس کے ساتھ شریک ہیں، سفرِ حج میں شریک ہیں، سفرِ طلبِ علم میں، سفرِ جہاد میں، سفرِ تبلیغ میں، ان پر جو کچھ خرچ کرتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں افضل ہے۔ گویا یہ وہ جگہیں ہیں جن پر خرچ کرنے سے زیادہ ثواب ملتا ہے، لیکن اول نمبر پر اسی کو ذکر کیا کہ جو روپیہ اپنے بال بچوں پر خرچ کرے؛ وہ سب سے افضل ہے۔

ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا

۲۹۱. وعن أم سلمة رضی اللہ عنہا قَالَتْ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللهِ ! هَلْ لِيْ أَجْرٌفِيْ بَنِيْ أَبِيْ سَلِمَةَ أَنْ أُنْفِقَ عَلَيْهِمْ وَلَسْتُ بِتَارِكَتِهِمْ هٰكَذَاوَهٰكَذَا،اِنَّمَاهُمْ بَنِيَّ؟فَقَالَ: نَعَمْ! لَكِ أَجْرُ مَاأَنْفَقْتِ عَلَيْهِمْ. (متفق عليه)

حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا اے اللہ کے رسول! مجھ سے ابوسلمہ کی جو اولاد ہے ان پر اگر مَیں خرچ کروں تو اس میں مجھے ثواب ملے گا؟ اور مَیں ان کو ایسے ہی بے یارو مددگار نہیں چھوڑوں گی، وہ میری ہی اولاد ہے۔ آپ نے فرمایا: جی ہاں! تم ان پر جو بھی خرچ کروگی اس میں تم کو ثواب ملے گا۔

افادات: –ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا پہلے حضرت اُبوسلمہ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں اورانہیں کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ گئی تھیں، پھر وہاں سے مدینہ منورہ آئیں، یہاں آنے کے بعد حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو بیوہ ہو گئیں، عدت پوری ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ نکاح کیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو کوئی اولاد نہیں ہوئی، لیکن پہلے شوہر ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے ان کی کئی اولاد تھیں، زینب بنت ابی سلمہ، عمر بن ابی سلمہ وغیرہ، اوران کے سب بچے چونکہ چھوٹے تھے اور یہ ان سب کو لیکر ہی آئی تھیں اس لئے یہ سب حضورا کرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی پرورش اور تربیت میں تھے۔

بچوں کو اپنے ساتھ کھانے بٹھانا چاہیے

عمر بن اُبی سلمہ کا قصہ بھی بخاری شریف کتاب الأطعمہ میں ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مَیں چھوٹا بچہ تھا اور ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے لئے مجھے اپنے ساتھ بٹھاتے تھے۔اس سے معلوم ہوا کہ کھاتے وقت بچوں کو بھی اپنے ساتھ بٹھانا چاہیے، بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے وہ خود اکیلے کھالیتے ہیں، بچوں کو ساتھ میں نہیں

بٹھاتے۔ بھائی! جب تک آپ بچوں کو ساتھ لے کر نہیں بیٹھیں گے، وہاں تک بچے کھانے پینے کے آداب سے کیسے واقف ہوں گے؟ وہ تو پھر اپنے طور پر جو کچھ کرتے رہیں گے ان کی اصلاح نہیں ہو سکے گی۔ اس لئے کھانے پینے کے درمیان بھی بچوں کو اپنے ساتھ شریک رکھنا چاہیے اور اپنے ساتھ بٹھانا چاہیے۔ حضورِ اکرم ﷺ بھی عمر بن ابی سلمہ کو اپنے ساتھ بٹھایا کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ مَیں نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک پلیٹ میں کھانا کھا رہا تھا اور میرا ہاتھ پوری پلیٹ میں گھوم رہا تھا، جیسا کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ یہاں ہاتھ مارا، اِدھر مارا اُدھر مارا۔ تو حضورِ اکرم ﷺ نے مجھے تین نصیحتیں فرمائیں کہ بیٹا! جب کھانا کھاؤ تو پہلے بسم اللہ پڑھو، دوسرا اپنے سامنے سے کھاؤ، اور تیسرا یہ کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔ (بخاری شریف۔۵۳۷۶)

حضور ﷺ کی نصیحت اور حضراتِ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین

حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ﴿فَمَا زَالَتْ تِلْكَ طِعْمَتِيْ بَعْدُ﴾ حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی خصوصیت تھی کہ چاہے بڑا ہو یا چھوٹا، بچہ ہو یا جوان اور بوڑھا، عورت ہو یا مرد ہو؛ جب ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے کسی چیز کے متعلق تنبیہ فرما دی، یا ہدایت فرما دی؛ تو بس! پھر تو وہ بات ان کے دل پر پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہو جاتی تھی، پھر کبھی اس کے خلاف نہیں کرتے تھے۔ حضرت عمر بن ابی سلمہ چھوٹے بچے تھے لیکن وہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سے میرے کھانے کا طریقہ یہی ہو گیا یعنی حضورِ اکرم ﷺ نے کھانے کے لئے جو تاکید فرمائی تھی، اسی کے مطابق وہ کھاتے تھے، اس میں ذرہ برابر فرق نہیں ہوتا تھا۔

بہرحال! حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد ان کے اگلے شوہر سے تھیں، ان میں یہ عمر بن ابوسلمہ بھی تھے اور نبی کریم ﷺ کے پروردہ تھے، ان کے متعلق ایک مرتبہ نبی کریم

ﷺ سے حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا ﴿هَلْ لِيْ أَجْرٌ فِيْ بَنِيْ أَبِيْ سَلِمَةَ أَنْ أُنْفِقَ عَلَيْهِمْ﴾ اے اللہ کے رسول! مجھ سے ابوسلمہ کی اولاد جو ہے ان پر اگر مَیں خرچ کروں تو اس خرچ کرنے میں مجھے ثواب ملے گا؟ ﴿وَلَسْتُ بِتَارِكَتِهِمْ هٰكَذَا وَهٰكَذَا، اِنَّمَاهُمْ بَنِيَّ﴾ اور ظاہر ہے مَیں ان کو ایسے ہی بے یارومددگار نہیں چھوڑوں گی کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں بلکہ وہ میری ہی اولاد ہے۔ مطلب یہ کہ میری اولاد ہے اور مَیں ان کی ضرورت کو پورا کرنے کا اہتمام کروں گی، اب ان کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کھانے میں کپڑے میں اور دوسرے کاموں کے اندر مَیں جو کچھ بھی خرچ کروں گی؛ تو کیا اس پر مجھے ثواب ملے گا؟ نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا ﴿نَعَمْ! لَكِ أَجْرُ مَا أَنْفَقْتِ عَلَيْهِمْ﴾ جی ہاں! تم ان پر جو بھی خرچ کروگی اس میں تم کو ثواب ملے گا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ آدمی اپنے بال بچوں پر جو کچھ بھی خرچ کرتا ہے؛ یہ بھی ثواب سے خالی نہیں ہے۔ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ کسی غریب کو کھانا کھلا دیا یہی نیکی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، اپنے بال بچوں کو جو کچھ کھلا رہے ہیں یہ بھی نیکی ہے، اور اس پر بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں ثواب ملتا ہے، اور جیسا کہ اوپر گذر چکا کہ اس میں سب سے زیادہ ثواب ہے، اس لئے آدمی اس کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد اور متعین کیا ہوا فریضہ، ذمہ داری اور ایک واجب سمجھ کر انجام دے اور اس پر اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے مناقب

۲۹۲. وعن سعد بن أبي وقاص رضی اللہ عنہ في حديثه الطويل الذي قدّمناهُ في أوّل الكتاب في باب النية، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی طویل حدیث جو شروع کتاب میں نیت کے باب میں گذر چکی ہے اس میں یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم جو

قَالَ لَهٗ: وَاِنَّکَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِیْ بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ اِلَّا أُجِرْتَ بِهَا، حَتّٰی مَاتَجْعَلُ فِیْ فِیْ امْرَأَتِکَ. (متفق علیه)

کچھ بھی خرچ کر کے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہو گے، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو اجر وثواب ملے گا، یہاں تک کہ تم جو (لقمہ) اپنی بیوی کے منھ میں رکھو گے (اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو ثواب ملے گا۔)

افادات:- حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ان دس حضراتِ صحابہ میں سے ہیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی موقعہ پر ایک ہی مجلس میں جنت کی بشارت سنائی تھی، جن کو عشرۂ مبشرہ کہا جاتا ہے۔ اور عشرۂ مبشرہ دوسرے صحابہ کے مقابلہ میں افضل سمجھے جاتے ہیں۔ یہ مستجاب الدعوات تھے، ان کی دعا ہمیشہ قبول ہوتی تھی۔ ان کی ایک طویل روایت کا ایک حصہ یہاں پیش فرمایا ہے، پوری روایت شروع کتاب میں نیت کے بیان میں گذر چکی ہے۔

دراصل فتحِ مکہ کے موقعہ پر یہ بیمار ہو گئے تھے اور ان کو زندہ رہنے کی امید نہیں رہی تھی تو انہوں نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ شاید میں اسی بیماری میں انتقال کر جاؤں گا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو زندہ رکھے گا اور آپ کے ذریعہ ایک قوم کو فائدہ پہنچائے گا اور ایک قوم کو نقصان پہنچائے گا۔ چنانچہ اہلِ فارس سے مقابلہ کے نتیجہ میں ان کی قوت ختم ہوئی اور مسلمانوں کو پورے طور پر ان پر تسلط اور غلبہ نصیب ہوا، اس جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے سپہ سالار یہی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تھے۔ اسی بیماری کے وقت ایک جملہ انہوں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اے اللہ کے رسول! میرے وارثوں میں صرف ایک لڑکی ہے اور کوئی نہیں ہے، تو کیا میں اپنا پورا مال صدقہ کر دوں؟ یا پورے مال کو اللہ کے راستہ میں دینے کی وصیت کر دوں؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ نہیں۔ پھر

انہوں نے کہا کہ دو تہائی؟ تو نبی کریم ﷺ نے کہا کہ نہیں۔ پھر انہوں نے کہا کہ آدھا؟ تو نبی کریم ﷺ نے کہا کہ آدھا بھی نہیں۔ پھر انہوں نے کہا کہ ایک تہائی؟ تو نبی کریم ﷺ نے کہا کہ ہاں! ایک تہائی کی اجازت ہے، لیکن ساتھ میں یہ بھی فرمایا کہ تم اپنے پیچھے اپنے وارثوں کو پیسے والا مالدار چھوڑ کر جاؤ یہ اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ غریب رہیں اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں، یعنی یہ پیسے تم ان کے ہاتھ میں دو گے تو ان کو وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے خرچ کریں گے اور کسی کے محتاج نہیں رہیں گے۔

مال جیسا آرہا ہے؛ ویسا جارہا ہے

ایک بات یاد رہے، بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ جو اپنی سیدھی اولاد ہوتی ہے وہی وارث ہے، مثلاً اگر کسی کی بیٹی ہے اور ساتھ میں بھائی بہن وغیرہ ہیں تو چونکہ بھائی بھی وارث ہے اور بہن بھی وارث ہے۔ اب وہ یوں سمجھتا ہے کہ میرا مال ان کے پاس خواہ مخواہ مفت میں جارہا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بھائی! کسی کے پاس مفت میں نہیں جارہا ہے بلکہ جس اللہ نے تم کو یہ دولت و نعمت عطا فرمائی ہے، اسی کا فیصلہ ہے کہ تمہارے مرنے کے بعد فلاں فلاں وارث ہیں، اس لئے یہ سب مفت میں نہیں جارہا ہے بلکہ انہیں کا حصہ ہے، اگر یہی دیکھا جائے تو آپ کے پاس بھی تو مفت میں ہی آیا ہے۔ لہٰذا جیسا آرہا ہے؛ ویسا ہی جارہا ہے۔

بہر حال! بعض لوگ یوں سمجھ کر کہ یہ تو ہمارے نہیں ہیں، یہ کوشش کرتے ہیں کہ مرنے سے پہلے ایسی شکلیں اختیار کی جائیں کہ مال کم سے کم ہو جائے اور ان کے ہاتھ میں کم سے کم جائے، حالانکہ جانتے ہیں کہ وہ بھائی بہن غریب و محتاج ہیں، اور ان کے ساتھ تو ویسے بھی اپنی زندگی میں حسنِ سلوک کرنا چاہیے تھا، اب مرنے کے وقت جو کچھ

تم چھوڑ کر جا رہے ہو، اس میں اللہ تعالیٰ نے ان کا حصہ لگا دیا، تو اب اس میں بھی کم کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟

جنت سے ایک بالشت دور جہنمی

اسی لئے آدمی کبھی ایسی وصیت کر جاتا ہے اور بڑا گنہگار بن جاتا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ آدمی زندگی بھر نیکی کے کام کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک بالشت کا فاصلہ رہ جاتا ہے، لیکن مرتے وقت کوئی ایسی وصیت کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ جہنمی بن جاتا ہے (مشکوٰۃ شریف۔ ص ۲۶۵) اس لئے کہ وہ کسی کا حق مار تا ہے، شریعت سے ناواقفیت کی وجہ سے ایسی سب باتیں پیش آتی ہیں۔

ایک لقمہ پر بھی ثواب ہے

بہر حال! حضور ﷺ نے آگے ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا ﴿وَانَّکَ لَنْ تُنفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِیْ بِھَا وَجْهَ اللهِ اِلَّا أُجِرْتَ بِهَا﴾ تم جو کچھ بھی خرچ کر کے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو اجر و ثواب ملے گا، چاہے وہ کسی پر بھی خرچ کر رہے ہو، آگے ایسی بات حضور ﷺ بتا رہے ہیں جو جلدی سے آدمی کی طبیعت قبول نہیں کرتی ہے کہ اس پر بھی ثواب مل سکتا ہے ﴿حَتّٰی مَاتَجْعَلُ فِیْ فِیْ امْرَأَتِکَ﴾ یہاں تک کہ تم جو لقمہ اپنی بیوی کے منہ میں رکھو گے اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو ثواب ملے گا۔ جب ایک لقمہ اس کے منہ میں رکھے جانے پر ثواب مل رہا ہے تو جو کچھ بیوی بچوں پر خرچ کیا جائے گا اس میں تو ضرور ثواب ملے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر بیوی کے جو حقوق واجب کئے ہیں، وہ ان کو ادا کر رہا ہے۔ اس کو خوش رکھنا، اس کے دل

کو راضی رکھنا، اس کی دلجوئی کرنا، اس پر خرچ کرنا؛ یہ سب بھی اللہ کے دئے ہوئے حکم ہیں تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ثواب بھی ملے گا۔

صحبت پر ثواب

پہلے بھی بتا چکا ہوں، حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آدمی اپنی بیوی کے ساتھ صحبت اس نیت سے کرے کہ مَیں اس کا حق ادا کر رہا ہوں تو اس پر بھی ثواب ملے گا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم (اللہ تعالیٰ ان کو بہترین بدلہ دے) نے فوراً سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! ایک آدمی اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کر کے اپنی شہوت پوری کر رہا ہے؛ کیا اس پر بھی ثواب ملے گا؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ اپنی شہوت کسی ناجائز اور حرام جگہ میں پوری کرتا تو گناہ ہوتا یا نہیں؟ تو اپنے آپ کو گناہ سے بچانے کے لئے اگر اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کر رہا ہے اور اس کا (بیوی کا) حق ادا کرنے کے لئے کر رہا ہے تو کیا اس پر ثواب نہیں ملے گا؟ آدمی گناہ سے بچنے کے لئے جب کوشش کرے گا تو ضرور ثواب ملے گا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا پہلو صحابہ کرام کے سامنے اجاگر کیا جس کی وجہ سے اس کا نیکی ہونا اور اس پر ثواب کا ملنا کھلم کھلا واضح ہو گیا۔

بیوی کے منھ میں لقمہ دینے پر ثواب کیوں؟

اصل میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے شریعت کا جو نظام دنیا میں قائم کیا ہے اس کو جاری کرنے اور اس کو تقویت پہنچانے کے لئے انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام دنیا میں تشریف لاتے ہیں اور شیطان اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس نظام کو توڑنے اور اس کو کمزور کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو آدمی کا اپنی بیوی کے منھ میں لقمہ دینا یہ میاں بیوی کے تعلقات مضبوط کر

نے اوران کے درمیان محبت کے بڑھنے کا سبب ہے،اور جب محبت بڑھے گی تو آپسی حقوق زیادہ سے زیادہ ادا ہوں گے،شوہر بھی بیوی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے گا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے نکاح کو جاری کر کے دنیا میں جو شرعی نظام قائم کیا ہے وہ بھی سیدھی پٹری پر چلے گا۔ یوں نہ سمجھئے کہ یہ لقمہ ایسا ہی بیکار ہے، بلکہ یہ تو خدائی نظام میں تقویت پہنچانے والا ہے۔شیطان کا معاملہ اُلٹا ہے کہ شیطان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی بھی طرح سے میاں بیوی کے تعلقات میں دراڑ پڑے،اور یہ گاڑی پٹری سے ہٹ جاوے۔اسی لئے شیطان کی نگاہ میں اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ شطونگڑا ہے جو میاں بیوی کے تعلقات کو خراب کرانے والا ہو۔

تو نے سب سے عمدہ کام کیا

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ شیطان شام کے وقت سمندر پر اپنا تخت بچھاتا ہے اور اپنے تمام چیلے چانٹوں اور شطونگڑوں (چھوٹے شیطانوں) سے حساب وکتاب لیتا ہے، جیسے شام کو آقا اپنے ماتحتوں سے رپورٹ مانگتا ہے کہ آج تم نے کیا کام کیا؟ تو نے کیا کیا؟ تو نے کیا کیا؟ ہر ایک اپنا اپنا کارنامہ بیان کرتا ہے۔ایک کہتا ہے کہ ایک آدمی نماز پڑھنے جا رہا تھا،مَیں نے اس کے دل میں دوسرے کام کا ایسا خیال ڈال دیا کہ وہ کام ہی میں لگا رہا اور نماز ضائع کردی۔شیطان کہتا ہے کہ ٹھیک ہے۔اس طرح دوسرا اور تیسرا؛اور دوسرے تمام سے ان کے کارنامے سننے کے بعد آخر میں کونہ میں سے ایک چیلا کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ مَیں نے میاں بیوی کے درمیان ایسا جھگڑا کرایا کہ الگ ہی نہیں ہوا یہاں تک کہ شوہر نے بیوی کو طلاق دیدی۔شیطان اس کو خوب گلے لگاتا ہے اور کہتا ہے کہ تو نے سب سے عمدہ کام کیا اور اس کو خوب شاباشی دیتا ہے۔(مسلم شریف۔۳۸۱۳)

یہ صرف طلاق ہی نہیں ہے

اس لئے کہ میاں بیوی کے تعلقات کا ٹوٹنا کوئی معمولی چیز نہیں ہے، اور اس کے نتیجہ میں صرف دو آدمیوں میں ہی جھگڑا نہیں ہوتا بلکہ دو خاندان ٹوٹتے ہیں۔ اب یہ خاندان اُس کا دشمن، اور وہ خاندان اِس کا دشمن بن جاتا ہے، یہ اُس کی برائی کرتا ہے اور وہ اِس کی برائی کرتا ہے۔ اب یہ نکاح تو ٹوٹ ہی گیا ہے، اور حلال طریقہ سے اپنی شہوت پوری کرنے کا جو ایک راستہ تھا وہ تو بند ہو گیا، اب آگے چل کر بعد میں دوسرے نکاح کے لئے معلوم نہیں کہ کب نوبت آتی ہے وہاں تک ضرورتیں اور طبعی تقاضے تو لگے ہوئے ہی ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ شیطان پھر زناکاری و بدکاری میں بھی مبتلا کر دے، اور معلوم نہیں اس کے نتیجہ میں کہ کیا کیا ہو گا۔ اس لئے یہ صرف ایک طلاق ہی نہیں ہے بلکہ بہت کچھ ہے، اسی وجہ سے شیطان اس پر بہت خوش ہوتا ہے۔

ایسا بیگانہ پن بھی کیا؟

بہر حال! انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ایسے ایسے طریقے بتلاتے ہیں جس سے دونوں کے تعلقات مزید خوشگوار ہوں اور ان دونوں میں محبت اور زیادہ بڑھے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ عورت مرد کے بچے ہوئے پانی سے وضو اور غسل نہ کرے، اور مرد عورت کے بچے ہوئے پانی سے غسل نہ کرے (ابوداود۔۸۱) بعض روایت میں یہ ہے۔ اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ مرد عورت کے بچے ہوئے پانی سے غسل نہ کرے (ابوداؤد۔۸۲) لیکن عورت مرد کے بچے ہوئے پانی سے غسل اور وضو کرے یا نہ کرے اس کی کوئی تصریح نہیں ہے۔ تو وہاں فقہاء نے اپنا اپنا نظریہ پیش فرمایا ہے۔ ہمارے اکابر میں سے حضرت علامہ عثمانی

رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صاحبِ شریعت نے جو حکم دیا وہ یہ ہے کہ میاں بیوی جب دونوں کے اندر تعلقات بالکل ایسے ہیں گویا دونوں ایک دوسرے کا جزو سمجھے جاتے ہیں کہ دونوں کے تعلقات ایسے ہیں کہ یہ اُس کا ایک حصہ ہے اور وہ اِس کا ایک حصہ ہے، اِس کے رشتہ دار اُس کے رشتہ دار ہیں اور اُس کے رشتہ دار اِس کے رشتہ دار ہیں، اسی لئے حرمت کے رشتے بھی قائم ہو جاتے ہیں، کتابوں میں مسئلہ لکھا ہے کہ بیوی کے جو اصول وفروع ہیں وہ مرد کے لئے اصول وفرع کے حکم میں ہو جاتے ہیں یعنی اس کے ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی وغیرہ۔ اسی طرح مرد کے اصول وفروع بھی عورت کے لئے ایسے ہی ہو جاتے ہیں۔ تو ان دونوں میں اتنا یگانگت کا رشتہ قائم ہو گیا، اب اس کے بعد ایسا بیگانہ پن کیوں ہو کہ وہ الگ غسل کر رہا ہے اور یہ الگ غسل کر رہی ہے؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ دونوں ایک ساتھ غسل کرو، یہ معاملہ ان کے تعلقات کو مزید استوار کرنے والا ہے۔

خیر! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ بیوی کے منھ میں لقمہ دئے جانے پر حضور ﷺ نے ثواب کا جو وعدہ فرمایا ہے اس کو کوئی آدمی شہوت پر محمول نہ کرے، بلکہ یہ ایک تو فطری چیز ہے اور تعلقات کا تقاضہ ہے، اور تعلقات جتنے استوار ہوں گے اتنی ہی حقوق کی ادائیگی زیادہ ہوگی اور جتنا اس میں بگاڑ ہوگا اُتنا مرد کا دھیان دوسری طرف جائے گا، اور عورت کا دھیان دوسری طرف جائیگا، اور دونوں (میاں بیوی) گناہ میں مبتلا رہیں گے اور جتنے دونوں کے تعلقات ٹھیک ہوں گے؛ اتنا ہی دونوں گناہ سے بچیں گے۔

نیت درست کر لی جائے

۲۹۳. عن أبی مسعود البدری رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: اِذَا أَنْفَقَ الرَّجُلُ عَلیٰ أَهْلِهِ

حضرت ابومسعود انصاری بدری رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں: جب آدمی اپنے گھر والوں پر

نَفَقَةً يَحتَسِبُهَا،فَهِيَ لَهُ صَدَقَةٌ. (متفق علیه)

خرچ کرتا ہے،اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتا ہے،تو وہ اس کے لئے صدقہ ہے۔

افادات:-﴿يَحتَسِبُهَا﴾اس خرچ کرنے میں وہ اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتا ہے یعنی گویا اللہ کا حکم سمجھ کراور یہ گمان کرتے ہوئے کہ مَیں جو خرچ کرر ہا ہوں اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ کو ثواب اور اجر ملے گا،تو وہ اس کے لئے صدقہ کا حکم رکھتا ہے یعنی جس طرح صدقہ پر ثواب ملتا ہے اس پر بھی اس کو ثواب ملے گا۔مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ بیوی بچوں پر خرچ تو سبھی کرتے ہیں لیکن اگر نیت ذرا درست کر لی جائے؛ تو یہی عبادت بن جائے گا اور اس پر ثواب ہی ثواب ہے۔

بیکار لوگ

۲۹۴.عن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: كَفىٰ بِالْمَرْءِ اِثْمًاأَن يُّضَيِّعَ مَنْ يَّقُوتُ. (أبو داود)

وراوہ مسلم فی صحیحہ معناہ قال: كَفىٰ بِالْمَرْءِ اِثْماًأَن يَّحبِسَ عَمَّنْ يَّمْلِكُ قُوْتَهٗ.

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی کے گناہ کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جس کے خرچہ کی ذمہ داری اس پر ہے اس کو ضائع کردے۔مسلم شریف کی روایت میں ہے: آدمی کے گناہ کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں سے خرچہ کو روکے رکھے

افادات:-یعنی بیوی بچوں کا نفقہ اس پر ہے لیکن وہ محنت کر کے کما کر لا کر ان کو دیتا نہیں ہے،جس کے نتیجہ میں وہ تکلیفیں اٹھا رہے ہیں اور برباد ہو رہے ہیں؛تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ آدمی کے گنہگار ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے یعنی یہ آدمی بڑا گنہگار ہے۔

بعض لوگ بیوی بچوں کے نفقہ کی ادائیگی کے لئے جو محنت کرنی چاہیے اور جو مشقت اُٹھانی چاہیے اور ان کی ضرورتیں پوری کرنے کا جو اہتمام ہونا چاہیے؛ وہ نہیں

کرتے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی پریشان رہتے ہیں۔ بیوی کی ضرورت ہے، وہ بھوکی مر رہی ہے، اس کے پاس پہننے کے لئے کپڑے نہیں ہیں، وہ دوسروں کے پاس سے قرض مانگ رہی ہے، وہ خود محنت اور مزدوری کر رہی ہے، دوسروں کے یہاں برتن دھوکر اور جھاڑو لگا کر اپنی ضرورتوں کو پورا کر رہی ہے، حالانکہ اس کی ضرورتیں تو آپ کو پوری کرنی چاہیے، آپ اس کی ضرورتیں پوری نہیں کر رہے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ ضائع ہو رہی ہے، یہ بہت بڑا نقصان ہو رہا ہے، ایسا آدمی بہت سخت گنہگار ہے۔

روپیہ خرچ کرنے سے گھٹنے والا نہیں ہے

۲۹۵ .عن أبی هريرةؓ أن النبیﷺ قَالَ مَا مِن يَّوْمٍ يُصْبِحُ الْعِبَادُ فِيْهِ اِلَّا مَلَكَانِ ينْزِلانِ، فَيَقُوْلُ أَحَدُهُمَا: اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقاً خَلَفاً، وَيَقُوْلُ الْاٰخَرُ: اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُمْسِكاً تَلَفاً.

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ارشاد فرمایا: ہر دن جب بندے صبح کرتے ہیں تو دو فرشتے آسمان سے دعا کرتے ہوئے اترتے ہیں، ان میں سے ایک یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرما یعنی جس نے خرچ کیا اور خرچ کے نتیجہ میں اس کا جو پیسہ گیا اس کے بدلہ میں اس کو دنیا اور آخرت میں دوسرا دیدے اور دوسرا فرشتہ یہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! روکنے والے کے مال کو برباد کر۔

افادات:- چونکہ عام طور پر آدمی اپنے بیوی بچوں پر یا جن کا خرچہ ونفقہ اس کے اوپر واجب ہے اس کی ادائیگی میں جو کوتاہی کرتا ہے اس کی ایک وجہ اس کا بخل بھی ہے، اس کی طبیعت میں جو بخل ہے اس کی وجہ سے وہ باوجود پیسہ ہونے کے ان کا حق ادا نہیں کرتا ہے، اور ان کا نفقہ نہیں دیتا ہے، نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرما کر بتلا دیا کہ بھائی! تم یوں سمجھتے ہو کہ ان پر خرچ کریں گے تو پیسہ گھٹ جائے گا اور کم ہو جائے گا، اتنا بیلنس کم ہو جائے گا، اتنے روپے جیب سے نکل جائیں گے؟ ایسی بات نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ

کی طرف سے فرشتے مقرر ہیں، ایک فرشتہ تو یوں دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! جو خرچ کرنے والا ہے اس کو بدلہ عطا فرما یعنی اس نے جو خرچ کیا ہے اس کی جگہ پر دوسرے اتنے ہی مل جائیں۔ آپ جو سمجھتے تھے کہ پیسہ کم ہو گیا اور گھٹ گیا، وہ گھٹنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی نے فرشتوں کو دعا کے واسطے مقرر کیا ہے۔ ایک تو دعا فرشتے کی ہو اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے کر رہا ہو؛ تو وہ دعا تو ضرور قبول ہو گی۔ معلوم ہوا کہ آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ خرچ کریں گے تو کم ہو جائے گا، ایسا نہیں ہے۔ جہاں خرچ کرنے کے لئے کہا گیا ہے وہاں آپ خوب خرچ کرو، ذرا بھی کم نہیں ہو گا، بدلہ ضرور ملے گا، اس کی جگہ پر دوسرا آ جائے گا۔

روپیہ بچانے والا خوش فہمی میں ہے حالانکہ......

اور جو یوں سمجھتا ہے کہ خرچ کریں گے تو کم ہو جائے گا اور خرچ نہیں کریں گے تو جمع رہے گا تو اس کا حال بھی آگے آ گیا ہے کہ دوسرا فرشتہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! جو بخل کرنے والا ہے، جہاں خرچ کرنے کے لئے کہا گیا ہے وہاں خرچ نہیں کرتا ہے، اس کے مال کو برباد کر۔ اب وہ یوں سمجھتا ہے کہ بیوی کے کپڑے لانے ضروری تھے، لیکن نہیں لایا اور اس طرح مَیں نے اتنے پیسے بچا لئے۔ ایک ٹائم کھانا نہیں دیا، بال بچوں کو بھوکا رکھا، تو مَیں نے دو سو روپے کی بچت کر لی، اس طرح کر کے وہ خوش فہمی میں ہے، اور یہاں فرشتہ اس کے لئے بد دعا کر رہا ہے کہ یہ جو کچھ بچت ہوئی ہے وہ برباد ہو جائے۔

اس لئے جو آدمی نبی کریم ﷺ پر ایمان رکھتا ہے، آپ ﷺ کے ارشادات کو حق و یقین سمجھتا ہے، اِس حدیث کو سننے کے بعد وہ کا ہے کو اپنے بیوی بچوں کے خرچ میں بخل کرے گا، اور کیوں خرچ نہیں کرے گا، بلکہ ضرور کرے گا۔ اس لئے کہ اس کو یقین ہے کہ اگر خرچ

نہیں کروں گا تو سب برباد ہو جائے گا اور اگر خرچ کروں گا تو ان کی ضرورتیں بھی پوری ہوں گی اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم بھی پورا ہوگا اور اس کی جگہ پر دوسرا مال تو آہی جائے گا۔

کھڑکی کھولیے

جیسے آپ کا برتن بھرا ہوا ہے، تو اس بھرے ہوئے میں سے کچھ نکالو گے تب ہی تو دوسرا اس میں آئے گا، اگر برتن میں آنے کی جگہ ہوگی تب ہی تو آ سکتا ہے۔ جیسے اِدھر سے ہَوَا اسی وقت داخل ہوگی جب کہ اُدھر کی کھڑکی کھول دو گے، اور ہوا کے نکلنے کا راستہ پیدا کرو گے، اِدھر سے نکلے گی تو اُدھر سے آئے گی، اِدھر کی کھڑکی بند کر رکھی ہے تو جب ہوا کو آپ جانے نہیں دیں گے تو دوسری ہوا کیسے آئے گی۔ اس لئے قاعدہ یہی ہے کہ خرچ کرو گے تو دوسرا آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہی قاعدہ بتلایا ہے۔

اوپر والا ہاتھ اور نیچے والا ہاتھ

۲۹۶. وعنه عن النبی ﷺ قال: اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلىٰ، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ، وَ خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنىً، وَمَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللهُ، وَمَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللهُ.

(رواه البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے اچھا ہے۔ اور جب آپ خرچ کرنے لگیں تو جن کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے وہاں سے شروعات کرو اور بہترین صدقہ وہ ہے جو غنیٰ کے ساتھ ہو۔ اور جو آدمی اپنے آپ کو عفیف بنائے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو سوال سے محفوظ رکھیں گے۔ اور جو اپنے آپ کو مستغنی رکھے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو مستغنی بنا دے گا۔

افادات:۔ ''اوپر والا ہاتھ اور نیچے والا ہاتھ'' کے کئی مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ اوپر والا یعنی خرچ کرنے والا، اور نیچے والا یعنی روکنے والا اور بخل کرنے والا۔ اور ایک

مطلب یہ ہے کہ اوپر والا یعنی دینے والا اور نیچے والا یعنی مانگ کر لینے والا، اگر بغیر مانگے کچھ مل جائے اور لے، وہ اس میں داخل نہیں ہے۔ اور ایک مطلب یہ ہے کہ اوپر والا یعنی سوال سے اپنے آپ کو بچانے والا۔ اور نیچے والا یعنی سوال کرنے والا۔ یہ تینوں مطلب بتلائے گئے ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ آدمی کسی سے سوال نہ کرے اور خرچ کرنے (دینے) کا اہتمام کرے، اور بخل سے کام نہ لے بلکہ خرچ کرتا رہے۔

ایسی سخاوت مطلوب نہیں ہے

﴿وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ﴾ دوسری بات نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمائی کہ جب آپ خرچ کرنے لگیں تو جن کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے، جن کا خرچہ آپ پر واجب ہے، وہاں سے شروعات کرو۔ آپ جب خرچ کرنے بیٹھیں گے اور خرچ کرنا شروع کریں گے، تو ابتداء اپنے گھر سے ہونا چاہیے، پہلے گھر والوں پر اس کے بعد دوسروں پر خرچ کرو، اس لئے کہ ان کا نفقہ اور ذمہ داری آپ پر واجب ہے، ورنہ گجراتی میں کہاوت ہے:-

(Dth ltt Atufht Dtkxe attxu , WvttDgttgt ltu ytxtu)

یعنی گھر میں بھوکے ہیں اور دوسروں پر سخاوت ہو رہی ہے، ایسی سخاوت شریعت میں مطلوب اور پسندیدہ نہیں ہے۔ ایسی بھی کیا سخاوت؛ کہ اس سخاوت سے اپنے گھر والے ہی محروم رہیں، اس کو کوئی سخی کہے گا؟ کسی بھی آدمی میں اگر کوئی خوبی ہے تو اس کی اس خوبی کا نمبر اول پر فائدہ گھر کے لوگوں کو پہنچنا چاہیے، تب تو بات ہے، ورنہ پھر وہ خوبی ہی کیا ہوئی؟

بہر حال! حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ﴾ جس کے خرچہ کی ذمہ داری آپ پر ہے، خرچ کرنے میں انہی سے شروعات کرو۔

بہترین صدقہ

﴿وَخَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى﴾ بہترین صدقہ وہ ہے جو غنیٰ کے ساتھ ہو۔ ''غنیٰ کے ساتھ ہو'' کا کیا مطلب ہے؟ بعض حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ کسی محتاج اور ضرورت مند کو اگر دو تو اتنا دو کہ اس کی ضرورت پوری ہو جائے اور اپنی اس ضرورت کی طرف سے وہ مستغنی ہو جائے۔ مثلاً ایک آدمی بھوکا ہے، آپ اس کو کھانا دے رہے ہیں، تو ایسا نہ کرو کہ روٹی کا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا، بلکہ کم سے کم اتنا تو دو کہ اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔ ایک آدمی ننگا ہے اس کو آپ کپڑا دے رہے ہیں، تو کم سے کم اتنا کپڑا تو دیجئے کہ اس کا ستر ڈھک جائے، اگر کپڑے کا تھان نہ دو؛ تو کم سے کم ایک جوڑا تو دے دیجئے۔ مطلب یہ ہے کہ جس ضرورت کے لئے آپ صدقہ کر رہے ہیں تو اتنا دیجئے کہ اس کی اس ضرورت کے سلسلہ میں وہ آدمی کسی اور کا محتاج نہ رہے۔

اور بعض حضرات یوں کہتے ہیں آپ جب صدقہ کریں تو اس طرح کیجئے کہ آپ کے پاس اتنا رہ جائے کہ پھر بعد میں آپ خود محتاج نہ ہو جائیں یعنی سخاوت کا ایسا جوش نہ ہو کہ اپنے پاس جو کچھ تھا وہ سب دے ڈالا، جب اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضرورت پیش آئی تو دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں کہ مجھے دو۔ کسی نے پوچھا کہ بھائی! تیرے پاس تو تھا اس کا کیا کیا؟ تو کہتا ہے کہ مَیں نے سخاوت کر ڈالی۔ بھائی! ایسی سخاوت بھی کیا کہ اب تجھے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑے۔ اس لئے اپنی ضرورت اور اپنے گھر والے جن کی ذمہ داری ہے ان کی ضرورت کے مطابق رکھ کر پھر خرچ کرے اور صدقہ کرے؛ ایسا صدقہ بہترین صدقہ ہے۔ ہاں! اگر کوئی آدمی ایسا ہے کہ جس کے اوپر کسی کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، خود تنہا ہے اور بھوکا رہنے اور ضرورتوں کو برداشت کر

نے کی طاقت رکھتا ہے اور اس نے سب خرچ کرڈالا اور پھر کسی کے سامنے ہاتھ بھی نہیں پھیلاتا تو وہ الگ بات ہے۔لیکن اگر دوسروں کی ضروریات اس کے ذمہ لگی ہوئی ہے اور وہ صبر نہیں کر سکتے تو پھر بعد میں خواہ مخواہ ان کو صبر کی تلقین کرتے رہنا یہ بات ٹھیک نہیں ہے، بلکہ اپنے پاس اتنا رہنے دے کہ اپنی اور اپنے گھر والوں کی ضرورت پوری ہو،اسی کو ﴿عَنْ ظَهْرِ غِنىً﴾ کہا گیا ہے۔

بچنے پر بچایا جائے گا

﴿وَمَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللهُ﴾ اور جو آدمی اپنے آپ کو عفیف بنائے گا؛ تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو عفت عطا فرمائیں گے،اور سوال سے محفوظ رکھیں گے۔عفت کا معنیٰ پاکیزگی، یعنی جو آدمی اپنے آپ کو سوال سے بچائے گا اور سوال نہیں کرے گا۔مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی نیکی کا کام کرنے کے لئے خود اس آدمی کو بھی اس کام کا ارادہ اور ہمت کرنی پڑتی ہے، ایک مرتبہ اس نے ارادہ اور ہمت سے کام لیا تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دستگیری ہو جائے گی، جیسے کوئی بچہ جب چلنا سیکھتا ہے تو کھڑا ہوتا ہے اور پھر ایک قدم اٹھاتا ہے تو باپ خود آگے بڑھ کر اس کو پکڑ لیتا ہے اور چلا لیتا ہے،لیکن اگر وہ بچہ قدم ہی نہیں اٹھائے تو پھر کوئی اس کو نہیں چلائے گا۔اسی طرح یہاں پر بھی اصل تو اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی ہے،لیکن آدمی کی آزمائش ہے کہ وہ ارادہ کرے اور ہمت سے اس کام کو شروع کر دے۔تو جو آدمی عفیف بننا چاہے اور سوال سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو محفوظ رکھے گا۔

﴿وَمَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللهُ﴾ اور جو اپنے آپ کو مستغنی رکھے گا،کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے گا،تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو مستغنی بنا دے گا۔

اَلْاِنْفَاقُ مِمَّا يُحِبُّ وَمِنَ الْجَيِّدِ

محبوب اور عمدہ چیز کو
اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد:—

أعوذبالله من الشيطان الرجيم. بسم الله الرحمن الرحيم

لَنْ تَنالُوْاالْبِرَّحَتّٰى تُنفِقُوْامِمَّاتُحِبُّوْنَ.

يَآأَيُّهَاالَّذِيْنَ آمَنُوْاأَنْفِقُوْامِنْ طَيِّبَاتِ مَاكَسَبْتُمْ وَمِمَّاأَخْرَجْنَالَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلاتَيَمَّمُوْاالْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ.

محبوب اور عمدہ چیز اللہ کے راستہ میں دو

اس باب میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جو چیز خرچ کی جائے وہ ایسی ہونی چاہیے جو خرچ کرنے والے کو اپنی تمام چیزوں میں سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہو، اور وہ چیز عمدہ بھی ہو۔ دو چیزیں بتائی ہیں محبوب بھی ہو اور عمدہ بھی ہو۔ اس سلسلہ میں انہوں نے دو آیتیں اور ایک روایت پیش کی ہے۔

پہلی آیت ہے ﴿لَنْ تَنالُوْاالْبِرَّحَتّٰى تُنفِقُوْامِمَّاتُحِبُّوْنَ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم کامل نیکی نہیں پاسکتے یہاں تک کہ تم خرچ کرو اس مال میں سے جس کو تم پسند کرتے ہو یعنی جس مال سے تم کو سب سے زیادہ محبت ہو، اس کو جب تک خرچ نہیں کرو گے، تب تک کامل نیکی تمہیں حاصل نہیں ہوگی۔

سلام پھیرنے کا انتظار نہ کیا

حضراتِ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے یہاں اس کا بڑا اہتمام تھا کہ وہ اپنی محبوب

چیز اللہ کے راستہ میں خرچ کیا کرتے تھے۔ حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اوراس کے پاک رسول ﷺ کے ارشادات پر عمل کرنا انہیں حضرات کا کام تھا، یہی وہ لوگ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی کریم ﷺ کی صحبت اور آپ کی خدمت کے لئے چنا تھا اور وہ اس کا حق رکھتے تھے۔

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ تو روایت میں آرہا ہے، ان کے علاوہ اور بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات کتابوں میں لکھے ہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اور میرے علم میں آئی تو مَیں نے سوچا کہ میرے پاس جو مال ہے اس میں مجھے سب سے زیادہ محبوب کیا ہے؟ چنانچہ میری ایک باندی مرجانہ نامی تھی جو مجھے بڑی محبوب تھی مَیں نے اس کو اللہ کے واسطے آزاد کردیا۔ جب اللہ کے لئے آزاد کردیا تو مقصد تو حاصل ہوگیا، اب آزاد کرنے کے بعد اگر مَیں اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا تو کرسکتا تھا، شرعاً اس کی اجازت تھی اوراس میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں تھی، لیکن اس صورت میں یہ ہوتا کہ ایک چیز جس کو مَیں نے اللہ کے واسطے اپنی ملکیت سے نکال دی ہے، صورتاً اس کو دوبارہ اپنے پاس لانا پایا جاتا، اور یہ نوبت نہ آوے اس لئے مَیں نے اس باندی کا نکاح اپنے غلام نافع کے ساتھ کرادیا۔ (روح المعانی۔۳/۲۲۳)

انہی سے ایک اور واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ نماز کے اندر تلاوت کرتے ہوئے اسی آیت پر گذرے، تو اسی وقت نماز ہی کی حالت میں اپنی ایک محبوب باندی کو اشارہ سے آزاد کردیا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عمل

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے زمانۂ خلافت میں حضرت

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ جلولہ کی باندیوں میں سے کوئی اچھی باندی خرید کر میرے لئے بھیجو، چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ایک بہت ہی حسین اور قیمتی باندی خرید کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لئے بھیجی۔ جب وہ آپ کے پاس پہنچی تو آپ نے اس کو اپنے قریب بلایا اور یہ آیت پڑھی ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ اور اس کو آزاد کر دیا۔ (الدر المنثور)

محمد بن منکدر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا ایک گھوڑا لے کر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول میرے مال میں مجھے یہ گھوڑا سب سے زیادہ پسند ہے اور چونکہ باری تعالیٰ یہ فرماتے ہیں ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ اس لئے مَیں یہ گھوڑا اللہ کے لئے صدقہ کرتا ہوں آپ اس کو قبول فرمالیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ لے لیا اس کے بعد آپ نے وہ گھوڑا ان کے صاحبزادے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو دیدیا، یہ دیکھ کر ان کے چہرے پر کچھ تغیر سا آیا، شاید ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ بھی عجیب معاملہ ہوا کہ باپ کے پاس سے نکل کر بیٹے کے پاس گیا، گھر کا گھر میں ہی رہا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چہرے کے یہ آثار دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارا صدقہ قبول کر لیا، اب مجھے اختیار ہے، مَیں چاہوں تو تمہارے بیٹے کو دوں یا کسی اور کو دوں، تمہیں اس کی وجہ سے گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے (روح المعانی ۳/۲۲۳)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ کثرت سے شکر خرید کر صدقہ کرتے تھے اور لوگوں کو کھلاتے تھے، ایک مرتبہ ان کے غلام نے کہا کہ آپ شکر کے بجائے کھانا خرید کر دیا کریں تو زیادہ فائدہ ہوگا، انہوں نے فرمایا کہ تیری بات تو صحیح ہے، لیکن قرآن میں باری تعالیٰ یہ فرماتے ہیں ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ اور مجھے شکر بہت پسند

ہے اس لئے مَیں شکر خرید کر صدقہ کرتا ہوں، تا کہ مجھے کامل نیکی ملے۔ دیکھئے! اللہ تعالیٰ کے ارشاد پر عمل کا کیسا جذبہ ان حضرات کے اندر موجود تھا۔ (روح المعانی۔۳/۲۲۳)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا واقعہ

قبیلۂ بنو سُلیم کا ایک آدمی کہتا ہے کہ مَیں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مقام ''ربذہ'' میں حاضر ہوا۔ ''ربذہ'' ایک دیہاتی علاقہ تھا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے وہیں منتقل ہو گئے تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سلسلہ میں ہدایت بھی فرمائی تھی۔ تو وہ آدمی کہتا ہے کہ جس زمانہ میں وہ وہاں رہتے تھے مَیں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ ایک آدمی جو اونٹوں کو سنبھال رہا ہے وہ معمر ہو چکا ہے اور ذرا کمزور بھی ہے، اور میرا جی چاہتا تھا کہ مَیں حضرت کی خدمت میں رہوں، اس لئے مَیں نے درخواست کی کہ حضرت! آپ مجھے اپنی خدمت میں رہنے کی اجازت دیجئے، آپ کے اونٹوں کو جو آدمی سنبھال رہا ہے، مَیں اس کی مدد بھی کروں گا اور آپ سے استفادہ بھی کروں گا، اس پر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بھائی! میرا دوست تو وہی ہے جو میری بات مانے، اگر تم میری اطاعت کرنے کے لئے تیار ہو، تب تو مَیں تم کو میرے پاس رہنے کی اجازت دیتا ہوں، ورنہ چلے جاؤ۔ اس نے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میری خواہش یہ ہے کہ جب مَیں کسی کو دینے کے لئے کوئی چیز مانگوں تو میرے مال میں جو سب سے بہتر ہو وہ لا کر مجھے دے۔ وہ آدمی کہتا ہے کہ مَیں نے یہ شرط قبول کر لی اور اس ہدایت پر برابر عمل کرتا رہا ایک مرتبہ ان کو معلوم ہوا کہ فلاں چشمہ کے پاس جو لوگ آباد ہیں وہ کھانے پینے کی تکلیف میں مبتلا ہیں، تو حضرت نے مجھ سے کہا کہ میرے اونٹوں میں سے ایک اونٹ

لے آؤ۔ مَیں گیا اور دیکھا کہ ان اونٹوں میں ایک نر اونٹ سب سے عمدہ ہے اور وہ بڑا سدھایا ہوا اور بہت قیمتی بھی ہے، اور دوسرا نر اونٹ ان کے مال میں تھا بھی نہیں، اس لئے مَیں نے یوں سوچا کہ اگر یہ دیدیا جائے گا تو جفتی وغیرہ کے لئے نر اونٹ کی جو ضرورت رہتی ہے وہ بھی نہیں ہوگی، اس لئے مَیں نے اس کو چھوڑ دیا اور دوسرے نمبر پر ایک اونٹنی جو بہت بڑھیا تھی لیکن اس سے کم درجہ کی تھی وہ لا کر خدمت میں پیش کی۔ ان کی نظر جب اس اونٹ پر پڑی تو مجھ سے فرمانے لگے کہ تو نے میرے ساتھ خیانت کی ہے، مَیں فوراً گیا اور اس اونٹنی کو رکھ کر اس بڑھیا اونٹ کو لے کر آیا تو انہوں نے اعلان کیا کہ کون دو آدمی ایسے ہیں جو میرے کہنے کے مطابق نیکی کے کام میں شریک ہوں؟ دو آدمی آگے بڑھے، ان سے کہا کہ جلدی سے اس اونٹ کو ذبح کرو، اور پانی کے اس چشمہ کے پاس جتنے گھرانے رہتے ہیں، اس کے اتنے حصے کرو اور میرے گھر کا بھی اتنا ہی برابر کا ایک حصہ لگا لینا اور ان میں جا کر تقسیم کردو۔ چنانچہ ان کی ہدایت کے مطابق اس کو ذبح کیا اور تقسیم کیا پھر انہوں نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ اگر میری بات بھول گئے تھے تب تو تم معذور ہو، اور اگر جان بوجھ کر ایسا کیا تو کیوں؟ مَیں نے کہا کہ مَیں بھولا نہیں تھا بلکہ آپ کی بات تو یاد تھی لیکن آپ کی ضرورت کے پیشِ نظر مَیں نے ایسا کیا تھا۔ تو فرمایا کہ واقعی میری ضرورت کے لئے تم نے ایسا کیا تھا؟ مَیں نے کہا کہ ہاں۔ تو فرمانے لگے کہ میری حقیقی ضرورت تو یہ ہے کہ جب مَیں اکیلا قبر کے گھڑے میں ڈال دیا جاؤں گا اس وقت کی میری محتاجی سے بڑھ کر اور کوئی محتاجی نہیں ہوگی، اگر تم میری ضرورت کا خیال کرتے تو وہی اونٹ لاتے جس کی مَیں نے پہلے سے ہدایت کر رکھی تھی۔ (الدر المنثور)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی زریں نصیحت

پھر کہنے لگے کہ دیکھو! تمہارے مال میں تین پارٹنراور شریک ہیں۔ایک شریک تو مقدر ہے۔تقدیراً آدمی کے مال میں سے اپنا حصہ نکال ہی لیتی ہے۔ بہت سی مرتبہ ہم پیسے رکھ کرسوچتے ہیں کہ فلاں کام میں آئیں گے، لیکن ہوا یہ کہ وہ کوئی چور لے گیا۔ یا مثلاً کوئی چیز کچھ سوچ کرر کھی تھی لیکن سیلاب آیا اور وہ چیز بہہ گئی۔ مطلب یہ ہے کہ تقدیر کی وجہ سے وہ چیزیں آدمی کے ہاتھ سے نکل جاتی ہیں۔ تو ایک شریک تو مقدر ہے کہ بہت سی مرتبہ کوئی چیز اپنی کسی ضرورت کی سمجھ کرتم رکھتے ہو، اور تقدیراً کرکسی بھی بہانے سے اس چیز کوتمہارے ہاتھ سے لے جاتی ہے، مثلاً چوری ہوگیا، سیلاب میں بہہ گیا، آگ لگنے کی وجہ سے جل گیا، یا اور کوئی بھی شکل ہو جاتی ہے۔

دوسرا شریک تمہارا وارث ہے جو اس انتظار میں رہتا ہے کہ کب یہ مرے، قبر میں جاوے اور وہ مال میرے ہاتھ میں آوے۔ اور تیسرے شریک تم خود ہو۔ یہ کل تین شریک ہوئے لہٰذا تم ان تینوں میں سب سے کم حصہ لینے والے مت بنیو، بلکہ جب بھی دل میں آوے، فوراً اس کوخرچ کر کے اپنے لئے آخرت میں جمع کرادیجیو، اگر رہنے دوگے تو وہ تمہارے ہاتھ میں رہنے والا نہیں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک پرندے کا گوشت پیش کیا گیا، آپ کو پسند نہیں تھا اس لئے آپ نے اس کوتناول نہیں فرمایا اور کسی دوسرے کو منع بھی نہیں فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! یہ گوشت میں فقیروں کو دیدوں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو چیز تم اپنے لئے پسند نہیں کرتی اس کو دینے کی بات کیوں کرتی ہو؟ (تفسیر ابن کثیر۔۱/۳۲۱) بہرحال! حضراتِ صحابہ کے

یہاں اس کا بڑا اہتمام تھا ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ تم حقیقی طور پر کامل نیکی نہیں پا سکتے جب تک کہ تم تمہاری محبوب چیز کو اللہ کے راستہ میں خرچ نہ کرو۔

آگے کیا بھیجا اور پیچھے کیا چھوڑا؟

اور حقیقت یہی ہے کہ جو خرچ کریں گے وہ ہمارے لئے جمع ہوگا، اگر یہاں رکھا رہے گا تو وہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ حدیثِ پاک میں ہے کہ جب آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو فرشتے پوچھتے ہیں ﴿مَا قَدَّمَ؟﴾ اس نے آگے کیا بھیجا؟ اور لوگ پوچھتے ہیں ﴿مَا أَخَّرَ؟﴾ کیا چھوڑ کر جا رہا ہے؟ (شعب الایمان۔۱۰۴۷۵)

دوسرے کے مال کی نگرانی

نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے پوچھا کہ کوئی ایسا ہے جس کو دوسرے کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟ جواب میں صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ایسا تو کون ہوگا جس کو دوسروں کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو، ہر ایک کو اپنا ہی مال محبوب ہوتا ہے۔ تو حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اپنا مال تو وہی ہے جو تم نے کھایا پیا، یا پھر اللہ کے راستہ میں خرچ کر کے جمع کرا دیا، باقی جو کچھ چھوڑ کر جاؤ گے؛ وہ سب دوسروں یعنی وارثوں کا ہے۔

ایک حماقت

اس حقیقت کو آدمی سمجھتا نہیں ہے۔ جو مال خود کمایا، خود اس کا مالک ہے، خود اس میں تصرف کر سکتا ہے؛ تب بھی خرچ نہیں کرتا ہے اور سوچتا یہ ہے کہ میرے مرنے کے بعد میرے بچے میرے لئے دیں گے۔ ارے اللہ کے بندے! تو نے خود کمایا، تو اس کا

مالک تھااور اپنی مرضی سے اس میں جو چاہتا وہ تصرف کرسکتا تھا؛ لیکن تو نے خود تو خرچ کیا نہیں اور اب یہ امید رکھتا ہے کہ تیرے مرنے کے بعد تیری اولاد اس مال میں سے تیرے لئے خرچ کرے گی؟ یہ محال بات ہے۔ کون اولاد ایسا کرتی ہے؟ کوئی نہیں کرتی۔

اصل بے وقوف تو یہ خود تھا

کسی کے باپ کا انتقال ہو جائے، اور وہ کروڑوں کی جائیداد چھوڑ کر جائے، تو اگر اس کی اولاد مل سمجھ کر خرچ کرنے کا فیصلہ کرے گی تو بہت سے بہت تو ایک دو فیصد اس کے لئے خرچ کرے گی، اور وہ بھی ایسا سمجھیں گے کہ باپ پر بڑا احسان کیا ہے، حالانکہ سارا مال وہی کما کر چھوڑ کر گیا تھا۔ اور مَیں تو یہ کہتا ہوں کہ اس میں اولاد کا کوئی قصور بھی نہیں ہے، اصل بے وقوف تو یہ خود تھا کہ اپنی چیز تھی، خود خرچ کرسکتا تھا، لیکن جب خود اس نے اپنے لئے خرچ نہیں کی؛ تو اب اولاد اس کے لئے کیا خرچ کرے گی؟

اللہ تعالیٰ طَیِّب چیز ہی کو قبول فرماتے ہیں

بہرحال! باب کا عنوان قائم کیا تھا اس میں ایک بات تو یہ بتلائی تھی کہ اللہ کے راستہ میں خرچ کی جانے والی چیز محبوب ہونی چاہیے۔ اور دوسری بات یہ بتلائی تھی ﴿وَمِنَ الْجَيِّدِ﴾ وہ چیز عمدہ بھی ہونی چاہیے، اس سلسلہ میں قرآنِ پاک کی دوسری آیت پیش کی ہے ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ﴾ اے ایمان والو! تم نے جو کمایا اور حاصل کیا ہے اس میں جو چیز عمدہ ہے اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرو۔ لفظ ''طَیِّب'' قرآن وحدیث کی اصطلاح میں دونوں مفہوم میں بولا جاتا ہے، حلال کے لئے بھی لفظ ''طَیِّب'' استعمال کیا جاتا ہے، اور جو چیز عمدہ ہو اس کے لئے بھی اس کا

اطلاق ہوتا ہے، اور یہاں دونوں ہی مراد ہیں۔ ظاہری طور پر بھی وہ چیز عمدہ ہونی چاہیے اور معنوی اعتبار سے وہ چیز حلال بھی ہونی چاہیے۔ ایک چیز دیکھنے میں تو بہت اچھی ہے لیکن وہ حرام طریقہ سے حاصل کی گئی ہے تو وہ اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کی جاسکتی، حدیثِ پاک میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ﴿اِنَّ اللہَ طَیِّبٌ، لایَقْبَلُ اِلَّا الطَّیِّبَ﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے اور وہ پاک اور طیب چیز ہی کو قبول فرماتے ہیں۔ اگر حرام چیز اللہ کے راستہ میں دی جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قابلِ قبول نہیں ہے۔ اور اس آیت کا شانِ نزول بھی یہی بتلاتا ہے کہ یہاں طیب سے مراد عمدہ چیز ہے بعض لوگ گھٹیا قسم کی چیز صدقہ کے طور پر دیا کرتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿وَمِمَّا أَخْرَجْنَالَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ﴾ اور تمہاری زمین میں سے نکال کر ہم نے جو دیا اس میں سے بھی جو عمدہ ہو وہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرو ﴿وَلاتَیَمَّمُوْاالْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ﴾ اور دیکھو! ردی اور گھٹیا مال کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا ارادہ مت کرنا۔ صاحبِ کتاب نے تو اتنی ہی آیت پیش کی ہے لیکن اسی آیت میں آگے جملہ ہے ﴿وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ﴾ تمہارا اپنا حال یہ ہے کہ ایسی گھٹیا چیز اگر کوئی آدمی تم کو دینا چاہے تو تم اس کو قبول نہیں کروگے، اِلَّا یہ کہ چشم پوشی اور درگذر سے کام لو۔

ہمارا مزاج

ہمارا مزاج یہ بنا ہوا ہے کہ جب اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی بات آتی ہے تو گھٹیا چیز ہی دیا کرتے ہیں جیسے نیا کپڑا آیا تو کہتے ہیں کہ پرانا جوڑا کسی مسکین کو اللہ واسطے دیدو۔ کھانا کھاچکے اور کچھ بچ گیا تو کہتے ہیں کہ اللہ کے واسطے کسی فقیر کو دیدو۔ یہاں تک کہ زندگی کا بھی گھٹیا حصہ ہی ہم دیتے ہیں، جوانی میں جب اللہ تعالیٰ نے

ساری صلاحیتیں دے رکھی تھیں اورقویٰ اعلیٰ درجے کے ملے ہوئے تھے تو اس زمانہ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت اوراس کی یاد میں استعمال نہیں کیا، اس وقت تو بس عیش و عشرت اور دنیا سے فائدہ اٹھانے میں لگے رہے اور جب بوڑھاپا آیا اور کسی کام کے نہ رہے، نہ منھ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت، گھر میں سے بھی بہوؤں نے نکال دیا کہ بڈھا خالی جھک جھک کرتا رہتا ہے، جا! مسجد میں جا کر بیٹھ؛ تو مسجد کا ایک کونہ پکڑ کر کہتا ہے کہ اب اللہ اللہ کرو، یعنی زندگی کا یہ وہ زمانہ ہے کہ جس میں کسی کام کا نہیں رہا تو اب اللہ کی یاد کے لئے فارغ ہوگیا۔ خیر! اگر کسی کو اللہ تعالیٰ یہ بھی توفیق دیدیں تو بڑی سعادت کی بات ہے، باقی یہ بات ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں زیادہ پسندیدہ زمانہ تو جوانی ہی کا ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ ایسی چیز کو بھی قبول کر لیتے ہیں، باری تعالیٰ خود ہماری حالت بیان فرماتے ہیں ﴿وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ أَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ﴾ اگر تمہارے لئے کوئی ایسی چیز پیش کرتا تو تم اپنے لئے اس کو قبول نہ کرتے۔ سوچو کہ اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے۔ یہ تو اس صورت میں ہے کہ کسی کے پاس عمدہ چیز ہو اور وہ ردی چیز پیش کرے، لیکن اگر کسی کے پاس بڑھیا چیز ہے ہی نہیں، جو بھی ہے وہ کم درجہ ہی کی ہے اور وہ اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرے گا، تو اس پر بھی اللہ تعالیٰ اس کو ثواب مرحمت فرمائے گا۔

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا باغ

حضرت انس رضی اللہ عنہ جو اس روایت کے راوی ہیں وہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے سوتیلے والد ہیں، ان کے والد کے انتقال کے بعد ان کی والدہ حضرت ام سُلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح انہی حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا تھا۔

۲۹۷. عن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ أَبُوطَلْحَةَ رضی اللہ عنہ أَكْثَرَ الْأَنْصَارِ بِالْمَدِيْنَةِ مَالاً مِّنْ نَخْلٍ، وَكَانَ أَحَبُّ أَمْوَالِهِ إِلَيْهِ بَيْرَحَآءَ، وَكَانَتْ مُسْتَقْبِلَةَ الْمَسْجِدِ، وَكَانَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَدْخُلُهَا وَيَشْرَبُ مِن مَّآءٍ فِيْهَا طَيِّبٍ. قَالَ أنسٌ: فَلَمَّا نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ ﴿لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ قَامَ أَبُوطَلْحَةَ إِلٰى رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللهِ! إِنَّ اللهَ تَعَالٰى أَنْزَلَ عَلَيْكَ ﴿لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ وَإِنَّ أَحَبَّ مَالِيْ إِلَيَّ بَيْرَحَآءُ، وَإِنَّهَا صَدَقَةٌ لِلّٰهِ تَعَالٰى أَرْجُوْا بِرَّهَا وَذُخْرَهَا عِنْدَ اللهِ تَعَالٰى، فَضَعْهَا يَارَسُوْلَ اللهِ حَيْثُ أَرَاكَ اللهُ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم: بَخٍ! ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ، ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ. وَقَدْ سَمِعْتُ مَاقُلْتَ. وَإِنِّيْ أَرٰى أَنْ تَجْعَلَهَا فِي الْأَقْرَبِيْنَ. فَقَالَ أَبُوطَلْحَةَ: أَفْعَلُ يَارَسُوْلَ اللهِ. فَقَسَّمَهَا أَبُوطَلْحَةَ فِيْ أَقَارِبِهِ، وَبَنِيْ عَمِّهِ. (متفق علیه)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انصار میں سب سے زیادہ کھجور کے باغات کے مالک حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ تھے، اوران کو اپنے کھجوروں کے باغات میں سب سے زیادہ محبوب باغ ''بیرحاء'' تھا، اور وہ بالکل مسجدِ نبوی کے سامنے تھا، اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف بھی لے جاتے تھے اور اس میں میٹھا پانی نوش فرماتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ پاک میں جب یہ آیت نازل ہوئی کہ تم کامل نیکی نہیں پاسکتے جب تک کہ اپنی محبوب چیز کو خرچ نہ کرو، تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اُٹھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! باری تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں آپ پر یہ آیت نازل فرمائی، اور میرے اموال میں مجھے سب سے زیادہ محبوب ''بیرحاء'' ہے۔ لہٰذا یہ باغ میری طرف سے اللہ کے راستہ میں صدقہ ہے، میں اس پر اللہ تعالیٰ سے نیکی اور ثواب کی اُمید رکھتا ہوں، اس لئے اس کو آپ جہاں چاہیں صَرف کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: واہ واہ! یہ تو بڑا عمدہ اور نفع بخش مال ہے، یہ تو بڑا عمدہ اور نفع بخش مال ہے، اور تم نے جو بات کہی وہ مَیں نے سن لی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَیں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ تمہارے رشتہ داروں میں جو غریب محتاج ہیں، آپ ان کو دیدیجئے۔ چنانچہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو سن کر عرض کیا کہ اے اللہ کے

رسول! مَیں اسی طرح کروں گا۔ اس کے بعد حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اس باغ کو اپنے چچازاد بھائیوں کے درمیان تقسیم کردیا۔

افادات:- ''بیرحاء'' نامی باغ بالکل مسجدِ نبوی کے سامنے تھا، اب تو مسجدِ نبوی کا جو نیا اضافہ ہوا ہے اس میں باغ والی جگہ بھی مسجد کے اندر آچکی ہے، مسجدِ نبوی کے سامنے کی طرف جو دروازے نکلتے ہیں وہاں یہ باغ تھا، پہلے وہاں ظاہری علامت زیادہ واضح تھی، لیکن جب لوگ اس طرف جانے لگے تو چونکہ حکومت کو ایسی چیزوں سے چڑ ہے، اس لئے اس علامت کو بھی چھپادیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں وہ باغ مسجدِ نبوی سے ذراسی دوری پر بالکل سامنے کی طرف تھا۔

اپنا مال بڑوں سے خرچ کروائے

بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے یہ بھی عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! یہ باغ چونکہ ایک بڑی چیز ہے، میرا تو جی یہ چاہتا تھا کہ کسی کو یہ پتہ بھی نہ چلے کہ یہ باغ مَیں نے اللہ کے راستہ میں صدقہ کیا ہے، لیکن یہ چیز چھپنے والی نہیں ہے اس لئے مَیں آپ کے سامنے ظاہر کررہا ہوں۔ یہ درخواست کرکے انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! اب اس باغ کو آپ جہاں چاہیں صَرف کریں اور استعمال فرمائیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی کوئی عمدہ چیز خرچ کرنا چاہتا ہو تو اپنے بڑوں کے ذریعہ سے خرچ کروائے، وہ چیز ان کے حوالہ کرے کہ آپ اس کو جہاں مناسب سمجھیں دیں۔ دیکھو! یہاں حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا۔ تو جو بڑے ایسے ہوں کہ ان کے فیصلوں اور معاملات پر زیادہ اطمینان ہو، تو ایسی چیزوں میں یا تو ان سے مشورہ لے کر خرچ کرے، یا ان کے ہی حوالہ کردیا جائے، تاکہ وہ جہاں چاہیں صَرف کریں۔

یہاں ''رَابِحٌ'' آیا ہے۔ ''رَابِحٌ'' ''رِبْحٌ'' سے مشتق ہے جس کا معنیٰ ہے نفع بخش ہونا یہ بڑا نفع بخش مال ہے، یعنی دنیا کے اعتبار سے بڑا قیمتی مال ہے اور آخرت کے اعتبار سے بھی بہت زیادہ ثواب دلوانے والا ہے۔ اور بعض روایتوں میں ''رَائِــحٌ'' آیا ہے۔ ''رَاحَ یَــرُوْحُ'' کا معنیٰ ختم ہونے والا یعنی اگر تم اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ نہ بھی کرتے تب بھی یہ آپ کی ملکیت سے کسی نہ کسی وقت نکلنے والا تھا، یا تو زندگی ہی میں نکل جائے، یا جب مریں گے تو اس کو چھوڑ کر جائیں گے۔

زہے عزو شرف

حضور ﷺ نے فرمایا: واہ واہ! یہ تو بڑا اعمدہ نفع بخش مال ہے، یہ تو بڑا نفع بخش مال ہے۔ اور تم نے جو بات کہی وہ مَیں نے سن لی۔ پھر حضور ﷺ نے بجائے اس کے کہ خود لے کر اس کو صَرف فرماتے، ان کو یہ مشورہ دیدیا کہ مَیں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ تمہارے رشتہ داروں میں جو غریب محتاج ہیں، آپ ان کو دیدیجئے، اس لئے کہ ویسے بھی یہ صدقہ ہے، اور صدقہ رشتہ داروں میں جو محتاج ہوں ان کو دینا دوسروں کے مقابلہ میں افضل ہے کہ اس میں صدقہ کا بھی ثواب ملے گا اور صلہ رحمی کا بھی ثواب ملے گا۔ چنانچہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے اس ارشاد کو سن کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مَیں اسی طرح کروں گا یعنی آپ نے جو ہدایت دی ہے اس کے مطابق اپنے رشتہ داروں میں خرچ کروں گا۔ چنانچہ حضرت ابوطلحہؓ نے اس باغ کو اپنے چچازاد بھائیوں (حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ) کے درمیان تقسیم کردیا۔ یہ دونوں حقیقی چچا کی اولاد میں سے نہیں تھے بلکہ خاندانی رشتہ کے چچازاد بھائی ہوتے تھے۔

وُجُوبُ أَمْرِهٖ أَهْلَهٗ وَأَوْلَادَهٗ الْمُمَيِّزِيْنَ

تعلیم وتربیتِ اولاد

مجلس (۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً أمابعد.

فأعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم. بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

وَأْمُرْ أَھْلَکَ بِالصَّلٰوۃِوَاصْطَبِرْعَلَیْھَا. (سورۂ طٰہٰ: ۱۳۲)

یَاأَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْاقُوْاأَنْفُسَکُمْ وَأَھْلِیْکُمْ نَاراً. (سورۂ تحریم: ٦)

ترجمۃ الباب

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا عنوان قائم کیا ہے جس کا حاصل ہے آدمی کا (ایک تو اتنی چھوٹی اولاد جس کو ابھی کچھ سوجھ بوجھ نہیں آئی ہے وہ یہاں مراد نہیں ہے) اپنے گھر والوں کو اور اپنی اس اولاد کو جو سنِ تمیز کو پہنچ چکی ہے اور ان تمام لوگوں کو جو اس کی ماتحتی میں ہیں؛ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا حکم دینا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی سے روکنا، اور شریعت میں جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے، ان کے ارتکاب سے روکنا اور ان کے کرنے پر ان کو تنبیہ کرنا اور سزا دینا۔ تادیب کا مطلب ہے ٹوکنا۔

اس عنوان کے تحت تین چیزیں لائے۔ ایک تو یہ ہے کہ آدمی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو اور اپنی اولاد کو اور وہ تمام لوگ جو اس کی ماتحتی میں ہیں ایسے تمام لوگوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی فرمانبرداری کا حکم دے۔ چنانچہ اس کے متعلق لکھا ہے کہ گھر میں جو نوکر چاکر ایسے ہیں جن کے اوپر اس کی نگرانی ہے، یا اگر وہ کسی فیکٹری کا مالک

ہے تو اس کی ماتحتی میں کام کرنے والے لوگ ہیں۔ استاذ کی ماتحتی میں شاگرد ہیں۔ مرشد کی ماتحتی میں مرید ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جو اس کی ماتحتی میں رہتے ہیں اور جن پر اس کا حکم چلتا ہے؛ ایسے تمام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا حکم دے یعنی ان کو آمادہ کرے، ان سے کہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کریں، اللہ کے احکام کو بجالائیں۔ اور ایسے تمام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی اور اللہ کے احکام کی مخالفت کرنے سے اور گناہوں سے روکے۔ اور اگر کوئی گناہ کرلے تو اس پر اس کو ٹوکے۔

یہ تین چیزیں ہیں (۱) ایک تو گھر کے تمام لوگ اور ان میں بھی خاص طور پر بیوی اور وہ اولاد جو سن تمیز کو پہنچ چکی ہے، جس میں کچھ سوجھ بوجھ آگئی ہے، جو آپ کی باتوں کو سمجھ لیتے ہیں اگر آپ اس سے کہیں کہ بیٹا! ایسا مت کرو، تو وہ سمجھتا ہے کہ مجھے منع کیا جارہا ہے۔ یا آپ اس سے کہیں کہ ایسا کرو تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے یہ کام کرنے کے لئے کہا جارہا ہے۔ ایسے تمام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا حکم دینا ہمارا فریضہ ہے۔ لیکن جو اولاد ابھی سنِ تمیز کو نہیں پہنچی ہے، جیسے ایک دو سال کا بچہ جس میں ابھی کوئی شعور نہیں آیا ہے، اس کے متعلق یہ حکم نہیں ہے (۲) دوسرے وہ تمام لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کریں، اس کا حکم دینا (۳) اور تیسرے یہ کہ اگر کوئی گناہ انہوں نے کرلیا تو اس سے روک کر اس پر ٹوکے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کل تین چیزیں آدمی کے لئے ضروری ہیں۔

گویا آدمی کے اوپر اپنے ماتحتوں کی تعلیم وتربیت لازم ہے کہ ان کو دین پر چلنے والا بنائے؛ اس باب میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی ذمہ داری کو بیان کیا ہے۔

نفقۂ جسمانی اور نفقۂ رُوحانی

پچھلے باب میں گھر والوں کا نفقہ بیان کیا تھا یعنی ان کے رہائش کا انتظام، کھانے

پینے کا انتظام اور کپڑوں کا انتظام؛ یہ جسمانی نفقہ ہے۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے ''اصلاحِ انقلاب'' نامی کتاب کے اندر لکھا ہے کہ آدمی کے اوپر جس طرح اپنے گھر والوں کا نفقۂ جسمانی واجب ہے، اسی طرح نفقۂ رُوحانی بھی واجب ہے۔ ایک تو ہے مادی نفقہ یعنی اس کی جسمانی زندگی جس کے اوپر موقوف ہے، اگر بیوی بچے کھائیں گے پئیں گے نہیں؛ تو ہوسکتا ہے کہ موت واقع ہو جائے، پہننے کی بھی ضرورت ہے۔ تو جسمانی اور مادی ضرورتوں کا پورا کرنا جس طرح ضروری ہے؛ اسی طریقہ سے روحانی نفقہ یعنی اس کی روحانی ضرورتوں کا پورا کرنا بھی اس کے اوپر ضروری ہے۔ اور روحانی ضرورتیں کیا ہیں؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اوامر اور نواہی (اوامر کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے، اور نواہی کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع کیا ہے) سے بھی وہ اپنی اولاد کو اپنے ماتحتوں کو واقف کرے اور ان پر عمل کرنے کی ٹریننگ دے، ان کی تربیت کرے یعنی ان پر محنت کر کے ان کو ایسا بنادے۔ تربیت کا مطلب یہی ہے۔

تعلیم وتربیت

دو چیزیں ہیں تعلیم اور تربیت۔ تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ ان کو واقف کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے کن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور کن چیزوں سے منع کیا ہے، مثلاً نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے، روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے، پڑوسیوں کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا ہے، اچھے اخلاق اختیار کرنے کا حکم دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور فلاں فلاں چیزوں سے منع کیا ہے مثلاً چوری سے منع کیا ہے، جھوٹ سے منع کیا ہے، حسد سے منع کیا ہے، چغلی سے منع کیا ہے؛ زنا اور اسبابِ زنا کو حرام قرار دیا ہے، ان سب باتوں سے واقف کرنا اور باقاعدہ

ان کو بتلانا جب تک کہ ان کو بتلایا نہیں جائے گا اور واقف نہیں کیا جائے گا؛ وہاں تک ان کو کیسے پتہ چلے گا۔ تو یہ تعلیم ہوئی۔

تعلیم کے بعد تربیت کا مرحلہ آتا ہے یعنی اتنا کہہ دینا اور بتا دینا کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں سے منع کیا ہے؛ کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے بعد دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ آپ اس پر محنت کیجئے، جتنے بھی نیکی کے کام ہیں وہ تمام کام آپ نے اس کو بتا دئے، اس کے بعد آپ اس پر محنت کیجئے اور اس کو ایسی ٹریننگ دیجئے کہ وہ ان کاموں کا کرنے والا بن جاوے، اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے اس کو واقف کیا تو اب ساتھ ساتھ اس کی نگرانی کیجئے اور ایسی تربیت کیجئے کہ وہ ان کاموں کو نہ کرے؛ اس کا نام تربیت ہے۔

تعلیم وتربیت کی ایک بہترین مثال

ہم لوگ تعلیم وتربیت کا لفظ بولتے رہتے ہیں لیکن اس کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ بھائی! آپ کسی ٹریننگ سینٹر میں جائیں گے مثلاً آپ کسی درزی کے پاس ٹیلرنگ کا کام سیکھنے کیلئے جائیں گے تو سکھانے والا پہلے تو آپ کو زبان سے بتائے گا کہ آپ کو کپڑا سینا ہے تو یوں کرنا ہے، یوں کرنا ہے، ایسا کرنا ہے؛ یہ تو تعلیم ہوئی۔ اس کے بعد پھر وہ اس بات پر محنت کرے گا کہ آپ سوئی میں دھاگہ کس طرح پروئیں، کپڑے کی کٹنگ کس طرح کریں، وہ اپنے سامنے آپ سے کٹنگ کروائے گا، سلوائے گا، طریقے بتلائے گا؛ اس کا نام ٹریننگ وتربیت ہے۔ ہر چیز میں دونوں باتیں ضروری ہوتی ہیں، اول نمبر پر تعلیم ہوتی ہے اور اس کے بعد تربیت کا نمبر آتا ہے۔

دین کے معاملہ میں بھی یہی دونوں چیزیں ضروری ہیں، تعلیم بھی ضروری ہے،

ماں باپ کی اور گھر کے بڑے کی ذمہ داری ہے کہ گھر میں اس کے ماتحت جو لوگ رہتے ہیں، بیوی بچے اور اس کے گھر کے دوسرے افراد؛ ان سب کو اللہ تعالیٰ کے احکام سے واقف کرے، یہ بتائے کہ اللہ تعالیٰ نے کون سی چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور کون سی چیزوں سے منع کیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ وہ لوگ اس پر عمل کرتے ہیں یا نہیں، ان کو ٹریننگ دے اور عادی بنائے۔

دعوتِ غور وفکر

اب ہمیں یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ ہم یہ دونوں کام کرتے ہیں یا نہیں؟ تعلیم یعنی ان کو واقف کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کن کن چیزوں کو کرنے کا حکم دیا ہے یا کن کن چیزوں سے منع کیا ہے۔ اور جو لوگ اس کا تھوڑا بہت اہتمام کر لیتے ہیں، وہی لوگ نمبر دو والا تربیت کا جو مرحلہ آتا ہے، اس کا اہتمام کرتے ہیں؟ جب بچے کو ہم نے یہ بتادیا کہ اللہ تعالیٰ نے پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے اور اس کی تفصیل بھی بتادی؛ تو پھر یہ بات بھی ضروری ہے کہ ہم دیکھیں کہ وہ نماز پڑھتا ہے یا نہیں۔ شریعت نے اس کی جو عمر بتائی ہے جب وہ اس عمر کو پہنچ جاوے تو اس کو اپنے ساتھ مسجد لے جاویں اور اس سے نماز پڑھوائیں، اس کو نماز کی عادت ڈالیں؛ یہ تربیت ہے۔

جیسے وہ فرض ہے؛ یہ بھی فرض ہے

یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب قائم کر کے یہی چیز بتائی ہے کہ بھائی دیکھو! آپ نے اس کو مادی اور جسمانی نفقہ دینے کے لئے بڑی محنت کی، صبح سے شام تک دوکان اور فیکٹری میں، اپنی ملازمت اور سروس پر، اپنی کھیتی باڑی میں آپ محنت اسی لئے کرتے

ہیں تاکہ کچھ پیسے کمالیں اوران کے ذریعہ سے اپنی بیوی بچوں اوراپنے ماتحت لوگوں کو کھلا پلاسکیں ان کے کپڑوں کا انتظام کرسکیں، ان کی رہائش کا انتظام کرسکیں؛ یہ آپ نے ان کے مادی نفقہ اور جسمانی ضرورتوں کا انتظام کیا، اب ان کی روحانی اور دینی ضرورت کا بھی انتظام کرنا آپ کا فریضہ ہے، ان کو اللہ کے احکام سے واقف کرنا، اللہ نے جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے اس سے واقف کرنا اور جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے واقف کرنا اور پھر اس کی عادت ڈالنا، اس پر محنت کرنا؛ یہ بھی ضروری ہے۔ پچھلا باب تو مادی نفقہ کا تھا اور یہ باب روحانی نفقہ کا قائم کیا ہے۔ جیسے وہ (مادی) فرض ہے؛ ایسے ہی یہ (روحانی) بھی فرض ہے۔

کیا ہمارا دل ایسا ہی کڑھتا ہے؟

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم جتنا اہتمام ان کے مادی نفقہ کا کرتے ہیں؛ کیا ویسا ہی اہتمام ان کے روحانی نفقہ کا بھی کرتے ہیں؟ اگر ہمارے گھر میں ایک وقت فاقہ ہوجاوے، بیوی بچوں کو کھانا نہ ملے؛ تو ہمارے دل پر جو گذرتی ہے وہ ہم اور آپ سمجھ سکتے ہیں، ہم سوچتے ہیں کہ آہ! مَیں اس قابل بھی نہیں ہوا کہ اپنے بیوی بچوں کو کھانا کھلاسکوں تو اگر ہمارے بچوں کو اللہ کے احکام سے واقفیت نہ ہو، قرآن پڑھنا نہیں آتا، نماز نہیں آتی، کلمہ نہیں آتا، روزہ کیا ہے وضو کس طرح کیا جاتا ہے؟ یہ سب نہیں آتا؛ تو کیا اس پر بھی ہمارا دل اتنا ہی جلتا ہے جو ایک وقت کا کھانا نہ ملنے پر جلا تھا؟ اور ہمارے دل میں جو کوفت اور کڑھن ہوئی تھی اور کونے میں بیٹھ کر رونا آیا تھا کہ آج مَیں اس قابل بھی نہیں کہ اپنے بال بچوں کو برابر کھلاسکوں، اس پر تو اتنا افسوس ہوا تھا، حالانکہ اگر ایک وقت کا کھانا نہیں ملا تو کوئی بڑا نقصان ہونے والا نہیں، لیکن اگر بچے کو نماز نہیں آتی، کلمہ نہیں آتا، وضو نہیں

آتا اوراللہ کے احکام سے واقفیت نہیں ہے؛ تو کیا اس کو بھی سوچ کر ہمارے دل میں کڑھن ہوتی ہے؟ کیا اس پر بھی کبھی رونا آتا ہے؟ کہ مَیں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ مَیں اپنی اولاد کو اللہ کے دین سے اور اللہ کے احکام سے واقف کرسکوں؟ اوران کو ایسا بناؤں کہ وہ اللہ کے احکام پر عمل کرنے والے بن جائیں۔ دراصل ہمیں یہ سوچنا چاہیے۔

اس کے کھانے اور کپڑوں کو اور اس کے مکان کو اور اس کے بستر کو، اس کی ظاہری ضرورتوں کو ہم اہمیت دیتے ہیں اور ہماری نگاہوں میں یہ سب جتنا مہتم بالشان ہے؛ کیا اس کی تعلیم وتربیت اور اس کا دیندار ہونا اور اللہ کا فرماں بردار بننا، اللہ کی نافرمانی سے بچنا؛ اس کی بھی ہماری نگاہوں میں اتنی حیثیت ہے؟ ہم نے اپنے بچے کے متعلق سنا کہ اس نے آج نماز نہیں پڑھی، یا اس نے آج جھوٹ بول دیا تو اس بات کو سن کر کیا ہمیں اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے؟ یہ سوچنے کی بات ہے، حالانکہ اگر غور کیا جائے اور سوچا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک وقت دو وقت کیا؛ چار وقت بھی کھانا نہ ملے؛ تو اس کا وہ نقصان نہیں ہوگا جو جھوٹ بولنے سے اور نماز نہ پڑھنے سے اور جو کسی کے ساتھ برا سلوک کرنے سے ہوگا، اس لئے کہ اس میں اس کے دین اور دنیا دونوں کا نقصان ہے، اس لئے اس کی بڑی اہمیت ہے۔

ہمارے زمانہ کا المیہ

آج ہمارے اس زمانہ میں سب سے زیادہ غفلت اگر کسی چیز کی طرف سے برتی جارہی ہے تو وہ یہی ہے کہ ہم اپنی اولاد کی ظاہری ضرورتوں مثلاً کپڑوں کے واسطے، ان کے کھانے کے واسطے، ان کے بستر کے واسطے، ان کے کمرے اور رہائش کے واسطے جتنا اہتمام کرتے ہیں؛ ان کی تعلیم وتربیت کے واسطے ایسا انتظام نہیں کرتے۔ آج اگر ہمارا

بیٹا ناراض ہوکر ضد کرے کہ مجھے جوتے چاہئیں اور وہ جوتے بازار میں ڈیڑھ ہزار کے ملتے ہوں تو ہم آج ہی لاکر دیدیں گے، آپ بچے کے جوتے کے لئے ڈیڑھ ہزار خرچ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور آج کل تو ان جوتوں کا مطالبہ سال میں ایک مرتبہ نہیں، بلکہ کئی مرتبہ آتا ہے۔ پرانے زمانہ میں یہ بات ہوتی تھی کہ ابا سال میں ایک مرتبہ جوتا لادیا کرتے تھے، اور آج کل تو بچہ ہر مہینہ نیا جوتا مانگتا ہے۔ پرانے لوگ جانتے ہیں کہ ہمیں تو سال میں بلکہ کبھی تو دو دو سال میں ایک مرتبہ نیا جوتا ملتا تھا اور اب تو بچے ہر مہینے میں پرانا جوتا پھینک کر دوسرا منگواتے ہیں، اور ماں باپ بھی جیسا وہ کہے ویسا جوتا خوشی خوشی لاکر دیتے ہیں، بس! ایک مرتبہ اس کا اشارہ ہوجائے!!! تو جوتے کے لئے ڈیڑھ ہزار خرچ کرنے کے لئے ہم شوق سے تیار ہیں۔

اور اسی بچے کو اللہ کا مطیع اور فرمانبردار بنانے کے لئے، دیندار بنانے کے لئے جو محنت کی جارہی ہے اس کے اندر اگر مصارف پیش آتے ہیں تو ہم تعاون کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اسی بچے کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرنے والے مدرسہ والے آپ کے پاس آئیں، یا اگر نہیں بھی آئیں تب بھی ہمیں تو خود سوچنا چاہیے تھا کہ جو کام ہمارا تھا یعنی بچے کو دین سے واقف کرانا؛ وہی ذمہ داری اللہ کے ان بندوں نے اٹھائی ہے اور وہ اس ذمہ داری کو پورا کررہے ہیں، اور اس کی ادائیگی میں کچھ خرچہ بھی ہوتا ہے، کچھ مصارف بھی آتے ہیں، ان مصارف کے واسطے وہ آپ کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں، اب چاہیے تو یہ تھا کہ ان کو آپ کے پاس آنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، آپ ان کے آئے بغیر ان کی خدمت میں پہنچتے اور کہتے کہ آپ کا بڑا احسان ہے، ہم تو زندگی بھر آپ کی غلامی کریں تب بھی آپ کا احسان ادا نہیں کرسکتے کہ ایک بہت بڑی ذمہ داری جو ہمارے

اوپر تھی وہ آپ نے اٹھالی۔ ہمارے اس زمانہ کا یہ بہت بڑاالمیہ ہے،اس کے کھانے کا پینے کا انتظام جتنی لگن اوراہمیت اور جتنی فکر کے ساتھ ہم کرتے ہیں؛ کیااس کودیندار بنانے کا اہتمام بھی اتنی ہی فکر،لگن اوراسی اہمیت کے ساتھ ہم کرتے ہیں؟ جواب ہے کہ نہیں کرتے ،ہم لوگوں کے لئے یہ سوچنے کی چیز ہے۔

ہم سے بڑا بے غیرت کون ہوگا

مثلاً کوئی آدمی اگر ہمارے گھر والوں کا، بیوی بچوں کے کھانے پینے کا انتظام اپنے سر پر لے لے، ہمارے کہے بغیر وہ ہمارے بیوی بچوں کے کھانے کا انتظام کرتا ہے،اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہمارے بیوی بچوں کے کھانے کا انتظام کرنے میں اس کوخرچہ بھی ہوتااوراس کے لئے وہ لوگوں سے پیسے بھی مانگتا ہےاور ہمارے پاس پیسے ہیں،ہم جاننے کے باوجوداس کوپیسے نہ دیں؛تو ہم سے بڑا بے غیرت کون ہوگا،اس لئے کہ یہ تو ہماری ذمہ داری تھی لیکن اس کا احسان ہے کہ اس نے اپنے سر لے لی ہے۔

اسی طرح بچوں کی تعلیم وتربیت،ان کو دیندار بنانا،دین سے واقف کرنا؛ یہ ماں باپ ہونے کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری ہے،اب یہ ذمہ داری اگر دوسرے لوگ اٹھا رہے ہیں اور ہماری طرف سے یہ فرض ادا کررہے ہیں؛ تو ہمیں تو ان کا احسان مند ہونا چاہیے تھا،اوراس کام میں ہم سے جتنا زیادہ سے زیادہ بڑھ چڑھ کر مدداورتعاون ہوسکتا ہو؛ وہ کرنے میں ہمیں ذرا بھی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔

ہماری فکریں کیا ہیں؟

ہاں!اس کی دوکان ہوجائے،اس کا مکان ہوجائے،فیکٹری ہوجائے،اس کے

لئے اچھا سا کاروبار لگا کر جائیں، ہمارے مرنے سے پہلے بیٹے کو فیکٹری پر بیٹھا ہوا دیکھ کر ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں، اگر اچھی طرح سے فیکٹری چلاتا ہے تو باپ کہتا ہے کہ اب مجھے اطمینان سے موت آئے گی، اس کے بغیر اطمینان سے موت نہیں آتی۔ ہمیں یہ فکر رہتی ہے کہ میرے مرنے سے پہلے پہلے وہ کاروبار پر لگ جانا چاہیے، ساری چیزوں میں ماہر ہو جانا چاہیے، موت کے وقت بھی اگر ہمیں فکر ہوتی ہے تو یہی ہوتی ہے کہ بچو! میرے بعد تم کیا کرو گے؟ تمہارے کاروبار کا کیا ہوگا؟ اور حضرات انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کا کیا حال تھا؟

میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟

اللہ تعالیٰ نے ہماری ہدایت کے واسطے نبیوں کا سلسلہ جاری کیا، قرآنِ پاک میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا قصہ موجود ہے ﴿أَمْ كُنتُمْ شُهَدَآءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ، إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِى﴾ حضرت ابراہیم کے بیٹے حضرت اسحاق ہیں اور ان کے بیٹے حضرت یعقوب ہیں، حضرت یعقوب کے بارہ بیٹے تھے، حضرت یوسف اور باقی گیارہ۔ ہم لوگ اگر بستر مرگ پر ہوں تو ہمیں تو یہ فکر ہو گی کہ میرے بچے کیا کھائیں گے، ان کے کاروبار کا مسئلہ کیسا ہوگا، ان کے رہنے کے لئے میں پورا گھر تو دے کر نہیں گیا، صرف ایک گھر ہے اور بچے چار ہیں؛ اب ان کا کیا ہوگا؟ لیکن یہاں نبیوں کو موت کے وقت اگر فکر ہے تو کیا ہے؟ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں کو جمع کر کے پوچھ رہے ہیں۔ باری تعالیٰ اس قصہ کو بیان کر رہے ہیں، چونکہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی موت آئی اس وقت ہم اور آپ تو تھے نہیں، اگر اللہ تعالیٰ نہ بتاتے تو ہمیں کیسے پتہ چلتا، ذرا غور کیجئے کہ قرآنِ کریم میں باری تعالیٰ نے کیسا عجیب وغریب انداز اختیار کیا ﴿أَمْ كُنتُمْ شُهَدَآءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ﴾ اے لوگو! جب حضرت یعقوب کی موت آئی

اس وقت کیا تم موجود تھے؟ ظاہر ہے ہم تو موجود نہیں تھے، باری تعالیٰ کہتے ہیں کہ تم موجود نہیں تھے، اس لئے تم کو معلوم نہیں کہ اس وقت کیا ہوا تھا، لیکن مَیں تم کو بتاتا ہوں کہ کیا ہوا تھا ﴿اِذْقَالَ لِبَنِیْهِ مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ﴾ جب ان کی موت کا وقت آیا تو حضرت یعقوب نے اپنے بچوں کو جمع کیا، اور اس کے بعد کیا کہا؟ میرے بعد کیسے رہوگے؟ مل جل کر رہوگے لڑو گے تو نہیں؟ کاروبار اچھی طرح سے کروگے؟ اپنی ماں کو تو نہیں ستاؤ گے؟ ایسا نہیں کہا۔ بلکہ یہ کہا ﴿مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ؟﴾ اے میرے بیٹو! بتاؤ کہ میرے مرنے کے بعد تم کس کی عبادت کروگے؟ ان کو اگر فکر ہے تو بچوں کی دینداری کی فکر ہے۔

ہمیں کیا فکر رکھنی چاہیے؟

بیٹے بھی نبی کے تھے، اس لئے انہوں نے اطمینان دلا دیا کہ ابا جان! دنیا سے بے فکر ٹھنڈے دل کے ساتھ جایئے ﴿نَعْبُدُ اِلٰهَکَ وَاِلٰهَ اٰبَآءِکَ اِبْرَاهِیْمَ وَاِسْمَاعِیْلَ وَاِسْحَاقَ﴾ ہم آپ کے معبود یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے، زندگی بھر جس کی عبادت آپ کرتے رہے اور آپ کے باپ دادا یعنی حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق جس کی عبادت کرتے رہے۔ وہ کون ہے؟ ﴿اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ وہی ایک اللہ۔ اسی کی ہم بھی عبادت کریں گے ﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ اور اس کے پورے فرمانبردار بن کر رہیں گے، ذرا بھی نافرمانی نہیں کریں گے۔ جب بیٹوں نے ابا جان کو اطمینان دلا دیا تب حضرت یعقوب کو اطمینان ہوا اور موت آئی۔ دیکھو! قرآنِ کریم میں باری تعالیٰ نے موت کا یہ قصہ بھی ہم لوگوں کی عبرت کے واسطے ذکر کیا ہے کہ جب ہماری موت کا وقت آئے تو کیا ہم بھی اسی فکر کے ساتھ دنیا سے جاتے ہیں کہ میرے بچے میرے بعد دین کے معاملہ میں کیا کریں گے؟ یا کسی دوسری فکر کے ساتھ جاتے

ہیں؟ ہمیں کیا فکر رکھنی چاہیے جبکہ اللہ کے نبیوں کا یہ حال تھا۔

آج ہمیں یہ منظر بکثرت دیکھنے ملتا ہے

حضرت یعقوب علیہ السلام دنیا سے یہ فکر لے کر جا رہے ہیں کہ بچوں کو بلا کر پوچھتے ہیں کہ بتاؤ! کیا کرو گے؟ زندگی میں اور موت کے بستر پر بھی کیا ہماری فکریں یہی ہیں؟ نہیں! بلکہ زندگی میں بھی اگر ہماری فکریں ہیں تو یہ ہیں کہ اس کی ایک دوکان ہو جائے، ذرا کھاتا پیتا ہو جائے، کاروبار اچھا چلے، فیکٹری اچھی چلے، کارخانہ اچھا چلے اور اس پر پورا کنٹرول کرلے؛ تب ہمیں ذرا ٹھنڈک ہو، پھر اطمینان سے موت آئے گی، باقی دینداری کیسی بھی ہو۔ آج ہمیں یہ منظر بکثرت دیکھنے ملتا ہے کہ آدمی خود بڑا دیندار ہوتا ہے، پانچوں وقت کی نمازوں کا پابند، روزوں کا پابند، تہجد کا پابند، تلاوت کا پابند؛ لیکن اولاد کو دیکھتے ہیں تو بالکل اُلٹی سمت میں چل رہی ہے، یہ مشرق (ایسٹ) میں جا رہا ہے تو اولاد مغرب (ویسٹ) میں جا رہی ہے، یہ نمازوں کا پابند ہے تو اولاد کا معاملہ بالکل اُلٹا ہے، یہ منظر ہمیں بکثرت دیکھنے ملتا ہے۔

دین پر کوئی زد تو نہیں پڑ رہی ہے

دیکھو! یونیورسٹی میں پڑھانا برا نہیں ہے، آپ یہ مت سمجھنا کہ مَیں اس کو برا کہہ رہا ہوں بلکہ اپنی اولاد کو اس میں پڑھا کر دیندار بنائیے۔ اکبر الٰہ آبادی کا شعر ہے:-

تم شوق سے کالج میں پڑھو، پارک میں پھولو ❁ جائز ہے غباروں میں اُڑو، چرخ پہ جھولو

بس ایک بات بندۂ مومن کی رہے یاد ❁ اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

آپ اپنے بچوں کو کہیں بھی پڑھائیے، ہم منع نہیں کرتے، ہم یہ نہیں کہتے کہ نرسری میں

مت بھیجو، کالج ویونیورسٹی میں مت بھیجو،ضرور بھیجئے لیکن یہ دیکھنا کہ وہاں جاکراس کے دین پر کوئی زدتونہیں پڑرہی ہے،ہمیں اس بات کااہتمام ہوناچاہیے کہ اسکودیندار بنانے کی کوشش کریں

تھوڑا سا بے دین ہوگیا ہے

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک صاحب آئے ، دیندار اور نمازی آدمی تھے،انہوں نے اپنے بچے کو یونیورسٹی میں پڑھایا اور جب اس کو بڑا اچھا سا منصب اور عہدہ بھی مل گیا تو وہ یوں کہنے لگے کہ ماشاء اللہ بچہ پڑھ لکھ کر اچھے عہدے پر لگ گیا ہے،اوراس نے اپنا کیریئر بھی بنالیا ہے، ہمارے سماج اور کمیونٹی کے اندر اُس کا نام ہے، بس اتنی بات ہے کہ وہ تھوڑا سا بے دین ہوگیا ہے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ لو بھائی! تھوڑا سا بے دین ہوگیا، وہ اس کی دنیاوی تعلیم وترقی پرتو بہت خوش ہیں اوراس کو فخریہ بیان کررہے ہیں لیکن اس کی بے دینی پران کوکوئی فکرہی نہیں ہے،اوراس کواس انداز سے پیش کررہے ہیں کہ بس! تھوڑا سا بے دین ہوگیا ہے۔

......تب ہی اثر ہوگا

حالانکہ باری تعالیٰ نے اس آیت ﴿وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا﴾ میں فرمایا ہے کہ اپنے گھر والوں کونماز کاحکم دیجئے اور خود بھی اس پر قائم رہیے، بعض لوگ بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بیٹا! مَیں تو نماز نہیں پڑھتا، لیکن تو تو پڑھ۔ خیر! یہ بھی اچھی بات ہے،اور کہنا بھی چاہیے لیکن سوال یہ ہے کہ ان کا یہ طرز کتنا مفید اور مؤثر ہے؟ ایسا کہنے سے کیا اس پر کوئی اثر پڑے گا؟ اسی کو بتلارہے ہیں کہ اپنی اور گھر والوں

کی فکر ہونی چاہیے، اسی طریقہ سے اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیجئے اور خود بھی نماز کی پابندی کیجئے، گویا پہلے حکم دیا پھر نماز کی پابندی کی تاکید کی، اس لئے کہ اگر آپ پابندی نہیں کرتے ہیں اور گھر والوں کو نماز کے لئے کہہ رہے ہیں؛ تو آپ کا یہ کہنا فضول ہے، اس کا کوئی اثر ہونے والا نہیں ہے، اس لئے کہ جب آپ نماز نہیں پڑھتے اور بیٹے سے کہتے ہیں تو بیٹا یوں سمجھے گا کہ نماز اگر کوئی ایسی اچھی ہی چیز ہوتی تو ابا کیوں نہ پڑھتے؟ ابا تو پڑھتے نہیں اور مجھے کہہ رہے ہیں۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ آپ خود نہ کھائیں اور بیٹے سے کہیں کہ کھاؤ، ہم بھی کھاتے ہیں، اس کو بھی کھانے کے لئے کہتے ہیں تو ہم بھی نماز پڑھیں اس کو بھی نماز پڑھنے کے لئے کہیں گے؛ تب ہی اثر ہوگا۔

اولاد کی تربیت کے سلسلہ میں یہ چند باتیں ہیں، بقیہ باتیں ان شاء اللہ آئندہ مجلس میں ہوں گی۔

وُجُوبُ أَمْرِهٖ أَهْلَهٗ وَأَوْلَادَهُ الْمُمَيِّزِيْنَ

تعلیم وتربیتِ اولاد

مجلس (۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماتحتوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ضروری ہے

گزشتہ مجلس میں بتلایا تھا کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے کہ آدمی کے لئے ضروری ہے کہ اپنے گھر والوں کو اور اولاد میں جو سنِ تمیز کو پہنچ چکی ہے اور ان تمام لوگوں کو جو آدمی کی ماتحتی میں رہتے ہیں، چاہے آقا کے ماتحت اس کے غلام یا ملازم ہیں، یا وہ استاذ کے ماتحت شاگرد ہیں، یا شیخ کے ماتحت اس کے مرید ہیں، یا وہ خاندان کا بڑا ہے اور دوسرے اس کے ماتحت ہیں؛ ان تمام کو اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے آمادہ کرے، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی سے ان کو روکے۔ اور اگر کسی نے کسی ایسے کام کا ارتکاب کرلیا، کوئی ایسی حرکت کرلی جو اللہ تعالیٰ کی منع فرمودہ ہے، تو اس پر اس کو ٹوکے اور آئندہ کے لئے منع کردے۔ اس باب سے یہ معلوم ہوا کہ آدمی کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ماتحتوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرے۔

تعلیم کس کو کہتے ہیں اور تربیت کس کو کہتے ہیں یہ بتلا چکا ہوں اور اسی کے متعلق قرآنِ پاک کی جو آیتیں ہیں ان کی تشریح بھی پہلے آچکی ہے۔ اس سلسلہ میں جو روایتیں ہیں ان کو آج پیش کرتے ہیں۔

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے مناقب

۲۹۸۔ عن أبی هريرةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: أَخَذَ الحسن بن علی رضی اللہ عنہ تَمْرَةً مِنْ تَمرِ الصَّدَقَةِ، فَجَعَلَهَا فِیْ فِیْهِ. فَقَالَ رسولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم: كَخْ كَخْ؛ اِرْمِ بِهَا، أَمَا عَلِمْتَ أَنَّا لَانَأْكُلُ الصَّدَقَةَ؟

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ جب چھوٹے بچے تھے اس وقت ایک مرتبہ صدقہ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور اُٹھا کر اپنے منھ میں ڈال لی، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا تو

وفی روایةٍ:اِنَّالا تَحِلُّ لَنَاالصَّدَقَةُ.
وقوله: کَخْ کَخْ،یُقَالُ بِاِسْکَانِ الْخَآءِ.
وَیُقَالُ بِکَسْرِھَامَعَ التَّنْوِیْنِ وَھِیَ کَلِمَةُ زَجْرٍ لِلصَّبِیّ عَنِ الْمُسْتَقْذَرَاتِ.وَکَانَ الْحَسَنُ رضی اللہ عنہ صَبِیًّا.

فرمایا کہ تھوتھو،اس کونکال کر پھنکو،کیاتمہیں معلوم نہیں کہ ہم صدقہ کامال نہیں کھاتے۔دوسری روایت میں ہے کہ ہمارے لئے صدقہ کامال کھانا جائزنہیں ہے۔

افادات:۔حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بڑے صاحبزادے تھے، نبی کریم ﷺ کوان کے ساتھ بہت زیادہ محبت اور بہت زیادہ پیارتھا۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ منبر پرخطبہ دے رہے تھے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ چھوٹے تھے اورابھی چلنا سیکھاہی تھا،وہ کمرے سے باہر نکل کرآپ ﷺ کی طرف بڑھنے لگے،اورچھوٹابچہ جس نے تازہ تازہ چلنا سیکھاہو،اس کے گرجانے کابھی اندیشہ رہتاہے۔ان کوآتاہوادیکھ کرنبی کریم ﷺ نے اپناخطبہ موقوف کیا،منبر سے اُترکران کواُٹھایا،اپنے کندھے پربٹھایا،پھرمنبرپرتشریف لے گئے اورخطبہ شروع کردیا(سنن نسائی،۳/ ۱۰۸۔سیراعلام النبلاء،۳/ ۲۶۵)

بخاری شریف میں روایت ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ بازار سے گزررہے تھے،مَیں بھی آپ کے ساتھ تھا،جب گھرپرواپس پہنچے تو آپ ﷺ کوگھرمیں آتاہوادیکھ کرحضرت حسن رضی اللہ عنہ جوچھوٹے بچے تھے وہ ہاتھ چھوڑے کرکے آگے بڑھنے لگے(جیسے بچوں کی عادت ہوتی ہے)توحضوراکرم ﷺ بھی ہاتھ چھوڑے کرکے آگے بڑھے اوران کولےکراپنے سینے سے چمٹے لیااوردعافرمانے لگے کہ

اے اللہ! مَیں اِن سے محبت کرتا ہوں، جو اِن سے محبت کرے تو بھی اُن سے محبت کر۔ (بخاری شریف،۵۸۸۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سے مَیں برابر اُن سے محبت رکھتا ہوں۔

بچوں کے ساتھ محبت کا مطلب

بہر حال! حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت زیادہ محبت تھی، لیکن محبت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بچہ کوئی غلط حرکت کر رہا ہے تو اس کو ٹوکا اور روکا نہ جائے، ہمارے یہاں تربیت کے معاملہ میں سب سے پہلی جو کوتاہی ہوتی ہے وہ یہی ہوتی ہے کہ ان چھوٹے بچوں کو کوئی نامناسب حرکت کرتا ہوا دیکھ کر ہم منع نہیں کرتے۔ اور منع کرنے کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ان کی پٹائی کی جائے اور طمانچہ مارا جائے، یا ڈنڈے اور لکڑی سے مارا جائے، بلکہ روکنے کے محبت بھرے طریقے بھی ہیں، ان طریقوں سے ان کو روکنا چاہیے، اور کسی غلط چیز کا غلط ہونا اچھے طریقہ سے ان کے ذہن میں بٹھانا چاہیے۔ بچپن سے اگر کسی چیز کی عادت ڈالی جائے تو پھر وہ چیز برابر سیکھ لیتا ہے اور بڑے ہونے کے بعد وہ چیز اس کے دل و دماغ کے اندر محفوظ ہو جاتی ہے، اس لئے کہ بچپن کی سکھائی ہوئی چیز کے بارے میں علماء لکھتے ہیں کہ وہ ایسی ہو جاتی ہے ﴿كَالنَّقْشِ فِي الْحَجَرِ﴾ جیسے پتھر کے اوپر آپ نے کچھ لکھ دیا ہو یعنی جیسے پتھر کا لکھا ہوا مٹایا نہیں جا سکتا، وہ اس کے اوپر باقی رہتا ہے، ایسے ہی بچپن کے اندر جو چیز ذہن نشین کر دی جاتی ہے، اس کے دل و دماغ میں اتار دی جاتی ہے؛ وہ پوری زندگی برابر محفوظ رہتی ہے۔ اسی لئے بچہ چاہے چھوٹا ہو، لیکن جب وہ آپ کی بات سمجھنے لگے تو آپ اس کو اس کی غلط حرکت سے روک دیجیے۔ چنانچہ اس روایت میں ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا۔

خاندانِ بنو ہاشم کے لئے صدقات جائز نہیں

قصہ یہ ہوا تھا کہ نبی کریم ﷺ کے یہاں صدقات کا جو بھی مال آتا تھا اس کو ایک جگہ رکھا جاتا تھا اور جو لوگ صدقات کے حقدار ہوتے تھے ان کو بوقتِ ضرورت موقع بموقع دیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے مکان میں جہاں پر یہ صدقات کی کھجوریں پڑی ہوئی تھیں وہاں سے ایک کھجور لے کر منہ میں ڈال لی۔ چونکہ وہ بچے تھے اس لئے ان کو پتہ نہیں تھا کہ یہ کھجور کیسی ہے اور ہمیں کھانی نہیں چاہیے، کیونکہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے اہلِ خاندان بنو ہاشم کے لئے صدقات کھانا جائز نہیں ہے۔

حضرت سلمان کی جانچ

خود حضورِ اکرم ﷺ کا معمول یہی تھا کہ آپ ﷺ صدقات کا مال نہیں کھاتے تھے، ہاں! ہدیہ قبول فرماتے تھے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جو بڑے جلیل القدر صحابی ہیں وہ پہلے یہود کے غلام تھے، انھوں نے نبی کریم ﷺ کی جو علامتیں کتبِ سابقہ میں پڑھی تھیں، ان میں سے ایک علامت یہ بھی تھی کہ نبی آخر الزماں ﷺ صدقہ نہیں کھاتے ہیں، ہاں ہدیہ کھاتے ہیں۔ آپ ﷺ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو ان علامتوں کو جانچنا شروع کیا جو انہوں نے اگلی کتابوں میں پڑھی تھیں، اس میں ایک علامت یہ بھی تھی کہ وہ صدقہ نہیں کھاتے ہیں، اور ہدیہ قبول کرتے ہیں اور اس کو کھاتے ہیں۔ چنانچہ پہلے دن خدمت میں کچھ کھجوریں پیش کیں اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! یہ صدقہ ہے۔ حضور ﷺ نے اصحابِ صفہ میں جو غریب تھے ان کو دیدیا اور کہا کہ لو بھائی! کھالو اور فرمایا کہ ہم صدقہ نہیں کھاتے ہیں۔ پھر دوسرے روز خود کچھ کھجوریں لے کر حاضرِ خدمت ہوئے

اور نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ یارسول اللہ! یہ ہدیہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے قبول فرمالیا، خود بھی نوش فرمایا اور جو لوگ موجود تھے ان سے بھی کہا کہ شریک ہو جاؤ۔ (المستدرک، ۲۱۴۱۴) یہ آپ ﷺ کی عادتِ شریفہ تھی کہ آپ ﷺ صدقہ تناول نہیں فرماتے تھے، نیز آپ ﷺ کے لئے اور آپ کے اہلِ خاندان کے لئے صدقہ حلال نہیں ہے۔

موقع سے جو تعلیم دی جائے وہ بڑی مؤثر ہوتی ہے

تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ چھوٹے بچے تھے بعض روایتوں میں ہے کہ ڈھائی، تین سال کی عمر تھی، انہوں نے صدقہ کی جو کھجور پڑی ہوئی تھی وہ اٹھا کر منہ میں رکھی، جب وہ منھ میں رکھ رہے تھے اس وقت حضور ﷺ کی نظر ان پر نہیں تھی، حضور کی بے خبری میں انھوں نے وہ کھجور اٹھا کر منہ میں رکھ دی تھی، حضور ﷺ نے دیکھا کہ منہ ہلا رہے ہیں جیسے بچہ کوئی چاکلیٹ وغیرہ منھ میں رکھ کر کھاتا ہے۔ بلکہ بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ ان کے منہ میں سے کھجور ملا ہوا تھوک اور لعاب گرنے لگا تھا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ منھ میں کیا ہے؟ جب دیکھا کہ کھجور ہے تو آپ ﷺ نے منھ میں انگلی مبارک ڈال کر کھجور نکال دی اور ساتھ ہی ساتھ زبانِ مبارک سے بھی فرمایا﴿كَخْ كَخْ؛ اِرْمِ بِهَا﴾ ”كَخْ كَخْ“ یہ عربی زبان میں کوئی گندی چیز منہ میں ڈال دی ہو اس کو نکلوانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، جیسے ہم اردو میں بولتے ہیں تھوتھو۔ بچے کو تھو کہتے ہیں یعنی مطلب یہ ہے کہ منہ سے نکال دو۔ تھو تھو بول کر اس کو نکالنے کے لئے کہا جارہا ہے۔ اسی کو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا﴿هِيَ كَلِمَةُ زَجْرٍ لِلصَّبِيِّ عَنِ الْمُسْتَقْذَرَاتِ﴾ گندی اور ناپسندیدہ چیز بچے کے ہاتھ یا منہ میں سے نکلوانے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: تھو تھو! اس کو نکال دو، تمہیں معلوم نہیں کہ ہم لوگ صدقہ نہیں کھاتے؟ یعنی ہم اہلِ خاندانِ نبوت

صدقہ نہیں کھاتے، یہ فرما کر ان کے منہ میں سے وہ کھجور نکلوا دی۔

تو دیکھئے! یہاں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عمر زیادہ نہیں تھی، ڈھائی، تین سال کے تھے لیکن جیسے ہمارے یہاں سوچا جاتا ہے کہ نادان اور ناسمجھ بچہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں سوچا، اس سے تو کس کو انکار ہے کہ بچہ بھی ہے، نادان بھی ہے اور ناسمجھی میں کر لیا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب آپ اس کو تنبیہ بھی نہ کریں، یہی تو تعلیم و تنبیہ کرنے کا موقع ہے۔ اور موقع سے جس چیز کی طرف متوجہ کیا جائے وہ بڑی مؤثر ہوتی ہے اور یاد بھی رہتی ہے۔

جیسے آپ نے وعظ کی مجلس میں کوئی مسئلہ سن لیا تو اگر آپ کو شوق اور رغبت ہے تو آپ اس کو بھی یاد رکھیں گے، لیکن عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ایسے موقع پر سنی ہوئی چیز بعد میں یاد نہیں رہتی۔ لیکن آپ نماز پڑھ رہے تھے اور نماز میں جو کام نہیں کرنا چاہیے وہ کر لیا اور کسی جاننے والے نے آپ کو بتایا کہ آپ نے اس طرح جو سجدہ کیا؛ وہ نہیں کرنا چاہیے تو آپ کو وہ چیز زندگی بھر برابر یاد رہے گی کہ ایک مرتبہ مَیں نے اس طرح سجدہ کیا تھا تو فلاں مولوی صاحب یا مفتی صاحب نے ٹوکا تھا کہ اس طرح سجدہ نہیں کرنا چاہیے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہی تھا

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ بھی یہی تھا کہ آپ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو عمومی انداز میں بھی اللہ تعالیٰ کے احکام بتلاتے تھے، اور صحابہ کی تربیت کرتے تھے، لیکن جب موقع ہوتا تھا تو کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم چوکتے نہیں تھے۔

حدیثِ شریف میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صاحبزادے حضرت ابراہیم تھے، جن کا بچپن میں ڈیڑھ پونے دو سال کی عمر میں دودھ پینے کے زمانہ میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ اتفاق کی بات کہ جس روز ان کا انتقال ہوا اسی روز سورج گرہن ہو گیا، اور

زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا نظریہ اور عقیدہ یہ تھا کہ سورج گرہن کسی بڑے آدمی کی موت کی وجہ سے یا کسی بڑے آدمی کی پیدائش کی وجہ سے ہوتا ہے، جب سورج گرہن ہوا تو نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھائی (سورج گرہن کے وقت نماز پڑھنی چاہیے) اور نماز پڑھانے کے بعد آپ ﷺ نے خطبہ دیا اور اس خطبہ میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو بڑی نشانیاں ہیں اور ان کو کسی کی موت کی وجہ سے، یا کسی کی پیدائش کی وجہ سے گرہن نہیں لگتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے (بخاری شریف۔۱۰۶۰)

گویا آپ ﷺ نے موقع سے یہ چیز بتلائی۔ اس لئے کہ عام طور پر لوگوں کا مزاج ہوتا ہے کہ جو غلط نظریہ ہوتا ہے وہ ایسے موقع پر ہی دہرایا جاتا ہے۔ جب سورج گرہن ہوگا تو غلط نظریہ والے اپنے غلط نظریہ کو پیش کریں گے کہ یقیناً کوئی مر گیا ہوگا، یا کوئی پیدا ہوا ہوگا۔ اور مسلمان کی اسلامی شان اور ایمانی حمیت اور غیرت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس موقع پر اسلام کی تعلیمات کو پیش کرے؛ تو وہ یاد رہے گی۔ اور ایسے موقع پر لوگوں کو انتظار بھی رہتا ہے۔

محبت تعلیم وتربیت سے آڑے نہیں آئی

بہر حال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہمارے یہاں ایک مزاج بنا ہوا ہے کہ بچے کو کوئی غلط حرکت کرتا ہوا دیکھ کر بھی محبت کی شدت اور لاڈ پیار کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے اور اگر کوئی کہہ رہا ہو تو اس کو بھی روک دیتے ہیں کہ مت کہو، ابھی تو نادان اور چھوٹا بچہ ہے۔ ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ دیکھو! حضرت حسن رضی اللہ عنہ بڑی عمر کے نہیں تھے، ڈھائی تین سال کی عمر تھی، اس وقت کا یہ قصہ ہے اور جیسا کہ شروع میں بتلا چکا ہوں کہ حضورِ اکرم ﷺ کو ان کے ساتھ بہت محبت تھی اس کے باوجود یہ محبت تعلیم وتربیت میں آڑے نہیں آئی، بلکہ آپ نے بڑے اچھے انداز میں سمجھایا اور بچوں کو اسی طرح سمجھایا جائے کہ

بیٹا! یوں مت کرو، ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ان کو کہہ کر وہ کھجور نکلوادی اور ساتھ ہی ساتھ ایک بات یہ بھی فرمادی کہ تمہیں معلوم نہیں کہ ہم صدقہ نہیں کھاتے، حالانکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ عمر کی جس منزل میں تھے، وہ جانتے نہیں تھے کہ صدقہ کس کو کہتے ہیں، اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ فرمایا تاکہ وہ بھی سنیں اور دوسرے بھی سنیں۔

بچے کی ذہن سازی کا طریقہ

تو بچہ اگر کوئی غلط حرکت کرتا ہو مثلاً بائیں ہاتھ سے کھاتا ہو اور ہم دیکھ رہے ہوں تو پھر ہم کو چاہیے کہ اس کو کہیں کہ بیٹا! اس طرح نہیں کھایا جاتا ہے بلکہ دائیں ہاتھ سے کھاتے ہیں اور دائیں ہاتھ سے کھانا یہ مسلمان کا طریقہ ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتلایا ہوا ادب ہے۔ اور بائیں ہاتھ سے کھانا غیر مسلموں کا طریقہ ہے۔ یہ چیز بچے کو بتلادی جائے اگر بائیں ہاتھ سے پانی پیتا ہے تو اس کو محبت اور شفقت سے منع کردو، اس کو ڈانٹنے اور پھٹکارنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس کو محبت کے ساتھ بتاؤ اور سمجھاؤ اور کہو کہ بائیں ہاتھ سے غیر مسلم پیتے ہیں، ہم مسلمانوں کا طریقہ یہ ہے کہ دائیں ہاتھ سے پیتے ہیں۔ اس طرح بتانے سے بچپن ہی سے ان کے ذہن میں یہ چیز بیٹھے گی کہ اسلامی طریقہ دائیں ہاتھ سے پینا ہے۔ صرف اتنا ہی نہ کہے کہ دائیں ہاتھ سے پینا ہے بلکہ اس کو اس طرح کہنا چاہیے کہ دائیں ہاتھ سے پینا یہ اسلامی طریقہ ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بتلایا ہوا ادب ہے، یہ بھی اسلامی تعلیم ہے، اور بائیں ہاتھ سے کھانا اور پینا غیروں کا طریقہ ہے۔ تو بچپن سے اس کے ذہن میں ایک بات بیٹھے گی، اگر بائیں سے روک کر دائیں میں دیدیں گے تو عادت تو پڑے گی، لیکن ذہن میں یہ نہیں بیٹھے گا کہ یہ اسلامی طریقہ ہے۔

اس لئے ہمیں بھی چاہیے کہ اگر بچے کو کوئی چیز دے رہے ہیں اور وہ بچہ اس چیز کو لینے کے لئے بایاں ہاتھ بڑھاتا ہے تو مت دو، بلکہ اس کو محبت سے کہو کہ بیٹا! دائیں ہاتھ سے لو؛ یہ اسلامی طریقہ ہے۔ مسلمانوں کا طریقہ یہ ہے کہ مسلمان دائیں ہاتھ سے لیتا ہے اور غیر مسلم بائیں ہاتھ سے لیتے ہیں، کوئی چیز لینی ہو یا دینی ہو تو وہ دائیں ہاتھ سے لینی اور دینی چاہیے، یہ اس کو بتلایا جائے، اس طرح کرنے سے جہاں اس کو تعلیم ملے گی؛ وہیں اس کی تربیت بھی ہوگی اور یہ چیز ذہن کے اندر بیٹھے گی۔ اگر اس طرح دو تین مرتبہ بھی اس کو کہیں گے تو وہ چیز ہمیشہ کے لئے موت تک اس کے ذہن میں بیٹھ جائے گی کہ اسلامی طریقہ یہ ہے کہ دائیں ہاتھ سے کھائے اور دائیں ہاتھ سے پئے، دائیں ہاتھ سے کوئی چیز لے اور دے۔

غفلت سے باز آیا جفا کی

بہر حال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ محبت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کو کسی غلط چیز کے معاملہ میں ٹوکا نہ جائے، ہاں یہ ہے کہ پٹائی نہ کی جائے اس لئے کہ ویسے بھی پٹائی کرنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کہیں گے تو سختی کے ساتھ کہیں گے، اور نہیں کہیں گے تو بالکل ہی نہیں کہیں گے:-

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ❁ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

ایسا معاملہ ہے، اگر نہیں کہیں گے تو بالکل نہیں کہیں گے، اور کہیں گے تو ڈھیلا اور پتھر مار کر کہیں گے۔ بھائی! نبی کریم ﷺ نے محبت بھرا جو طریقہ بتلایا وہ ہمارے سامنے ہے۔ آپ ﷺ نے کیسے اچھے انداز سے فرمایا وہ دوسری روایت میں بھی آگے آرہا ہے۔

بچوں کو اپنے ساتھ کھانے بٹھایئے

۲۹۹. عن أبی حفص عُمَربنِ أبی سَلَمَةَ عبدالله بن أبی الأَسَدِرَبِیبِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ قَالَ: کُنتُ غُلاماًفِیْ حِجْرِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ، وَکَانَتْ یَدِیْ تَطِیْشُ فِی الصَّحْفَةِ،فَقَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: یَاغُلامُ!سَمِّ اللهَ تعالیٰ، وَکُلْ بِیَمِیْنِکَ،وَکُلْ مِمَّایَلِیْکَ. فَمَازَالَتْ تِلْکَ طِعْمَتِیْ بَعْدُ(متفق علیہ) تَطِیْشُ: تَدُوْرُفِیْ نَوَاحِی الصَّحْفَةِ.

حضرت عمر بن اُبی سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں چھوٹا بچہ تھا اور نبی کریم ﷺ کی پرورش میں تھا اور حضور ﷺ جب کھانے کے لئے بیٹھتے تو مَیں بھی ساتھ میں بیٹھتا تھا، اور میرا ہاتھ پلیٹ کے اندر سب طرف گھومنے لگتا تھا، تو نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ اے بچے! بسم اللہ پڑھو، اور دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔ حضرت عمر بن اُبو سلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد سے کھانے کا میرا طریقہ ہمیشہ کے لئے یہی ہو گیا۔

افادات:- حضرت عمر بن اُبی سلمہ رضی اللہ عنہ اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اگلے شوہر کے صاحبزادے تھے۔ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح جب نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہوا تو ان کے بیٹے عمر اور ان کی بیٹی زینب وغیرہ؛ چھوٹے چھوٹے تھے وہ بھی ان کے ساتھ تھے، اور یہ بچے نبی کریم ﷺ کی پرورش میں آئے۔ حضرت عمر بن اُبی سلمہ فرماتے ہیں کہ مَیں چھوٹا بچہ تھا اور نبی کریم ﷺ کی پرورش میں تھا اور حضور ﷺ جب کھانے کے لئے بیٹھتے تو مَیں بھی ساتھ میں بیٹھتا تھا۔

دیکھو! اس حدیثِ مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ کھانے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے معاشرے اور سماج میں بعض لوگوں کا مزاج یہ بھی ہوتا ہے کہ باپ کھانے کے لئے بیٹھتا ہے تو چھوٹی اولاد کو ساتھ میں کھانا کھانے کے لئے نہیں بٹھاتا بلکہ یوں کہتا ہے کہ اس کو کھلا دینا، یہ خواہ مخواہ شور کرتا ہے، ہمیں کھانے

نہیں دیتا ہے اور پریشان کرتا ہے۔ ارے بھائی! آپ کو تو اس کی تربیت کرنی ہے، آپ جب کھانے کے لئے بیٹھیں تو اپنے بچوں کو ساتھ لے کر بیٹھئے، چاہے وہ شور کرتے ہوں، کھانے نہ دیتے ہوں؛ تب بھی ان کو اپنے ساتھ بٹھائیے، اس لئے کہ اگر آپ ان کو اپنے سامنے بٹھا کر نہیں کھلائیں گے تو کھانے کا جو اسلامی طریقہ اور انداز ہے اور کھانے کے جو آداب ہیں وہ ان کو کون بتلائے گا؟ اگر آپ نے کہہ دیا کہ اس کو اکیلے کھانا دیدینا، وقت پر اس کو کھلا دینا، میرے ساتھ اس کو مت بٹھانا؛ تو آپ کو پوری زندگی پتہ ہی نہیں چلے گا کہ بیٹے نے کھانے کا اسلامی طریقہ سیکھا یا نہیں پھر ہم اپنی ذمہ داری کیسے پوری کریں گے؟ اپنے ساتھ بٹھائیں گے تب ہی پتہ چلے گا کہ وہ بسم اللہ پڑھتا ہے یا نہیں، دائیں ہاتھ سے کھاتا ہے یا نہیں کھاتا، وہ لقمہ کس طرح اُٹھاتا ہے اور کہاں سے اُٹھاتا ہے، نیچے اگر گراتا ہے تو اس موقع پر کیا تلقین و تعلیم دینی چاہیے؛ وہ ہم اس کو بتائیں گے۔ اس لئے اگر ہم اپنے ساتھ ان کو بٹھا کر کھلائیں گے تو دو چار روز کے واسطے تکلیف تو ہوگی لیکن آئندہ وہ سدھر جائے گا اور اس کی تربیت ہو جائے گی اب اگر وہ بچہ کسی دوسرے کے گھر گیا اور وہاں کھانے کے لئے بیٹھے گا اور اس کا طریقہ لوگ دیکھیں گے، تو لوگ خوش ہو جائیں گے اور وہ کہیں گے کہ اس کے ماں باپ نے اس کی بہت اچھی تربیت کی ہے اور اگر ہم اس کو اپنے ساتھ نہیں بٹھائیں گے تو وہ نہیں سیکھے گا، اور اب اگر وہ کسی دوسرے کے گھر پہنچ گیا اور جب آپ خود اپنا بچہ، اپنا بیٹا اور اپنا لاڈلا ہونے کے باوجود اس کی ان حرکتوں سے عاجز تھے اور آپ کو اس کی حرکتیں ناگوار تھیں، تو جب دوسرے کے دسترخوان پر وہ ایسی حرکت کرے گا تو وہ لوگ بچے کے متعلق تو کچھ کہیں یا نہ کہیں، لیکن آپ کے متعلق رائے ضرور قائم کریں گے کہ بھائی! اس کے ماں باپ نے اس کو کھانے پینے کا

طریقہ نہیں بتلایا۔اس لئے یہ بہت اہم چیز ہے۔

تین آداب

دیکھو! حضرت عمر بن اَبوسلمہ نبی کریم ﷺ کے بیٹے نہیں تھے، ہاں! حضور کے پرورده تھے،آپ کی اہلیہ اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے تھے اور یتیم تھے، آپ ﷺ کی پرورش میں تھے،ان پر آپ کتنی نگرانی کررہے ہیں اوران کی کیسی تربیت کررہے ہیں،آپ ﷺ تو یتیم کی تربیت اتنی کررہے ہیں اور ہم اپنے بیٹے کی ایسی تربیت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں حضرت عمر بن اَبوسلمہ فرماتے ہیں کہ میرا ہاتھ پلیٹ کے اندرسب طرف گھومنے لگا (عام طور پر بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ یہاں سے ایک لقمہ مارا، پھراُدھر سے اُٹھایا) مجھےاس طرح کرتا ہوادیکھ کر حضور ﷺ نے تین نصیحتیں فرمائیں، کھانے کے تین آداب بتلائے (۱) اے بچے! کھانے کے شروع میں اللہ تعالیٰ کا نام لو، بسم اللہ پڑھو (۲) دائیں ہاتھ سے کھاؤ (۳) اپنے سامنے سے کھاؤ، چاروں طرف ہاتھ مت مارو۔حضورِاکرم ﷺ نے یہ تین آداب ان کو بتلائے

حضراتِ صحابہ کی ایک خصوصیت

اس وقت حضرت عمر بن اَبوسلمہ بچے تھے، ہمارا تو بڑوں کا حال یہ ہے کہ ہم کو جب تنبیہ کی جاتی ہے تو ہم بھول بھال جاتے ہیں، لیکن حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی یہ خصوصیت تھی کہ چھوٹا ہو یا بڑا، مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام؛ حضور ﷺ کی طرف سے اگر ایک مرتبہ تنبیہ کردی گئی تو زندگی بھر کے لئے وہ یاد رکھ لیتے تھے، بعد میں پھر کبھی چوک نہیں ہوتی تھی۔ اب تو بڑوں کا حال یہ ہے کہ بار بار ٹوکا جاتا ہے تب بھی اپنی اس

حالت اور بگاڑ کو درست کرنے کا نام نہیں لیتے، لیکن حضرت عمر بن اُبوسلمہ فرماتے ہیں ﴿فَمَازَالَتْ تِلْکَ طِعْمَتِیْ بَعْدُ﴾ ﴿طِعْمَۃٌ﴾یہ ﴿فِعْلَۃٌ﴾ کے وزن پر ہے۔ عربی زبان میں کسی چیز کی خاص ہیئت اور طریقہ بتلانے کے لئے آتا ہے۔ تو حضرت عمر بن اُبوسلمہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد کھانے کا میرا طریقہ ہمیشہ کے لئے یہی ہوگیا کہ کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھتا، دائیں ہاتھ سے کھاتا، اور اپنے سامنے سے کھاتا۔

دیکھو! اس وقت حضرت عمر بن اُبوسلمہ چھوٹے بچے تھے، لیکن ایک مرتبہ حضور ﷺ نے تنبیہ فرمادی، بس! اس کی گرہ باندھ لی اور پھر ہمیشہ کے لئے اسی پر عمل کرنے لگے۔ بچے اپنے سے بڑوں کو دیکھتے ہیں اور ان سے سیکھتے بھی ہیں اور جو بتایا جاتا ہے اس کو اخذ بھی کرتے ہیں، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بچپن ہی سے ان کو عادت ڈالنی چاہیے، اس معاملہ میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ یہاں حضور ﷺ نے یہ نہیں سوچا کہ یہ ابھی چھوٹے ہیں، جب بڑے ہوں گے تو بتادیا جائے گا اور وہ اس وقت سمجھ جائیں گے۔

ہر شخص ذمہ دار ہے

۳۰۰. وعن ابن عمر رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسولَ اللہِ ﷺ یَقُوْلُ: کُلُّکُمْ رَاعٍ، وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہِ. اَلامَامُ رَاعٍ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہِ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِیْ أَھْلِہٖ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہِ، وَالْمَرْأَۃُ رَاعِیَۃٌ فِیْ بَیْتِ زَوْجِھَا وَمَسْئُوْلَۃٌ عَنْ رَعِیَّتِھَا، وَالْخَادِمُ رَاعٍ فِیْ مَالِ سَیِّدِہٖ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہِ، فَکُلُّکُمْ رَاعٍ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہِ. (متفق علیہ)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کے ماتحت کے متعلق کل قیامت میں پوچھا جائے گا، پورے ملک کا حاکمِ اعلیٰ پورے ملک کا ذمہ دار ہے، اور اس سے قیامت کے روز پورے ملک کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اور مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے اس سے گھر والوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اور عورت؛ شوہر کے گھر کی چیزوں کی ذمہ دار ہے،

اس سے وہ سب چیزوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اور خادم یعنی نوکر اپنے آقا کے مال کا ذمہ دار ہے، اس سے کل قیامت میں اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور اپنے ماتحت کی جو ذمہ داری اس کے حوالہ کی گئی ہے اس کے متعلق اس سے سوال کیا جائے گا۔

افادات: — ﴿رَاعٍ﴾ یعنی دیکھ ریکھ رکھنے والا۔ تم میں سے ہر ایک دیکھ ریکھ رکھنے والا ذمہ دار اور جواب دار ہے اور تم میں سے ہر ایک سے جس کی جو ذمہ داری اور جواب داری ہے، اور جو اس کے ماتحت ہیں ان کے متعلق کل قیامت میں پوچھا جائے گا کہ تم نے ان کو تعلیم اور تربیت دی یا نہیں۔ بچے کے متعلق یہ نہیں پوچھیں گے کہ اس کے لئے آپ دوکان چھوڑ کر آئے یا نہیں؟ مکان چھوڑ کر آئے کہ نہیں؟ بینک بیلنس اس کو دے کر آئے یا نہیں؟ کار خرید کر اس کو دے کر آئے یا نہیں؟ یہ نہیں پوچھا جائے گا؛ بلکہ یہ پوچھا جائے گا کہ آپ نے اس کو دین سکھایا تھا یا نہیں؟ تعلیم دی تھی یا نہیں؟ تربیت کی تھی یا نہیں؟

اور آپ دوکان و مکان کچھ بھی چھوڑ کر نہ جاویں، کل کو کوئی بچہ آپ کے خلاف یہ دعویٰ دائر نہیں کر سکتا کہ باری تعالیٰ! میرے ابا میرے لئے دوکان چھوڑ کر نہیں گئے تھے، بینک بیلنس چھوڑ کر نہیں گئے تھے، مجھے کار بھی دے کر نہیں گئے تھے۔ بالفرض اگر ایسا دعویٰ وہاں کرے گا تو بھی اس کی شنوائی ہونے والی نہیں ہے۔ لیکن ہاں! یہ کہے گا کہ باری تعالیٰ! میرے ابا نے مجھے آپ کے احکام سے واقف نہیں کیا، کون سے کام کرنے تھے اور کن چیزوں سے بچنا تھا، نماز کا طریقہ اور دین کی ساری چیزیں مجھے نہیں سکھائیں۔ اگر دین نہیں سکھایا ہے تو کل قیامت میں وہ دامن پکڑے گا، چاہے آپ اس کے لئے کروڑوں روپے چھوڑ کر اِس دنیا سے گئے ہوں۔ یہ یاد رہے کہ قیامت میں اس ذمہ داری کے متعلق سوال ہوگا۔

﴿اَلامَامُ رَاعٍ﴾ پورے ملک کا حاکمِ اعلیٰ پورے ملک کا ذمہ دار ہے، اور اس سے قیامت کے روز پورے ملک کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

﴿وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِیْ أَهْلِهٖ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ﴾ مرد: اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، گھر میں جتنے افراد بیوی بچے وغیرہ اس کی ماتحتی میں ہیں، وہ ان سب کا ذمہ دار ہے اور کل کو قیامت میں ان سب کے متعلق اس سے سوال کیا جائے گا۔

﴿وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِیْ بَيْتِ زَوْجِهَا وَمَسْئُوْلَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا﴾ عورت: شوہر کے گھر کی چیزوں کی ذمہ دار ہے، اور جو بچے اس کی پرورش میں ہیں ان کی ذمہ دار ہے، اور کل کو قیامت میں ان سب کے متعلق اس سے سوال کیا جائے گا۔

﴿وَالْخَادِمُ رَاعٍ فِیْ مَالِ سَيِّدِهٖ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ﴾ اور خادم یعنی نوکر اپنے آقا کے مال کا ذمہ دار ہے۔ آپ نے اپنے گھر میں یا اپنی فیکٹری میں یا اپنی دوکان میں جس کو نوکر رکھا ہے اور دوکان کا مال، یا جو چیزیں اور جو کام اس کے حوالہ کئے ہیں، ان سب کے متعلق وہ بھی ذمہ دار ہے، اگر اس میں ذرا بھی کمی ہوگئی، یا خیانت سے کام لیا تو کل قیامت میں اس سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

﴿فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ﴾ آخر میں پھر دوبارہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور اپنے ماتحت کی جو ذمہ داری اس کے حوالہ کی گئی ہے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

تربیت نہ کرنے پر سزا ہوگی

خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم وتربیت کی ذمہ داری ہر ایک کے اوپر ہے، اور اس کا اس کو اہتمام کرنا چاہیے تاکہ کل قیامت کے روز جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے سوال کیا

جائے تو آدمی اس سے بری الذمہ ہو جائے۔ اور اگر اس نے تعلیم وتربیت کا اہتمام نہیں کیا تو کل قیامت کے روز پکڑ دھکڑ ہو جائے گی اور وہاں اس سلسلہ میں مواخذہ ہوگا اور اس ذمہ داری کے ادا نہ کرنے پر سزا بھی ہوگی۔

جیسے ہم کہتے ہیں کہ دیکھو! یہ تمہاری ذمہ داری ہے، مَیں تم سے پوچھوں گا۔ تو یہ ’’پوچھوں گا‘‘ کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ اگر اس کی ادائیگی میں تم نے کوتاہی کی تو سزا بھی دی جائے گی۔ سزا کا لفظ لاتے نہیں ہیں، لیکن ’’پوچھوں گا‘‘ کا مطلب ساری دنیا جانتی ہے۔

آقا اور سیٹھ اگر اپنے نوکر کو یوں کہے کہ دیکھو! مَیں پوچھوں گا، حساب اور جواب لوں گا تو ’’جواب لوں گا‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی کی تو تمہیں سزا ملے گی۔ اسی طرح یہاں پر بھی صرف یہ آیا ہے کہ پوچھا جائے گا، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی ادائیگی میں اگر کوتاہی ہوگی تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے ماتحتوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں جو ذمہ داری اللہ نے ہم پر ڈالی ہے اس کو سو فیصد ادا کرنے والے بن جائیں اور اس امانت کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور پورے طور پر پیش کر سکیں۔

تعلیم وتربیت کی عمر

۳۰۱۔ عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: مُرُوْا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلٰوةِ وَهُمْ أَبْنَآءُ سَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَآءُ عَشْرٍ، وَفَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِى الْمَضَاجِعِ.
(حدیث حسن، رواہ ابوداود باسنادٍ حسنٍ)

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو، حال یہ کہ وہ سات سال کے ہوں اور دس سال کا ہونے پر اگر نماز نہیں پڑھیں تو پھر ان کی پٹائی کرو۔ اور ان کے بستر الگ کر دو۔

افادات:- بچہ چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی؛ جب سات سال کی عمر کو پہنچ جائے تو ماں باپ کو چاہیے کہ اس کو نماز کے لئے کہیں کہ بیٹا! نماز پڑھو، کہتے رہیں اور تلقین کرتے رہیں، وہ اگر نہیں پڑھتا، کبھی چھوڑ دیتا ہے اور کبھی گُلّی مار دیتا ہے تو اس پر اس کو مارنے اور سزا دینے کی ضرورت نہیں ہے یعنی اس کو کہنا شروع کریں اور اس کو سمجھائیں۔

اور یہ بات یاد رہے کہ سات سال سے پہلے نہ کہیں۔اسی سے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ بچہ جب سات سال کا ہوتا ہے تب ہی اس کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے،اس سے پہلے تعلیم وتربیت کا بوجھ اس پر نہیں ڈالنا چاہیے۔بعض ماں باپ اس سے پہلے ہی تعلیم کے لئے بٹھا دیتے ہیں اور تعلیم کا بوجھ ڈال دیتے ہیں، ہاں!اگر کھیل کھیل میں اس کو دو چار باتیں بتا دی جائیں؛تو بات دوسری ہے۔لیکن سات سال سے پہلے باقاعدہ اس کو تعلیم کے لئے بٹھانا؛تو اکثر علماء فرماتے ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔چنانچہ اس حدیثِ شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم وتربیت کا سلسلہ سات سال کی عمر میں شروع ہوتا ہے۔

پھر اس سے چھٹی ملنے والی نہیں

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے آپ بیتی میں لکھا ہے کہ مَیں چھوٹا تھا تو والد صاحب نے مجھے پڑھنے میں نہیں لگایا تھا، ہمارے گھر کی عورتیں دادی وغیرہ میرے والد صاحب کو تنبیہ کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ یہ اتنا بڑا ہو گیا،اس کو کچھ کہتے ہی نہیں ہو؟ تو والد صاحب یوں فرمایا کرتے تھے کہ جب اوکھلی میں سر دے گا تو پھر قبر کے علاوہ نکلنے والا نہیں ہے۔مطلب یہ ہے کہ جب ایک مرتبہ تعلیم میں لگا دیں گے تو پھر اس سے چھٹی ملنے والی نہیں ہے،ابھی کھیلنے کا وقت ہے؛ کھیل لینے دو۔کہنے کا حاصل یہ ہے کہ سات

سال کا بچہ ہوتو تعلیم وتربیت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔

پٹائی کے لئے بھی حدود متعین ہیں

﴿وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَآءُ عَشْرٍ﴾ اوردس سال کا ہونے پر اگرنماز نہیں پڑھے تو پھراس کی پٹائی کرو۔ معلوم ہوا کہ دس سال سے پہلے نماز نہ پڑھنے پر پٹائی کی بھی اجازت نہیں ہے، اسلئے کہ سات سال کا ہونے پرنماز کے لئے کہنے کا حکم دیا، لیکن اگراس وقت کسی وجہ سے نماز نہیں پڑھی، تو آپ اپنے ساتھ لے جایئے اور پڑھایئے، لیکن آپ کسی جگہ گئے تھے اور تاکید کرگئے تھے کہ بیٹا! نماز پڑھ لینا، مَیں فلاں جگہ جارہا ہوں، بعد میں آکر پوچھوں گا، آنے کے بعد پوچھا تو معلوم ہوا کہ نماز نہیں پڑھی ہے تو اس سے کہو کہ تم نے نماز نہیں پڑھی ہے تو اچھا چلو! اب دو رکعت قضا کرلو، یوں کہہ سکتے ہیں لیکن پٹائی نہ کی جائے۔

اور حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ دس سال کا ہوجانے پر اگر نماز نہیں پڑھتا تو اس صورت میں اس کی پٹائی کرو۔ تو دیکھو! حضور ﷺ خود پٹائی کا حکم دیتے ہیں، البتہ پٹائی کے لئے شریعت نے حدود متعین اور مقرر کئے ہیں کہ اگرکسی بات پر بچے کی پٹائی کی جائے تو ایسی کی جائے جس سے اس کے جسم پر کوئی نشان نہ پڑے۔ مارنے کے متعلق ایک ہدایت تو یہ ہے کہ چہرے پر نہ مارا جائے، دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہاتھ یا لکڑی سے مارا ہے تو ایسی سخت مار نہ ہو کہ اس کے جسم پر نشان پڑجائیں اور تین سے زیادہ مارنے سے منع کیا ہے۔ بہرحال! مارنے کے لئے یہ حدود مقرر و متعین ہیں، اس سے زیادہ کی ماں باپ اور استاذ کسی کو بھی اجازت نہیں ہے۔ کتابوں میں منع لکھا ہے۔ اگر یہاں مدرسہ کے مولوی صاحبان

ہوں گے تو ناراض ہو جائیں گے کہ دیکھو مفتی صاحب کیسا مسئلہ بیان کر رہے ہیں۔

بہرحال! نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ دس سال کا ہو جائے تو نماز نہ پڑھنے پر اس کی پٹائی کرو، اس سے معلوم ہوا کہ بچے کو نماز کی خصوصی تاکید کرنی چاہیے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں قابلِ توجہ ہیں، اور بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

اب ان کے بستر بھی الگ کر دو

اور حدیثِ شریف میں ایک حکم یہ بھی ہے ﴿وَفَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ﴾ اور ان کے بستر الگ کر دو۔ بستر الگ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی جب چھوٹے دو تین سال کے ہوتے ہیں؛ تو ساتھ ہی سوتے ہیں، لیکن جب وہ دس سال کے ہو جائیں، چاہے لڑکا اور لڑکی سگے بھائی بہن کیوں نہ ہوں، اب ان کو ایک بستر پر نہ سلایا جائے۔ ماں باپ کو چاہیے کہ ان کا بستر الگ کر دیں، کیونکہ جب دس سال کی عمر ہو گئی تو اس میں پھر خواہشات آنے لگتی ہیں اور بے خبری اور نادانستگی میں بھی کبھی کوئی غلطی ہو سکتی ہے، اس لئے لڑکے اور لڑکی کا بستر الگ کرنا چاہیے۔

بچوں کو نماز سکھاؤ

۳۰۲. وعن أبی ثُرَيَّةَ سَبُرَةَ بْنِ مَعْبَدِ الْجُهَنِيِّ رضی اللہ عنہ قالَ قالَ رسولُ اللہِ ﷺ: عَلِّمُوْا الصَّبِيَّ الصَّلٰوةَ لِسَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوْهُ عَلَيْهَا ابْنَ عَشْرِ سِنِيْنَ. (حديث حسن، رواه ابوداود والترمذی وقال حديث حسن.) ولفظ أبی داود: مُرُوا الصَّبِيَّ بِالصَّلٰوةِ اِذَا بَلَغَ سَبْعَ سِنِيْنَ.

حضرت ابو ثریہ سبرہ بن معبد جہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ سات سال کی عمر میں بچے کو نماز سکھاؤ اور دس سال کی عمر میں بچے کو نماز کے لئے مارو۔ دوسری روایت کے الفاظ ہیں کہ بچہ کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کا ہو جائے۔

افادات:- پہلی روایت میں یوں تھا کہ نماز کا حکم دو، اور یہاں یہ آیا کہ نماز سکھاؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کو نماز سکھانی بھی چاہیے، یہ ذمہ داری ماں باپ کی ہے کہ وہ اپنے بچوں اور بچیوں کو نماز سکھائیں اگرچہ آپ نے اپنی اولاد کو مکتب میں بھیجا ہے، اور مکتب میں اس کے استاذ اس کو سکھائیں گے وہ تو اپنا کام کر ہی رہے ہیں، لیکن ہمارا بھی فریضہ اور ذمہ داری ہے کہ ہم اس کی طرف توجہ کریں کہ بچے کو نماز کا طریقہ برابر یاد ہے یا نہیں۔

میرے والد کا طرزِ تربیت

مجھے یاد ہے کہ مَیں جب چھوٹا تھا، اس وقت ہمارے یہاں گھر میں دوسرے بھائیوں کے بچے بھی تھے، تو میرے والد صاحبؒ (اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھرے۔ آمین) کھانے سے دس پندرہ منٹ پہلے ایسے ہی بغیر کھانے کے خالی دستر خوان لگوا دیتے تھے، اور بچوں کو دستر خوان پر بٹھا کر سب کی نماز سنتے، اور جب نماز پوری ہو جاتی تھی تو پھر کھانا لایا جاتا تھا اور پھر کھانے کے آداب سنتے تھے۔ یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

حاجی یوسف صاحب کا عجیب وغریب معمول

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دامت برکاتہم (رحمۃ اللہ) جو ترکیسر میں مدرس ہیں انہوں نے ایک مرتبہ سنایا کہ وہ ری یونین تشریف لے گئے تھے، اور آپ نے بھی نام سنا ہوگا کہ ری یونین میں حاجی یوسف صاحب راوت ہیں، بہت بڑے رئیس آدمی ہیں، اور وہاں ان کو گورنمنٹ کی طرف سے بھی بہت کچھ القاب ملے ہوئے ہیں اور ترکیسر کا مدرسہ جس خاندان کے ماتحت چلتا ہے اس کے بڑے یہی ہیں، اور بڑے سخی آدمی ہیں اور ری یونین میں ہماری

کمیونٹی یعنی ہندوستانی مسلمانوں میں سب سے بڑے مالداراور رئیس شمار ہوتے ہیں، ان کے یہاں کا معمول یہ ہے کہ اتوار یا جمعہ کو ان کے لڑکے اور لڑکیاں اور ان کی اولاد اور لڑکوں کی بیویاں اور لڑکیوں کے شوہر، اور ان کے چھوٹے بڑے سب بچے؛ گویا پورے خاندان کو وہ جمع کرتے ہیں، پھر پورے خاندان کو ساتھ بٹھا کر کہتے ہیں کہ میری نماز سنو، ہر ہفتہ پوری نماز اور تمام آداب وغیرہ سناتے ہیں اور پورے خاندان کے تمام چھوٹوں اور بڑوں کی نماز خود سنتے ہیں۔ اتنے بڑے رئیس آدمی جن کی لاکھوں اور کروڑوں سخاوتیں ہیں، ان کا یہ عجیب وغریب معمول ہے۔ آدمی اگر کچھ کرنا چاہے تو کوئی مشکل و پریشانی نہیں ہے۔

یہ بہانے بازیاں فضول ہیں

بعض لوگ کہتے ہیں کہ میرے پاس وقت نہیں ہے، حالانکہ کھانے کے لئے بیٹھیں گے تو باتوں باتوں میں گھنٹہ آدھ گھنٹہ دستر خوان پر نکل جاتا ہے، اگر اسی وقت کو اس کام کیلئے بھی استعمال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کاروبار میں مشغولی کی وجہ سے ہمیں فرصت ہی کہاں ملتی ہے، کھانے کا بھی وقت برابر نہیں ملتا؛ تو کیا کریں؟ نہیں بھائی! ایسا نہیں ہے۔ ''تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں'' جیسا معاملہ ہے، اگر ہم چاہیں تو سب ہوسکتا ہے۔ اتوار کو بچوں کو لے کر اُبھراٹ (ساحل سمندر پر ایک جگہ کا نام ہے) چلے جاتے ہیں، اور لوگوں کا بیان ہے کہ سورت والے وہاں بہت آتے ہیں اور اب تو بہت زیادہ لوگ جاتے ہیں اس لئے کہ وہاں واٹر پارک شروع ہوا ہے۔ عورتوں اور بچوں کو وہاں لے جاتے ہیں اور بے حیائی کی حد ہوجاتی ہے، جب بچوں کو گھمانے لے جانے کے لئے ہمارے پاس وقت ہے اور اس کو ہم اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں؛ تو ان

کی نماز سننے کا کیا ہمارے پاس وقت نہیں ہے؟ اس لئے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔
اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حَقُّ الْجَارِ وَالْوَصِيَّةُ بِهٖ

پڑوسیوں کے حقوق کی تاکید

۱۵/ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ ﷽ ۳/اپریل ۱۹۹۹ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً۔أمابعد

أعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم.

وَاعْبُدُوْااللّٰہَ وَلاتُشْرِکُوْابِہٖ شَیْئًاوَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَاناًوَّبِذِی الْقُرْبیٰ وَالْیَتَامیٰ وَالْمَسَاکِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبیٰ وَالْجَارِالْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَمَامَلَکَتْ أَیْمَانُکُمْ (النسآء:۳۶)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے کہ پڑوسی کے کیا حقوق ہیں اور پڑوسی کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ نے کیا تاکیدیں اور ہدایتیں ارشادفرمائی ہیں کہ ان کے ساتھ کس طرح معاملہ وسلوک کرنا چاہیے۔

انسانی فطرت

اللہ تعالیٰ نے انسان کوفطری طور پرایسابنایاہے کہ وہ اکیلا زندگی نہیں گذارسکتا بلکہ زندگی گذارنے کے لئے فطری اورطبعی طورپرانسان کا نیچراس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ مل کررہے۔’’انسان‘‘لفظِ اُنس سے بناہےاوراُنس کا مطلب ہے مانوس ہونا،انسانوں کے ساتھ مل جل کررہنا۔تواللہ تعالیٰ نے انسان کوفطری طورپرایسابنایاہے کہ وہ تنہازندگی نہیں گذارسکتا بلکہ زندگی گذارنے کے لئے اس کواپنے ہی ہم جنسوں کی ضرورت پڑتی ہے،یہ تووحشی جانوروں کامزاج اورطبیعت ہے کہ وہ الگ الگ رہتے ہیں۔

اسلام میں رہبانیت نہیں ہے

بلکہ لوگوں کے ساتھ مل جل کر ان کے درمیان رہنے کی حدیثِ پاک میں فضیلت آئی ہے، مشکوٰۃ شریف میں روایت ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ مؤمن جو لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے اور ان کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں اور ایذاؤں کو برداشت کرتا ہے وہ اس مؤمن سے بہتر ہے جو تنہا رہتا ہے اور لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں اور ایذاؤں کو برداشت نہیں کرتا۔ جب لوگوں کے ساتھ مل کر رہیں گے تو ان کی طرف سے تکلیفیں تو پہنچنے ہی والی ہیں، اور ان کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں اور ایذاؤں کو برداشت کرنا یہ اعلیٰ درجہ ہے، اسی لئے شریعت نے رہبانیت کی اجازت نہیں دی یعنی لوگوں سے الگ تھلگ رہنا جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے بنی اسرائیل کا ایک خاص مزاج تھا کہ وہ لوگ تنہائی اختیار کرلیا کرتے تھے، اسلام نے اس طریقہ کو پسند نہیں کیا بلکہ معاشرہ اور سماج میں رہ کر زندگی گذارنے کو تنہا رہنے کے مقابلہ میں ترجیح دی ہے۔

معاشرت

تو مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہے، مثلاً گھر میں ہے تو ماں باپ کے ساتھ، بیوی بچوں کے ساتھ، بھائی بہنوں کے ساتھ، گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ ہوگا، پھر پڑوسی اور محلّہ اور بستی والے ہیں اپنے کاروبار کے لئے دوکان پر جائے گا تو وہاں گاہکوں کے ساتھ واسطہ پڑے گا اور کارخانہ جائے گا تو بازار میں جو ہم پیشہ لوگ ہیں ان کے ساتھ واسطہ

پڑے گا،ٹرین یابس یااورکسی ذریعہ سے سفرکرتا ہےتواوربھی بہت سارے لوگ ساتھ ہوتے ہیں جن سے اس کو واسطہ پڑتا ہے،تواس طرح مختلف اوقات میں زندگی کے مختلف مرحلوں اورمواقع پرمختلف لوگوں کے ساتھ جوواسطہ پڑتا ہےاس وقت ان کے ساتھ وہ کس طرح سے پیش آتا ہے،اسی کوشریعت میں معاشرت سے تعبیرکیا جاتا ہے، معاشرت یہی ہے کہ ہم جس جگہ بھی ہوں وہاں اپنے آس پاس کےلوگوں کےساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے،شریعت میں اس کی باقاعدہ تفصیل بتلائی گئی ہے کہ کس کے ساتھ کیسے معاملہ کرنا چاہیے، اور یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جوآیت پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اختصار کےساتھ اس کی طرف متوجہ کیااور نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشادات کےذریعہ سےاس کی تفصیل بتائی۔

دین کےکل پانچ شعبے ہیں

آج کل ہم لوگوں نے دین کےاندر سےمعاشرت کونکال کر باہر پھینک دیا ہے، ہم یوں سمجھتے ہیں کہ عبادات کااہتمام کرلیناہی دین ہے،حالانکہ دین کےکل پانچ شعبے ہیں ایک تواعتقادیات کاشعبہ ہےیعنی آدمی کاعقیدہ درست ہو۔عبادات کا شعبہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کاتعلق اوراللہ تعالیٰ کےحقوق اداکرتے ہوئے اس کاقرب ونزدیکی اورخوشنودی حاصل کرنا،اس کی محبت اپنے دل میں پیدا کرنے کے لئے اوراس کوراضی کرنے کے لئے کام کرنا۔اس کےعلاوہ معاملات،معاشرت اوراخلاق؛ یہ تین شعبے ہیں۔تومعاشرت بھی دین کابڑااہم شعبہ ہے،اورنبی کریم ﷺ نے معاشرت والے شعبہ سےتعلق رکھنے والی بہت ساری باتیں ارشادفرمائی ہیں اوران کی تعلیم دی ہے، بلکہ یوں سمجھئے کہ عبادات کاتعلق اللہ تعالیٰ کی ذات کےساتھ ہونے کی وجہ سےآپ کےدین

کے متعلق لوگ کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے ،یعنی آپ نماز پڑھ رہے ہیں تو وہ مسجد میں ادا کی جاتی ہے،آپ روزہ رکھ رہے ہیں تو آپ کا دل جانتا ہے،زکوۃ ادا کریں گے تو کسی مسکین کو مال پہنچادیں گے،لیکن لوگوں کے ساتھ آپ کا سلوک کیسا ہے،وہ لوگوں کے ساتھ میل جول سے پتہ چلے گا اوراسی کو دیکھ کر دوسرے لوگوں پر اسلامی اخلاق کا اثر پڑتا ہے اوراسلامی تعلیمات اجاگر ہوتی ہیں۔

اسلام کا اہم شعبہ

آج کل ہمارے اندر سے معاشرت کے آداب اور معاملات کی درستگی نکل گئی؛ اسی لئے اسلام کا جو اثر غیروں پر ہونا چاہیے وہ نہیں ہوتا ہے۔ ہمارے اسلاف تجارت کی غرض ہی سے نکلے تھے لیکن ان کے معاملات اور معاشرت ہی سے غیر قومیں متأثر ہوئیں،چین میں اسلام تاجروں کے ذریعہ سے پہنچا،وہاں مسلمان تجارت کے لئے گئے تھے لیکن انہوں نے تجارت اسلامی اصول کے مطابق کی تو اس کو دیکھ کر وہاں کے لوگ اسلام لے آئے۔

بہرحال! معاشرت؛اسلام کا بڑا اہم شعبہ ہے اوراس کا اہتمام کرنا ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے،اس میں کوتاہی کے نتیجہ میں بندوں کے حقوق آدمی پر باقی رہ جاتے ہیں اور یہ معاملہ بڑا خطرناک ہے،بندوں کے حقوق اگر باقی رہ جائیں گے تو جب تک بندے معاف نہیں کریں گے،وہاں تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی معافی نہیں ملے گی۔تو یہاں اسی معاشرت سے تعلق رکھنے والا ایک جزو''پڑوسی کے حقوق'' کو بتایا جاتا ہے کہ پڑوسی کے حقوق کیا ہیں؟اور پڑوسی کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کی طرف سے دی گئی تاکیدیں کیا کیا ہیں؛انہیں کو بیان کریں گے۔

آیت کا ترجمہ وتفسیر

سب سے پہلے تو قرآنِ پاک کی آیت پیش کی ہے: ﴿وَاعۡبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا﴾ آگے جو ہدایتیں دی جارہی ہیں اس کی ابتدا ہی اس بات سے کی کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کو ایک مانو۔ یہاں عبادت سے مراد اللہ تعالیٰ کی توحید کا حکم ہے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ گویا آگے جو ہدایتیں دی جارہی ہیں وہ شرک سے براءت اور توحید کا تقاضہ ہیں۔ جو آدمی اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرے گا؛ وہی دوسرے انسانوں کے حقوق کی ادائیگی کا بھی اہتمام کرے گا، اور جو سب سے بڑا محسن ہے اور جس نے زندگی عطا فرمائی اور ساری نعمتوں سے نوازا، اس کے حقوق کی ادائیگی میں جو آدمی کوتاہی کرے گا، اس کی توحید کا اقرار نہیں کرے گا، دوسروں کو اس کے ساتھ شریک کرے گا؛ تو بھلا وہ دوسرے انسانوں اور جانوروں کے حقوق کیا ادا کرے گا؟ اس لئے توحید کی تعلیم سے ابتدا کی۔

پھر آگے فرمایا: ﴿وَبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا﴾ ماں باپ کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے بعد ظاہری اعتبار سے انسان پر اگر کسی کا سب سے بڑا احسان ہے تو وہ اس کے ماں باپ کا ہے کہ دنیا میں اس کے وجود میں آنے کا ظاہری ذریعہ یہی بنے ہیں، اور پھر اس کے بڑے اور جوان ہونے تک ماں باپ ہی نے اس کی تعلیم وتربیت اور پرورش کیلئے بڑی محنتیں اور مشقتیں برداشت کیں، اس لئے ان دونوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرو۔

﴿وَبِذِی الۡقُرۡبٰی﴾ اور رشتہ داروں کے ساتھ احسان کا سلوک کرو۔

﴿وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنِ﴾ اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی بھلائی کرو۔

قریب اور دور کے پڑوسی

﴿وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ﴾ اور جو نزدیک کا پڑوسی ہے اور جو دور کا پڑوسی ہے؛ ان دونوں کے ساتھ بھی احسان کا سلوک کرو۔ یہاں اس آیت کو اسی ٹکڑے کی وجہ سے لائے ہیں، اگرچہ اس آیت میں اور بھی بہت ساری ہدایتیں دی ہیں لیکن آگے اس پر مستقل عنوانات آنے والے ہیں، یہاں پڑوسی والا عنوان قائم کیا ہے اس سے تعلق رکھنے والے یہ جملے ہیں۔

﴿وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبىٰ﴾ ''قریب کے پڑوسی'' سے کیا مراد ہے؟ تو اس کی تعیین اور تشریح کے سلسلہ میں حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے دو قول منقول ہیں۔ بعضوں نے کہا کہ ''قریب کا پڑوسی''، یعنی جس کا مکان ہمارے مکان سے قریب ہو، اور ﴿وَالْجَارِ الْجُنُبِ﴾ ''دور کا پڑوسی''، یعنی جس کا مکان دور ہو۔ اور بعضوں نے کہا کہ ''قریب کا پڑوسی'' کا مطلب یہ ہے کہ جو پڑوسی ہونے کے ساتھ ساتھ رشتہ دار بھی ہے، اور ''دور کا پڑوسی'' کا مطلب یہ ہے کہ صرف پڑوسی ہے، رشتہ دار نہیں ہے۔

تین قسم کے پڑوسی

چنانچہ حدیثِ پاک میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پڑوسی تین قسم کے ہیں، ایک تو وہ جو صرف پڑوسی ہے، یعنی اس کا صرف پڑوس کا حق ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مثلاً کوئی غیر مسلم پڑوس میں رہتا ہے، تو اس کا صرف پڑوسی ہونے کے ناطہ سے حق ہے۔ دوسرا مسلمان پڑوسی ہے، یہاں دو حق ہیں ایک تو اس کے پڑوسی ہونے کا حق ہے اور دوسرا اس کے مسلمان ہونے کا حق ہے، اسلامی بھائی چارگی کا تقاضہ بھی کچھ اور ہے اور

تیسرا پڑوسی وہ ہے جو مسلمان بھی ہے اور رشتہ دار بھی، اس صورت میں تین باتیں آ گئیں ایک تو پڑوس کا حق ہے، دوسرے اسلام کا حق ہے، تیسرے رشتہ داری کا حق ہے، اس کے تین حق عائد ہوتے ہیں۔ (شعب الایمان۔۹۵۶۰)

قرآن کی باریک بینی

﴿وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ﴾ دیکھو! اسلام نے پاس میں بیٹھنے والے ہم نشین کی کتنی زیادہ رعایت کی ہے کہ جو آپ کے پاس بیٹھتا ہے اس کے ساتھ بھی احسان کا سلوک کرو۔ اب ذرا غور کیجئے کہ ہمارا ہم نشین کون ہے؟ مثلاً آپ ٹرین یا بس یا ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہیں اور آپ کے ساتھ کوئی دوسرے بھی بیٹھے ہوئے ہیں یا مثلاً آپ اسکول و مدرسہ میں جاتے ہیں تو آپ کے ساتھ جو بیٹھتے ہیں، یا آپ تجارت کے لئے بازار اور مارکیٹ میں جاتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لئے آپ کے ساتھ جو بیٹھ رہے ہیں؛ یہ سب ﴿وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ﴾ میں آ گئے، آپ کے ہم نشین یعنی ساتھ میں بیٹھنے والے کے ساتھ بھی بھلائی اور احسان کا سلوک کرنے کا اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں حکم دیا ہے، ہم تو ان چیزوں کی طرف توجہ کرتے ہی نہیں ہیں، حالانکہ قرآن نے کتنی جزرسی سے کام لیا ہے یعنی کتنی باریک باریک باتوں کی طرف متوجہ کیا ہے کہ ماں باپ سے شروع کر کے رشتہ دار، یتیم، مسکین، پڑوسی اور اس کی بھی دونوں قسمیں، اور اس کے بعد آگے تھوڑی دیر کے لئے جس کے پاس اٹھنے بیٹھنے کی نوبت آ گئی؛ اس کا بھی حق قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے بتلایا ہے، اور ہمیں ان سب کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔

﴿وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ اور مسافر کے ساتھ بھی احسان کا سلوک کرو۔ مسافر کے ساتھ رہنا تو نہیں ہے لیکن کوئی آدمی آپ کی بستی میں آیا اور ضرورت مند ہے، تو سفر کی وجہ سے

اس کا بھی حق ہے، اس لئے کہ اجنبی ماحول ہونے کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ وہ کسی دقت وپریشانی میں مبتلا ہوتو ہمیں تاکید کی گئی کہ اس کے ساتھ خصوصی معاملہ کیجئے تاکہ اس کی پریشانی دور ہو۔

﴿وَمَامَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ اور جن کے تمہارے ہاتھ مالک ہیں یعنی غلام، باندیاں اور جانور؛ یہ سب اس میں شامل ہوگئے۔ اُس زمانہ میں آقا لوگ غلام اور باندی کے مالک ہوا کرتے تھے، اوراسی طرح سے جانوروں کے بھی مالک ہوتے ہیں؛ ان کے ساتھ بھی بھلائی اوراحسان کرنے کا قرآنِ پاک میں حکم دیا گیا ہے، جن جن کے حقوق آدمی کے اوپر آسکتے ہیں تقریباً سب کو اس آیت میں جمع کر دیا گیا ہے۔

آگے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس باب سے تعلق رکھنے والی روایتوں کو پیش کرتے ہیں:-

پڑوسی کو وارث بناڈالیں گے

۳۰۳. وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ وَ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہما قالا: قال رسول اللہ ﷺ: مَازَالَ جِبْرِيلُ يُوصِينِيْ بِالْجَارِ، حَتّٰى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ.

حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما دونوں سے یہ روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: حضرت جبرئیل علیہ السلام مجھے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی برابر تاکید کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے یہ خیال ہونے لگا کہ عنقریب وہ اس کو وارث بناڈالیں گے۔

افادات:- یعنی بار بار آتے رہے اور بتلاتے رہے اوران کی طرف سے اتنی زیادہ تاکید ہوتی رہی کہ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ کہیں کل کو یہ حکم آجائے گا کہ پڑوسی بھی تمہارے مال میں وارث ہے، اگرچہ یہ حکم ہوانہیں ہے لیکن اس سے پڑوسی کے حقوق کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آج کل ہم نے اپنے معاشرہ میں سب سے زیادہ

کوتاہی اسی معاملہ میں کررکھی ہے، پڑوسیوں کے حقوق کو تو ہم کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں، اس کی طرف تو کوئی توجہ ہی نہیں دیتے۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے اور فرشتوں کے سردار ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ جو کچھ بھی کہنے کے لئے آئیں گے وہ اپنی طرف سے تو نہیں کہیں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا پیغام ہی لے کر آئیں گے، تو وہ اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر آرہے ہیں اور حضورِ اکرم ﷺ کو بار بار تاکید کی جارہی ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پڑوسی کا حق کتنا زیادہ ہے۔

شوربہ میں پانی زیادہ ڈالو

۳۰۴. عن أبی ذر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: یَا أَبَا ذَرٍّ! اِذَا طَبَخْتَ مَرَقَةً فَأَکْثِرْ مَاءَ هَا، وَتَعَاهَدْ جِیْرَانَکَ (رواہ مسلم)

وفی روایة له عن أبی ذر رضی اللہ عنہ قال: اِنَّ خَلِیْلِیْ ﷺ أَوْصَانِیْ: اِذَا طَبَخْتَ مَرَقاً فَأَکْثِرْ مَاءَ هُ، ثُمَّ انْظُرْ أَهْلَ بَیْتٍ مِنْ جِیْرَانِکَ، فَأَصِبْهُمْ مِنْهَا بِمَعْرُوْفٍ.

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے ابوذر! جب تم شوربے والا سالن پکاؤ تو اس میں پانی زیادہ ڈالو، اور اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھو۔

دوسری روایت میں ہے: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے خلیل ﷺ نے مجھ کو تاکید فرمائی کہ جب تم شوربے والا سالن پکاؤ تو اس میں پانی زیادہ کردو اور پھر اپنے پڑوس کے گھروں کو دیکھو، اور ان کو پہنچاؤ

افادات: –شوربے والے سالن کو عربی میں "مَرَقَةٌ" کہتے ہیں۔ اس میں پانی ذرا زیادہ ڈال دو، اور اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھو یعنی شوربہ زیادہ کردو گے تو ظاہر ہے کہ سالن زیادہ ہوجائے گا اور آپ پڑوسیوں تک پہنچا سکیں گے، اگر کم ہوگا تو آپ یہ

سوچیں گے کہ یہ ہمارے لئے کافی نہیں ہوگا، اگر تھوڑا پانی اس میں ڈال دیا تو اس سے مزہ میں کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے اپنی ضرورت کے لئے بھی کافی ہو جائے گا اور پڑوسیوں تک بھی پہنچ جائے گا۔

ہنڈیا کی بھاپ بھی چغلی کھاتی ہے

پڑوسیوں کے جو حقوق ہیں ان میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ گھر میں جو کھانا یا کوئی چیز بنائی جائے تو اس کو پڑوسیوں تک پہنچاؤ، اس کی حدیثِ پاک میں تاکید آئی ہے، اور اس کی وجہ حضور اکرم ﷺ نے یہ بتائی ہے کہ اپنی ہنڈیا کی بھاپ سے پڑوسی کو تکلیف مت پہنچانا۔ یعنی جب کھانا پکنے کے قریب آتا ہے تو اس سے خوشبو پھیلتی ہے، اور وہ پکانے والے کے مکان تک محدود نہیں رہتی بلکہ ذرا آگے بڑھ کر پڑوسی کی ناک میں بھی جاتی ہے، اور چغلی کھاتی ہے کہ وہاں مچھلی، گوشت یا کباب پک رہا ہے، پڑوس میں جا کر یہ بات خوشبو نے بتائی، اور مَیں کہا کرتا ہوں کہ آج کل کوکر نے آکر تو سیٹی بھی بجانی شروع کر دی۔ حضور ﷺ نے صرف بھاپ کا فرمایا تھا اور اب تو سیٹی اتنی زور سے بجتی ہے کہ پورے محلّہ میں سنائی دیتی ہے، اس لئے اب تو وہاں تک کا خیال کرنا چاہیے۔

بہرحال! جب آپ کے یہاں کچھ پکے گا، اور وہاں آواز اور خوشبو پہنچے گی اور خاص کر اگر وہ اس حیثیت کے نہیں ہیں کہ وہ بھی ایسی چیز بنائیں اور ان کے بھی بچے ہیں تو ان کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوگی، اس لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اپنی ہنڈیا کی بھاپ سے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ مطلب یہ ہے جو پکایا ہے اس میں سے کچھ ان کے یہاں بھی بھیج دیں گے تو اب ان کو تکلیف نہیں ہوگی۔ اور اگر کچھ نہیں بھیجا اور آپ نے ہی کھا کر صاف کر ڈالا تو ان کو تکلیف ہوگی۔ اسی لئے حضور ﷺ نے یہ بھی تاکید فرمائی

ہے کہ اگر کوئی چیز خرید کر لاؤ تو چھپا کر لاؤ، اگر کھلی ہوئی لاؤ گے تو پڑوسی کے بچے بھی دیکھ لیں گے، اب آپ کو چاہیے کہ ان کو بھی دیں، اس لئے کہ جب بچوں نے دیکھا تو ان کے دل میں بھی حرص وطمع پیدا ہوگی، اور وہ اس کی ضد کریں گے، اور جب یہ چیز ان کو نہیں ملے گی تو ان کو تو تکلیف ہوگی ہی، ساتھ میں ان کے ماں باپ کو بھی تکلیف ہوگی، اس لئے کہ وہ جب اپنے بچوں کے مطالبہ کو پورا نہیں کرسکیں گے تو ان کو یہ حسرت ہوگی کہ ہمارے پاس اتنی وسعت وطاقت نہیں ہے کہ ہم اپنے بچوں کی اس خواہش کو پورا کرسکیں اور یہ چیز ان کے لئے تکلیف کا باعث ہوگی اور اس تکلیف کا ذریعہ ہم بنیں گے، اس لئے شریعت نے اس بات کی تاکید کی ہے کہ پڑوسی کو بھی دو۔

میاں صاحب کا عجیب طرزِ عمل

اور ہمارے اکابر تو اس کا اتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے کہ اللہ اکبر! ہم تو اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کرسکتے، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو میاں صاحب کے نام سے مشہور ہیں، راندیر تشریف لائے ہوئے تھے اور یہیں ان کا انتقال ہوا تو یہیں مدفون ہوئے، راندیر ہی کے قبرستان میں آپ کی قبر ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ میں سے تھے اور آج کل ہمارے مدارس میں جو سنن ابوداود پڑھائی جاتی ہے، اکثر اس کی سند انہی کے واسطہ سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتی ہے۔ ان کا پورا ہی خاندان بزرگی کے اندر دیوبند میں مشہور تھا، ان کے بھی بڑے عجیب وغریب حالات تھے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے بھی استاذ تھے اور ان کے ساتھ بڑی محبت اور بے تکلفی تھی اور کچھ تجارتی معاملہ بھی تھا۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے صاحبزادہ نے ان کے متعلق یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک

مرتبہ عصر کے بعد مَیں والد صاحب (مفتی محمد شفیع صاحبؒ) کے ساتھ ان کے یہاں ملاقات کے لئے گیا، جب ہم بیٹھے تو حضرت نے پوچھا کہ مفتی جی! آم چوسوگے؟ والد صاحب نے کہا کہ حضرت! آم اور وہ بھی آپ کے دستِ مبارک سے ملیں، تو پھر کیسے انکار کیا جاسکتا ہے۔ خیر! حضرت ایک ٹوکرے میں رکھ کر چوسنے والے آم لے آئے، اور دوسرا خالی ٹوکرا بھی ساتھ میں لائے تاکہ اس میں چھلکے اور گٹھلیاں ڈالی جائیں، جب ہم کھا کر فارغ ہوئے تو جس ٹوکرے کے اندر چھلکے اور گٹھلیاں تھیں وہ ٹوکرا والد صاحب نے باہر پھینکنے کے لئے اٹھایا، تو حضرت میاں صاحب فرمانے لگے کہ مفتی جی! چھلکے پھینکنے بھی آتے ہیں؟ والد صاحب نے کہا کہ حضرت! چھلکے پھینکنا بھی کون سا ایسا فن ہے جس کو سیکھنے کی ضرورت ہو؟ تو فرمایا کہ نہیں! یہ بھی سیکھنے کی چیز ہے، لاؤ! مَیں بتاؤں۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت نے گٹھلیاں الگ کردیں اور چھلکے الگ کردئے، اس کے بعد باہر گئے اور محلّہ کے دو تین کونوں پر تھوڑے تھوڑے چھلکے الگ الگ جگہ پر ڈالے، اور ایک جگہ پر گٹھلیاں ڈالیں۔ پھر گھر واپس آکر کہا کہ دیکھو! ہمارا یہ محلّہ غریبوں کا ہے، جب وہ لوگ ایک جگہ پر اتنی سب گٹھلیاں اور چھلکے پڑے ہوئے دیکھیں گے تو ان کو یہ خیال ہوگا کہ کسی نے اتنے سب آم کھائے ہیں اور ان کے پاس غریب ہونے کی وجہ سے اتنی مالی استطاعت نہیں ہے کہ خرید کر کھاسکیں، تو اتنی گٹھلیوں اور چھلکوں کو دیکھ کر ان کو اپنی حالتِ نایافت پر غم اور افسوس ہوگا کہ ہائے! ہمارے پاس پیسے نہ ہوئے کہ ہم بھی خریدتے، اور ان کی اس تکلیف کا ذریعہ مَیں بنوں گا۔ مفتی صاحب کے صاحبزادے لکھتے ہیں کہ حالانکہ حضرت میاں صاحب کے یہاں جتنے آم آتے تھے اس میں حضرت کا یہ معمول تھا کہ آدھے سے زیادہ تو پڑوسیوں کے بچوں کو بلا بلا کر کھلاتے رہتے تھے،

اور دوسرے مہمانوں کو کھلاتے تھے، خود تو ایک دو آم ہی کھانے کی نوبت آتی تھی، اس کے باوجود حضرت یہ فرمارہے ہیں۔

اور پھر یوں فرمایا کہ یہ چھلکے الگ الگ جگہوں پر اس لئے ڈالے کہ ہمارے محلّہ والوں کی بکریاں انہیں جگہوں پر جمع ہوتی ہیں تو وہ چھلکے ان کے کام آجائیں گے، اور جہاں گٹھلیاں ڈالی ہیں وہاں محلّہ کے غریب بچے کھیلتے ہیں، وہ اس کو توڑ کر اندر سے جو گودا نکلتا ہے اس کو سینک کر کھالیا کرتے ہیں۔ تو دیکھئے! حضرتؒ نے اس کا اتنا زیادہ اہتمام کیا۔

ہمارے اکابر دوسروں کا کتنا زیادہ خیال رکھتے تھے

دوسرا ایک واقعہ خود حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت کا مکان کچا تھا، اس کی چھت بھی کھپریل کی تھی، اور دیواریں مٹی کی تھیں اور آپ جانتے ہیں کہ بارش کا زمانہ آنے سے پہلے کھپریل کی چھت کو بھی ٹھیک ٹھاک کرنا پڑتا ہے اور مٹی کی دیواروں پر بھی کوئی آڑ رکھنی پڑتی ہے تاکہ بارش کا پانی سیدھا مٹی پر نہ لگے، ورنہ دیوار کو نقصان پہنچتا ہے۔ تو حضرت میاں صاحب کو ہر سال وہ سب ٹھیک ٹھاک کرنا پڑتا تھا، اور اس کی وجہ سے گھر کا سامان وغیرہ باہر نکالنا پڑتا تھا اور ہر سال بڑا خرچہ بھی ہوتا تھا۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مَیں نے کہا کہ حضرت! ہر سال آپ یہ زحمت اٹھاتے ہیں اور اتنا سب خرچہ بھی برداشت کرتے ہیں، اگر دس پندرہ سال کا خرچہ شمار کیا جائے تو آپ پکا مکان بنا سکتے ہیں۔ اس پر میاں صاحب نے فرمایا کہ ہاں بھائی! ہمارے بوڑھے دماغ میں تو یہ بات کبھی آئی ہی نہیں جو آپ کے دماغ کے اندر آئی۔ اور اس کے بعد یوں فرمایا کہ دیکھو! ہمارا پورا محلّہ غریبوں کا ہے اور سب کے مکانات کچے

ہیں، اگر مَیں اپنا مکان پکا بنالوں گا تو میرا پکا مکان دیکھ کر ان لوگوں کو یہ خیال ہوگا کہ ہائے! ہم تو اپنے مکان کو پکا نہیں بنا سکتے، اور اس کی وجہ سے ان کو تکلیف ہوگی۔ تو کیا یہ اچھا لگے گا کہ اپنا مکان پکا بنا کر بیٹھ جاؤں اور ان کے لئے تکلیف کا باعث بنوں۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ جب سارے محلے والوں کے مکانات پکے بن گئے؛ اس کے بعد حضرت نے اپنا مکان پکا بنایا، وہاں تک تکلیف برداشت کرتے رہے، حالانکہ حضرت کی استطاعت تھی اور بنا سکتے تھے لیکن پڑوسیوں کا اتنا زیادہ اہتمام کیا، یہ بڑی اہم چیز ہے۔

خیر! یہاں حضورِ اکرم ﷺ نے تاکید فرمائی کہ اگر آپ شوربے والا سالن پکاتے ہو تو پانی تھوڑا زیادہ ڈال دو، اور پڑوسی تک بھی پہنچانے کا اہتمام کرو۔

اللہ کی قسم! وہ آدمی مؤمن نہیں

۳۰۵. عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: وَاللّٰهِ لايُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لايُؤْمِنُ وَاللّٰهِ لايُؤْمِنُ. قِيلَ: مَن يَّارَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: الَّذِیْ لايَأْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ. (متفق علیه) وفی روایة لمسلم: لايَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لايَأْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ. (الْبَوَائِقُ): الْغَوَائِلُ وَالشُّرُوْرُ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ کی قسم! وہ مؤمن نہیں، اللہ کی قسم! وہ مؤمن نہیں، اللہ کی قسم! وہ مؤمن نہیں۔ پوچھا گیا کہ یارسول اللہ! کون؟ حضور ﷺ نے فرمایا: وہ آدمی جس کا پڑوسی اس کی ایذا رسانیوں اور اس کے شر سے مامون اور محفوظ نہ ہو۔

دوسری روایت میں فرمایا کہ ایسا آدمی جنت میں نہیں جائے گا جس کے پڑوسی اس کے شرور سے مطمئن نہ ہوں۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ جس کے پڑوسی کو اس کی طرف سے خطرہ ہے یعنی

وہ تو تکلیف نہیں پہنچاتا اور ابھی تک اس نے کچھ کیا بھی نہیں ہے، لیکن اس کا مزاج ایسا اکھڑ قسم کا ہے کہ پڑوسی کو ہر وقت یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ معلوم نہیں! یہ کب کیا کر ڈالے، جیسے بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کچھ کرتے تو نہیں ہیں لیکن ان کے حالات اور عادات کی وجہ سے ان کا پڑوسی ڈرا سہما ہوا رہتا ہے، اس کی طرف سے اطمینان نہیں ہوتا؛ ایسے آدمی کے متعلق حضور ﷺ نے تین مرتبہ قسم کھائی ﴿وَاللهِ لَایُؤْمِنُ، وَاللهِ لَایُؤْمِنُ، وَاللهِ لَایُؤْمِنُ﴾ اللہ کی قسم! وہ آدمی مؤمن نہیں، اللہ کی قسم! وہ آدمی مؤمن نہیں، اللہ کی قسم! وہ آدمی مؤمن نہیں۔

ایمان کے جانچنے کا اصل معیار

آج ہم اپنا جائزہ لیں اور اپنے متعلق سوچیں کہ ہم اپنے پڑوسیوں کے ساتھ کیا معاملہ رکھتے ہیں، ان کو ہماری طرف سے تکلیف اور ایذا پہنچتی ہے، اس کے باوجود ہماری بزرگی پر، ہمارے نمازی ہونے پر، ہمارے حاجی ہونے پر، ہمارے مولوی اور مفتی ہونے پر اور ہمارے مبلغ اور داعی ہونے پر کوئی آنچ نہیں آتی، ہمارے ایمان کے لالے پڑ رہے ہیں لیکن ہماری بزرگی قائم ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ ہم عالم ہیں، مبلغ ہیں، دیندار ہیں؛ اِن حالات کے باوجود ہماری دینداری برابر قائم رہتی ہے اور حضور ﷺ تو فرماتے ہیں کہ ایسا آدمی مؤمن ہی نہیں۔ اس لئے ایمان کے جانچنے کا اصل معیار یہ ہے۔

ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! مجھے کیسے معلوم ہو کہ مَیں اچھا ہوں یا برا؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تیرے پڑوسی یہ کہتے ہیں کہ تو اچھا ہے تو سمجھ لے کہ تو اچھا ہے۔ اور اگر تیرے پڑوسی تجھے برا کہتے ہیں تو تُو برا ہے (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر ۴۲۲۳)

حضور ﷺ نے اچھائی اور برائی کا معیار ہمیں بتلا دیا۔ بہر حال! یہ بہت اہم چیز ہے، اس

کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے، آج کل ہمارے معاشرہ میں اس کی طرف سے بڑی کوتاہی برتی جاتی ہے، بھائی! اگر پڑوسی کی طرف سے تکلیف کی کوئی بات پہنچے تو اس کو برداشت کرو اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کرو۔

ایک نرالی تعلیم

۳۰۶. وعنه ﷺ قال قال رسول الله ﷺ: يَانِسَآءَ الْمُسْلِمَاتِ! لَاتَحْقِرَنَّ جَارَةٌ لِجَارَتِهَا وَلَوْ فِرْسِنَ شَاةٍ. (متفق عليه)

حضرت ابوہریرہ ﷺ ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے مسلمان عورتو! کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لئے کسی چیز کے بھیجنے کو حقیر نہ سمجھے چاہے وہ بکری کی کُھری ہی کیوں نہ ہو۔

افادات: — چونکہ لینے دینے کا معاملہ خاص کر پڑوسیوں کے ساتھ عورتیں ہی کیا کرتی ہیں، اور عورتوں کا مزاج یہ ہے کہ کوئی اچھی چیز ہو تب ہی بھیجی جائے؛ ورنہ نہیں۔

کبھی کوئی مہمان بغیر اطلاع کے آتا ہے، ہمارے یہاں تو ایسا واسطہ پڑتا ہی رہتا ہے کہ اچانک کوئی مہمان آ گیا اور مَیں نے کہا کہ گھر کھانے چلو، اور گھر پر پہلے سے کہا نہیں تھا، اب گھر والے کہتے ہیں کہ آپ نے پہلے سے کہلوایا نہیں۔ مَیں کہتا ہوں کہ اس میں شرم کیا کرنی، جو کھانا ہم کھا رہے ہیں؛ وہی اس کو کھلائیں گے، اور اگر وہ آئندہ وقت تک رہیں گے تو ایک وقت ان کا اکرام بھی کرلیں گے، ابھی اس وقت یہی موجود ہے تو یہی کھلا دیں گے۔

تو عورتوں کا ایک مزاج ہے کہ اچھا پکے گا تو بھیجیں گی ورنہ یہ سوچ کر نہیں بھیجیں گی کہ ایسا کیا بھیجنا۔ اور زیادہ مقدار میں ہو تب ہی بھیجیں گی، تھوڑا سا ہو تو نہیں۔ حالانکہ یہ سوچ صحیح نہیں ہے۔ پڑوسی کے ساتھ آپ جو حسنِ سلوک کریں اس میں یہ نہ دیکھئے کہ مثلاً بریانی پکے گی تب ہی بھیجیں گے۔ نہیں بھائی! کڑی کھچڑی بھی بھیجو۔ اور زیادہ مقدار میں

ہوتب ہی بھیجیں گے ایسا مت سوچئے، بلکہ قلیل مقدار میں ہوتب بھی بھیجو۔اسی کو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ بکری کی کُھری ہی کیوں نہ ہو۔

شرّاح لکھتے ہیں کہ یہ تاکید دونوں کو ہوسکتی ہے یعنی بھیجنے والی کو بھی اور جس کو بھیجا جا رہا ہے اس کو بھی۔ بھیجنے والی کو یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ مت سوچو کہ یہ کیا بھیجنا، آپ کے پاس جو موجود ہے وہ آپ بھیج دو۔اور جس کو بھیجا جا رہا ہے اس کو بھی تاکید کی جارہی ہے کہ کیا بھیجا ہے؛ یہ مت دیکھو، بلکہ یہ دیکھو کہ کیوں بھیجا ہے۔اس لئے کہ عورتوں کا یہ بھی مزاج ہے کہ پڑوسی کے یہاں سے اگر کچھ آیا تو دیکھتی ہیں اور پھر تبصرہ اس طرح کرتی ہیں کہ اس کو اتنا ذرا سا بھیجتے ہوئے شرم بھی نہیں آئی۔حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تمہارے پڑوسی نے جو چیز بھی بھیجی ہو، چاہے معمولی چیز اور بکری کی کُھری ہی کیوں نہ ہو، اس کو حقیر اور معمولی نہ سمجھو۔یہ نہیں دیکھنا ہے کہ کیا بھیجا، بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ کیوں بھیجا، اس کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے۔اس کے دل میں آپ کا اکرام اور محبت ہے، اس لئے بھیجا ہے، اگر ایسی بات نہ ہوتی تو نہ بھیجتی اس لئے عام طور پر چیز نہیں دیکھی جاتی، بلکہ اس کے پیچھے جو جذبہ ہوتا ہے وہ دیکھا جاتا ہے۔

پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کا تقاضہ

۳۰۷. وَعَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: لَايَمْنَعُ جَارٌجَارَهُ أَن يَّغْرِزَخَشَبَةً فِيْ جِدَارِهٖ. ثُمَّ يَقُوْلُ أَبُوْهُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ: مَالِيْ أَرَاكُمْ عَنْهَامُعْرِضِيْنَ! وَاللهِ لَأَرْمِيَنَّ بِهَا بَيْنَ أَكْتَافِكُمْ. (متفق علیه)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی پڑوسی اپنے پڑوسی کو لکڑی اپنی دیوار میں لگانے سے نہ روکے۔پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: کیا بات ہے کہ مَیں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ حضور ﷺ کے اس ارشاد سے رخ پھیر رہے ہو؟ اللہ کی قسم! تمہارے درمیان میں مَیں اس کو ڈال کر رہوں گا۔

افادات:- ’’لکڑی اپنی دیوار میں لگانے سے نہ روکے‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنا مکان بنالیا، پڑوسی کا پلاٹ ابھی تک خالی ہے، اب وہ بنارہا ہے، اور آپ نے چونکہ پہلے سے مکان بنالیا ہے، اس لئے آپ کی دیوار کھڑی ہے، اب ایک شکل تو یہ ہے کہ پڑوسی اپنی چھت کی لکڑیاں رکھنے کے واسطے اپنی دیوار الگ سے بنائے۔ اور دوسری شکل یہ ہے کہ آپ سے اجازت طلب کرے کہ اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی دیوار میں اپنی لکڑیاں ڈال لوں تاکہ مجھے مستقل دیوار بنانی نہ پڑے۔ تو نبی کریم ﷺ نے تاکید فرمائی کہ پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر وہ آپ سے اجازت مانگ رہا ہے تو آپ اس کو منع مت کرو اگرچہ یہ حکم وجوبی نہیں ہے، بلکہ استحبابی ہے، لیکن آپ ﷺ کا انداز دیکھئے کہ فرمایا﴿ لَا يَمْنَعُ ﴾ منع نہ کرے، گویا حکم دیا جارہا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے جس وقت یہ روایت مجمع کے سامنے بیان کی تو دیکھا کہ لوگوں نے سر جھکالیا، گویا سب مراقبہ میں چلے گئے، جس سے حضرت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ یہ سمجھے کہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد شاید ان لوگوں کو ناگوار گذرا ہے۔ جیسے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی طبیعت پر کوئی بات گراں گذرتی ہے اور اس پر لوگ کہتے ہیں کہ ہاں! یہ حدیث ضرور ہے اور ہم مانتے بھی ہیں لیکن مولوی صاحب نے اس وقت مجمع کے سامنے کیوں نقل کی۔ تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ سب لوگوں نے سر جھکالیا، گویا حضور کے اس ارشاد کو جس شوق وولولہ اور جس طلب کے ساتھ لینا چاہیے، اور اس کی طرف جو توجہ ہونی چاہیے؛ وہ نہیں ہے تو ان کو طیش اور غصہ آگیا اور فرمانے لگے کہ کیا بات ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ حضور ﷺ کے اس ارشاد سے رخ پھیر رہے ہو؟ اور جیسا دھیان دینا چاہیے وہ نہیں دے رہے ہو؟ اللہ کی قسم! تم چاہو یا نہ چاہو، تمہارے درمیان

میں مَیں اس کو ڈال کر رہوں گا یعنی مَیں تو بتاؤں گا چاہے تم کو پسند ہو یا نہ ہو۔

پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچانا ایمان کا تقاضہ ہے

۳۰۸. وَعَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلايُؤْذِ جَارَهُ. وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ. وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْراً أَوْلِيَسْكُتْ.

(متفق علیه)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے، اور جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے اور جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ بھلی بات کہے یا خاموش رہے۔

افادات:- ''اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے'' یعنی کوئی ایسا انداز اور کوئی ایسی روش کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کرے جس کی وجہ سے پڑوسی کو تکلیف ہو۔ مختلف طریقوں سے تکلیف پہنچائی جاسکتی ہے، ان میں سے کسی بھی طریقہ سے تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔

پہلے بھی یہ روایت آچکی ہے۔ حضور ﷺ نے پڑوسی کو تکلیف پہنچانے سے منع فرمایا ہے، اس مناسبت سے یہاں پیش کی ہے۔

جب رہبر ہی رہزن بن جائے

بلکہ برائی کا معاملہ اگر پڑوسی کے ساتھ کیا جاتا ہے تو وہ دوسروں کے ساتھ کیئے جانے والے معاملہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ زیادہ خطرناک ہے۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ سے پوچھا کہ تم زنا کو کیا سمجھتے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ اے اللہ کے رسول! حرام کام ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے پاک رسول ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔

حضورﷺ نے فرمایا کہ کوئی آدمی اگر اپنے پڑوسی کی عورت کے ساتھ زنا کرے تو یہ دوسری دس عورتوں کے ساتھ زنا کرنے سے بھی زیادہ خطرناک ہے، یہی حال چوری کا بھی ہے (الادب المفرد،۱۰۳) چونکہ ایک پڑوسی اپنے پڑوسی سے پڑوسی ہونے کے ناطہ سے یہ توقع اور امید رکھتا ہے کہ آڑے وقت وہ اِس کے کام آئے گا، اوراس کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ کوئی آدمی اس کی عزت وآبرو پر ہاتھ ڈال رہا ہوگا تو وہ اِس کی حفاظت کرے گا۔ توپڑوسی ہونے کی حیثیت سے چاہیے تو یہ تھا کہ دوسروں کی طرف سے اگرکوئی ایسی شکل ہوتی تو وہ حفاظت کرتا، اوراس کیلئے پشت پناہی کا ذریعہ بنتا، اس کے بجائے خود وہی ایسا کررہا ہے، تو یہ کتنی خطرناک بات ہوگئی، اسی لئے بڑے گناہوں میں اس کوشمار کیا گیا ہے۔

پڑوسی کوراحت پہنچانے کی کوشش کرو

۳۰۹.عن أبی شُرَیحِ الْخُزَاعِیِّ رضی اللہ عنہ أنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ:مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُحسِنُ اِلیٰ جَارِہٖ.وَمَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُکْرِمْ ضَیْفَہٗ.وَمَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیَقُلْ خَیْراً أَوْلِیَسْکُتْ.

حضرت ابوشریح خزاعی فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا: تم میں سے جوآدمی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پرایمان رکھتا ہووہ اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرے، اور جواللہ تعالیٰ اورآخرت کے دن پرایمان رکھتا ہووہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اور جواللہ تعالیٰ اورآخرت کے دن پرایمان رکھتا ہووہ بھلی بات کہے یا خاموش رہے۔

افادات:- یہ روایت اوپر جیسی ہی ہے بس جملہ کا ذرا سا فرق ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں تو یہ تھا کہ تم میں سے جوآدمی اللہ تعالیٰ پراورآخرت کے دن پرایمان رکھتا ہووہ اپنے پڑوسی کوتکلیف نہ پہنچائے۔اور یہاں اسی بات کودوسرے الفاظ سے تعبیرکیا کہ تم میں سے جوآدمی اللہ تعالیٰ پراورآخرت کے دن پرایمان رکھتا ہووہ اپنے

پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرے یعنی اتنا ہی نہیں کہ تکلیف نہ پہنچائے بلکہ اس سے ایک قدم آگے کی تعلیم دی گئی کہ اس کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئے اور اس کو راحت پہنچانے کی کوشش کرے۔

کون سے پڑوسی کا حق زیادہ ہے؟

۳۱۰. وَعَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ قُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّ لِيْ جَارَيْنِ فَإِلٰى أَيِّهِمَا أُهْدِيْ؟ قَالَ: إِلٰى أَقْرَبِهِمَا مِنْكِ بَاباً.

(رواه البخاري)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مَیں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اے اللہ کے رسول! میرے دو پڑوسی ہیں مَیں ان میں سے کس کے پاس ہدیہ بھیجوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے مکان کا دروازہ تمہارے دروازہ کے قریب ہو۔

افادات:- ’’ان میں سے کس کے پاس ہدیہ بھیجوں؟‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز اتنی مقدار میں ہے کہ دونوں کے پاس بھیجی نہیں جاسکتی، کسی ایک ہی کے یہاں بھیجی جاسکتی ہے، تب ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ نے وسعت دی ہو تو پھر وہاں یہ نہیں دیکھا جائے گا، بلکہ وہاں تو سب کو ہی پہنچانے کی کوشش کی جائے گی، اور یہاں ایسا تھا کہ دونوں کو نہیں دی جاسکتی تھی، اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ دونوں میں سے کس کو دوں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے مکان کا دروازہ تمہارے دروازہ کے قریب ہو؛ اس کو دو۔ اور اس کی وجہ بھی علماء نے لکھی ہے کہ دروازہ کے قریب ہونے کی وجہ سے وہ آپ کے حالات سے دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ باخبر ہوگا، آپ کے یہاں کیا آتا ہے اور کیا جاتا ہے وہ سب اس کی نظروں سے گذرتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اگر خدانخواستہ آپ کے یہاں کبھی کوئی چور، ڈاکو یا دشمن آگیا اور آپ کو مدد کی ضرورت پڑی تو دوسروں کے مقابلہ میں وہی سب سے پہلے پہنچے گا، اس لئے اس کا حق بھی زیادہ ہے۔

بہترین پڑوسی

۳۱۱. وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: خَيْرُ الْأَصْحَابِ عِنْدَاللهِ تَعَالىٰ خَيْرُهُمْ لِصَاحِبِهٖ. وَخَيْرُ الْجِيْرَانِ عِنْدَاللهِ تَعَالىٰ خَيْرُهُمْ لِجَارِهٖ.

(رواه الترمذی، وقال: حديث حسن)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بہترین ساتھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور بہترین پڑوسی اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو اپنے پڑوسیوں سے اچھا سلوک کرنے والا ہو۔

افادات:- گویا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہماری خیر و خوبی اور بھلائی و اچھائی اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھائی کے اوپر موقوف ہے۔

......تو پڑوسی کے لئے کیسے پسند کروں؟

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بزرگ تھے، ان کے یہاں چوہے بہت بڑھ گئے اور اس کی وجہ سے وہ پریشان تھے، ایک مرتبہ انہوں نے اپنی مجلس میں شکایت کی کہ چوہے بہت ہو گئے ہیں اور اس کی وجہ سے بہت پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ کسی نے کہا کہ حضرت! ایک بلی پال لو، تو چوہوں کا علاج خود بخود ہو جائے گا۔ خیر! یہ بات ہوگئی، چند روز گذرنے کے بعد پھر انہوں نے وہی بات کہی۔ کسی نے کہا کہ حضرت! آپ کو تو مشورہ دیا گیا تھا کہ بلی پال لیجئے، چوہوں کا علاج ہو جائے گا، آپ بلی کیوں نہیں پال لیتے؟ انہوں نے کہا کہ بھائی! بلی پالنے کی ہمت اس لئے نہیں ہوتی کہ اگر میں بلی لے آیا تو اس کو دیکھ کر چوہے پڑوسی کے گھر میں بھاگ جائیں گے، اور جب میں ان چوہوں کو اپنے لئے پسند نہیں کرتا؛ تو پڑوسی کے لئے کیسے پسند کروں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر یہی مزاج ہمارا بن جائے تو کسی کا کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا

ہی نہیں رہے گا اور ہماری معاشرت اور سماج جنت کا نمونہ بن جائے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے

دعاء

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ.

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اَلْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَد.

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلیٰ اٰلِ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی بِعَدَدِ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی.

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگذر فرما۔ اے اللہ! پڑوسیوں کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ نے جو ہدایتیں عطا فرمائی ہیں، ان پر سو فیصد عمل کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی میں ہم سے اب تک جو کوتاہیاں ہوئی ہیں ان کو معاف فرما کر آئندہ ان کوتاہیوں کو دور کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما اے اللہ! تو ہم سے راضی ہو جا، اپنی مرضیات پر ہمیں زیادہ سے زیادہ چلا کر نا مرضیات سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! اس مجلس میں جتنے بھی بیمار ہیں اور جن کے متعلقین بیمار ہیں ان کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ جو مقروض ہیں ان کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔ جو پریشان حال ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما۔ حاجت مندوں کی حاجتیں پوری فرما۔ اے اللہ! جنہوں نے اپنے جن جن مقاصد کے لئے اور جن مصیبتوں کے دور ہونے کے لئے اور جن بیماریوں سے شفا کے لئے ہم سے دعاؤں کی درخواستیں کی ہیں یا جو ہم سے دعاؤں کی توقع اور امید رکھتے ہیں

یا جن کے ہم پر حقوق ہیں؛ اے اللہ! ان تمام کی جائز مرادوں کو پورا فرما، پریشانیوں کو دور فرما، حاجتوں کو پورا فرما۔ اے اللہ! ان کی بیماریوں کو صحت وشفا سے بدل دے۔ نبی کریم ﷺ نے جتنی خیر وبھلائی تجھ سے مانگی وہ سب ہم کو عطا فرما اور حضور ﷺ نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی ان سے ہماری حفاظت فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ.

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ أَجْمَعِیْنَ.

بِرَحْمَتِکَ یَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِیْن.